

مقالاتِ ابوالمآثر

جلد دوم

محدث کبیر، محقق جلیل، تاجدار علم وفن

حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ

کے علمی وتحقیقی مضامین کا

بیش قیمت مجموعہ



ترتیب

مسعود احمد الاعظمی

ناشر: دارالثقافة الإسلامية

مئو، ۲۷۵۱۰۱، یوپی، انڈیا

نام کتاب : مقالات ابوالمآثر جلد دوم

رشحات قلم : محدث ومحقق وفقیہ حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی نوراللہ مرقدہ

ترتیب : مسعود احمد الاعظمی

صفحات : ۲۸۰

سن اشاعت : ۱۴۳۵ھ=۲۰۱۴ء

طبع اول : ایک ہزار

قیمت : =/۱۶۰

طباعت : شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی

﴿ناشر﴾

دارالثقافۃ الاسلامیۃ، مئو، یوپی، ۲۷۵۱۰۱

﴿ملنے کے پتے﴾

مدرسہ مرقاۃ العلوم، پٹھان ٹولہ، مئو

فون نمبر 0547-2220469، پن کوڈ نمبر ۲۷۵۱۰۱، یوپی، انڈیا

مئو کے دیگر کتب خانے

فہرست مقالات

☆☆☆☆☆
☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمۂ تشکر و امتنان

از:- حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی خلف الرشید محدث جلیل
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ

الحمد لأهله، والصلاة على أهلها.

انتہائی خوشی و مسرت کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں یہ حقیر سجدۂ شکر بجالاتا ہے، کہ حضرت والد ماجد -نور اللہ مرقدہ وقدّس سرہ- کے مضامین و مقالات کی دو جلدیں ایک ساتھ تیار ہوکر طباعت کے لیے پریس میں روانہ ہونے والی ہیں۔ یہ ''مقالات ابوالمآثر'' کی دوسری اور تیسری جلدیں ہوں گی، تقریباً ایک دہائی پہلے اس کی پہلی جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوئی تھی، الحمد للہ اس کی کافی پذیرائی ہوئی تھی، اور ابھی کچھ عرصہ قبل دیوبند میں ''مکتبۂ دارالعلوم'' کی طرف سے اس کا دوسرا ایڈیشن دو ہزار ایک سو (۲۱۰۰) کی تعداد میں طبع کرا کے طلبۂ دارالعلوم میں تقسیم کیا گیا۔ پہلی جلد کی اشاعت کے بعد سے باقی مقالات و مضامین کی دید و زیارت کے لیے اہل علم و شوق کی تڑپ بڑھ گئی، اور اس کے لیے مستقل تقاضا ہوتا رہا۔ اس تقاضے کا سامنا زیادہ تر میرے خواہر زادۂ عزیز ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ کو کرنا پڑتا تھا، بنا بریں وہ بھی باقی ماندہ مضامین کی ترتیب و اشاعت کے لیے فکرمند تھے، مگر عدیم الفرصتی رکاوٹ بنی ہوئی تھی، اب انھوں نے کسی طرح تھوڑا وقت نکال کر نہایت محنت و جانفشانی اور دلجمعی کے ساتھ باقی مقالات کو جمع و ترتیب دے کر دو بہترین اور حسین

گلدستے تیار کردیے ہیں، جو امید ہے کہ اہل علم وشوق کی روح کو مسرور اور مشام جاں کو معطر کریں گے۔

جلد دوم میں وہ مضامین ہیں، جو علمی وتحقیقی ہیں، اور بوقت ضرورت مختلف علمی موضوعات پر ارقام فرمائے گئے ہیں، اور جلد سوم میں جو مقالات شامل ہیں وہ تنقیدی ہیں، یا کتابوں کا تعارف اور ان پر مقدمے ہیں۔ تنقیدی مضامین کی اشاعت کا مقصد کسی عالم یا محقق ومصنف کی ذات کو مجروح کرنا یا ہدف تنقید بنانا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد صرف خدمتِ علم ودین ومعرفت ہے۔

عزیزم ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ اللہ نے ان مقالات کے جمع وترتیب میں مطبوعہ مضامین اور جو مسودات کی شکل میں موجود ہیں، ان سب کے موازنہ، مقابلہ اور تصویب وتصحیح میں کافی محنت صرف کی ہے، اور ضرورت پڑنے پر مراجع کو تلاش کرکے اہتمام کے ساتھ ان مقالات کے اقتباسات کا اصل مراجع سے پوری توجہ کے ساتھ مقابلہ کرکے اس کتاب کو صحیح ترین اور بہترین شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی محنت، عرق ریزی اور اس عظیم علمی خدمت کے لیے سعی جمیل پر بارگاہ رب العزت میں احقر دست بدعا ہے کہ اس کا ان کو بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

اسی کے ساتھ میں دعا گو ہوں اپنے نور چشم عزیزم مولوی ازہر رشید سلمہ اللہ کے لیے کہ انھوں نے اس کی طباعت کا بار اپنے ذمہ لے کر مجھے اس کے لیے فکرمند اور زیر بار ہونے سے بچالیا ہے، اللہ رب العزت ان کو مزید ہمت وحوصلہ عطا فرمائے، اور اس سلسلے کے بہت سے جو باقی کام ہیں، ان کو پورا کرنے کی مزید توفیق اور ہمت عنایت فرمائے۔

والله هو الموفق.

☆......☆......☆

مُقَدِّمَة

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء وسيد المرسلين، وعلى آله وأصحابه الطيبين الطاهرين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، وبعد!

پیش نظر کتاب محدث جلیل، محقق عظیم، یگانۂ روزگار اور مملکت علم وفن کے تاج دار حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کے مضامین ومقالات کا دوسرا حصہ ہے۔ مقالات کا پہلا حصہ آج سے تقریباً دس برس قبل شائع ہوا تھا، اُس مجموعہ میں حضرت محدث الاعظمیؒ کے وہ مضامین جمع کیے گئے تھے، جو آپ نے دفاع حنفیت یا ردّ غیر مقلدیت کے سلسلے میں سپرد قلم فرمائے تھے۔ مقالات کے پہلے حصے کی اشاعت کے بعد سے ہی متعدد اہل علم کی طرف سے اُن مضامین ومقالات کی طبع واشاعت کا تقاضا ہو رہا تھا، جو حضرت والا رحمہ اللہ نے دوسرے موضوعات پر تحریر فرمائے تھے، اور مدتوں پہلے ملک کے مؤقر رسائل ومجلّات میں شائع ہو چکے تھے۔ اہل علم کے بار بار اور باصرار تقاضے سے حقیر مرتب کے دل میں بھی ان کو جمع کرکے منظر عام پر لانے کی تحریک پیدا ہو رہی تھی، لیکن اپنے مصروف لمحات میں سے اتنا وقت نکالنا مشکل تھا کہ ان کی تلاش وجستجو کرکے ترتیب دیتا، اور جمع وترتیب کے سلسلے میں جو مشکلیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں، ان سے نبرد آزما ہوتا۔ لیکن یہ کام ضروری بھی تھا، اور اس میں دن بدن تاخیر ہوتی جارہی تھی، اس لیے اب مزید مؤخر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا، اور بہت سے دوسرے کاموں کو چھوڑ کر اس میں ہمہ تن مصروف اور بدل وجان منہمک ہو گیا۔

اس جلد میں ناظرین کی ضیافت طبع اور علمی وفکری آسودگی کے لیے وہ مضامین شائع کیے جارہے ہیں، جو علمی وفکری، اور تحقیقی وتاریخی نوعیت کے ہیں۔مضامین کیا ہیں، علم وتحقیق کے درخشاں موتی اور عرفان وآگہی کے جواہر پارے ہیں، جو قلم کی نوک سے ٹپک کر یاقوت ومرجان کے دانوں کی طرح کاغذ کے صفحات پر بکھر گئے ہیں۔

حضرت محدث الاعظمیؒ کے مضامین میں دین ومذہب، علم وادب، تذکرہ وتاریخ، اور تحقیق وتنقید جیسے متنوع عناصر کی ایسی باہمی ترکیب اور آمیزش ہے کہ ان کو الگ الگ قسموں میں تقسیم کرنا نہایت مشکل ہے۔آپ کے وسعت مطالعہ، کثرت علم، دقت نظر اور قوت تفکیر نے ان مضامین کو زندہ جاوید بنادیا ہے، ان کو دیکھ کر آپ کی ہمہ جہت شخصیت اور تفنن طبع کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محدث الاعظمیؒ نے بہت لکھا ہے، لیکن اس میں بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ آپ نے بوقت ضرورت ہی لکھا ہے، کبھی کسی کے مطالبے اور تقاضے پر لکھا ہے؛ کبھی کسی شخصیت کے تعارف کا قلب میں داعیہ پیدا ہوا، تو کچھ سپرد قلم فرمادیا؛ کبھی حاصل مطالعہ قلم بند کردیا؛ کبھی کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوا تو اپنے ناخن گرہ کُشا سے اس کا حل زیبِ قرطاس کردیا؛ کبھی اسلام، اسلامی تعلیمات، صحابہ وتابعین یا بزرگان دین کی شان پر ضرب پڑتی محسوس ہوئی ہے، تو عنان قلم شمشیر بے نیام بن گیا۔جہاں تک راقم نے محسوس کیا ہے مقالہ نگاری پر آپ کی توجہ کم تھی، آپ نے کوئی مقالہ یا مضمون اسی وقت سپرد قلم فرمایا ہے، جب اس کی شدید ضرورت محسوس کی ہے، آپ کی زیادہ توجہ مطالعہ وکتب بینی کے بعد تصنیف وتالیف یا قدیم مخطوطات کی تحقیق کی طرف تھی، اور اسی کو علم دین کی اہم ترین اور سب سے بڑی خدمت کے طور پر انجام دیا۔

حضرت محدث الاعظمیؒ علمی گہرائی وگیرائی کے ساتھ ساتھ ادب وانشاء میں بھی نہایت بلند مقام رکھتے تھے، زبان صاف، سلیس اور شستہ تھی، عبارت پُرشوکت اور اسلوب بیان سہل ممتنع تھا، الفاظ وکلمات برمحل اور برجستہ، ترکیب اور جملوں کی ساخت نہایت مربوط

ہوا کرتی تھی، اور قلم ایسا رواں دواں کہ مشکل سے مشکل مضامین، اور مغلق سے مغلق مفاہیم اس طرح سپرد قلم ہوجاتے ہیں کہ دقیق سے دقیق مضمون آئینہ ہوجاتا ہے، علم وتحقیق اور ادب وانشاء کا جو سنگم اور زبان وبیان ونکتہ آفرینی کی جو جامعیت آپ کی تحریروں میں پائی جاتی ہے، وہ کم کہیں نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کو اپنے قلم پر قابو بہت تھا، تبحر علمی، وسعت معلومات اور کثرت مطالعہ کے باوجود قلم اپنے موضوع سے ہٹتا نہیں تھا، یہ علامہ اعظمی کا بہت بڑا کمال اور زبان وقلم پر غیر معمولی قدرت کی دلیل ہے۔

یہ مجموعہ جن مضامین پر مشتمل ہے، ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے علم میں یہ بھی آجائے کہ کون سا مضمون مطبوعہ ہے اور کون سا غیر مطبوعہ؟ اگر مطبوعہ ہے تو کب اور کہاں شائع ہوا تھا؟ اور اگر اس کا کوئی پس منظر ہے تو وہ بھی معلوم ہوجائے۔اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا

پہلی دفعہ پاکستان کے شہر ملتان سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''الصدیق'' کے برکات الاسلام نمبر بابت جمادی الاولی ۱۳۷۳ھ= فروری ۱۹۵۴ء میں طبع ہوا تھا۔ دوبارہ ''المآثر'' (سہ ماہی) کے جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۱، بابت محرم-صفر-ربیع الاول ۱۴۲۱ھ میں شائع ہوا۔

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ

غیر منقسم ہندوستان کے مشہور شہر امرتسر سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ مذہبی جریدہ ''الرشاد'' کے رسول نمبر، جلد ۱ شمارہ ۹و۱۰ میں ۴؍ربیع الاول ۱۳۴۶ھ= یکم ستمبر ۱۹۲۷ء کو اشاعت پذیر ہوا تھا۔دوبارہ یہ اہم اور پُرمغز مضمون ''المآثر'' کے جلد نمبر ۸ شمارہ ۱، بابت محرم-صفر-ربیع الاول ۱۴۲۰ھ میں شائع کیا گیا۔

اسلام اور صنف نازک

اسلام پر جو بے جا الزام تراشیاں کی گئی ہیں، اور ان کا وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا

گیا ہے، ان میں سے ایک الزام اور پروپیگنڈہ آزادیٔ نسواں اور عورتوں کے حقوق سے متعلق ہے۔ منظّم اور منصوبہ بند طریقے سے اس پروپیگنڈے کو رواج دیا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کے ساتھ ناروا سلوک کیا ہے، اس کی حق تلفی کی ہے، اور اس کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر کے رکھ دیا ہے۔

حضرت محدث الاعظمیؒ نے چند صفحات میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اسلام کی ان تعلیمات کا ایک جامع نقشہ پیش کر دیا ہے، جو قرآن وحدیث میں عورتوں کے حقوق سے متعلق دی گئی ہیں۔ اس سے بخوبی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عورت کو پستی کے غار اور ظلم وجبر کی تاریک کوٹھری سے نکال کر اس کو آزادی کی نعمت سے سرفراز کیا، اور اس کو ترقی کے آسمان تک پہنچنے کا موقع عطا فرمایا، اور اس کے وہ حقوق متعین کیے، جس سے زیادہ تو دور کی بات ہے، اس کے برابر کا بھی تصور ممکن نہیں ہے۔

حضرت محدث الاعظمیؒ کا یہ مضمون پہلی دفعہ صفر تا جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ = ستمبر تا دسمبر ۱۹۲۴ء کے ''المؤمن'' کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔ دوبارہ ''المآثر'' جلد ۱۱ شمارہ ۳ و ۴ میں اشاعت پذیر ہوا۔

فی التنفل بعدالوتر (وتر کے بعد کی نفل نماز)

یہ مضمون دراصل ایک مکتوب کا جواب ہے، جو وتر کے بعد کی نفل نماز کے متعلق مولانا محمد ابراہیم بنارسی -متوفی ۱۳۸۶ھ = ۱۹۶۶ء- کے اشکالات کے جواب میں سپرد قلم کیا گیا تھا، ویسے تو یہ جوابِ خط ہے، لیکن مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے، اور نہایت جامع اور مدلل ہے، دوجز میں آپ کے اوراق میں محفوظ تھا، اس کو پڑھنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے علامہ اعظمی نے مولانا بنارسی کے اشکالات کا جواب لکھا، لیکن جب ان کے اشکالات اس سے دور نہیں ہوئے اور ان کو ایک خط میں تحریر کر کے روانہ کیا، تو حضرت محدث الاعظمی نے جواباً دوسری تحریر زیب قرطاس فرمائی، اور نہایت مضبوط دلائل وشواہد سے

اپنے موقف کو ثابت کیا۔ یہ تحریر ''المآثر'' جلد نمبرا شمارہ نمبر ۹و۱۰ میں شائع ہوئی تھی، چونکہ یہ تحریر دو حصوں میں تھی، اس لیے اس مجموعہ میں بھی دو ٹکڑوں میں شائع کی جا رہی ہے۔

إنَّ الإسناد من الدين

اس میں علم جرح وتعدیل سے متعلق تصانیف کا عہد بعہد اور طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جنوبی ہند کے مشہور شہر وانمباڑی کی انجمن خدام القرآن کے خاص نمبر ''الرباط'' میں رجب، شعبان، رمضان ۱۴۰۶ھ میں شائع ہوا تھا، جو انجمن کے زیر اہتمام ہونے والی ''مدارس عربیہ کی ایک روزہ کانفرنس'' کے لیے خاص طور سے لکھا گیا تھا۔

اس مضمون کا مسوّدہ بھی محفوظ ہے، اور ''الرباط'' کا مطبوعہ حصہ بھی ہم کو مولانا اقبال احمد صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ باقیات الصالحات ویلور کی عنایت سے دستیاب ہوا ہے۔

پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مضمون کہیں شائع ہوا تھا، یا نہیں۔ اس کا مسوّدہ محفوظ تھا، اسی سے نقل کر کے اس مجموعے میں شامل کیا جا رہا ہے۔

دو متبرک اجازت نامے

اسلام کے اندر سند واجازت کی بہت اہمیت ہے، اس اہمیت کے پیش نظر ہی چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی آج تک اساتذہ ومشائخ حدیث سے سند واجازت کی تحصیل کو باعث شرف وسعادت سمجھا جاتا ہے۔ مئو اور اس کے اطراف میں جو نامور اور بلند پایہ اہل علم گزرے ہیں، ان میں سے ایک مولانا محمد طاہر معروفی -متوفی ۱۲۹۶ھ- اور دوسرے مولانا عبداللہ مئوی -متوفی ۱۳۲۱ھ- ہیں۔ دونوں حضرات کو اپنے وقت کے دو بزرگ اور باکمال اہل علم سے اجازت حدیث حاصل ہوئی تھی۔ اس مضمون میں علامہ اعظمیؒ نے اسی کا ذکر کیا ہے، جو ''معارف'' دسمبر ۱۹۳۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات

یہ مبسوط تحریر ماہنامہ ''برہان'' (دہلی) کے فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، اس کا مسودہ بھی محفوظ ہے۔ مسودہ اور مطبوعہ کی ترتیب میں تھوڑا فرق ہے، اس مجموعہ کی ترتیب طبع شدہ مضمون کے مطابق ہے، لیکن کتابت وطباعت کی جہاں غلطیاں تھیں، وہاں مسودے کو سامنے رکھ کر اس کی تصحیح کی گئی ہے۔

مسئلۂ رویت ہلال

یہ مضمون ''المآثر'' جلد نمبر۱۲ شمارہ نمبر۱، محرم-صفر-ربیع الاول ۱۴۲۴ھ میں شائع ہوا تھا، اس مضمون کی اشاعت کے وقت ''المآثر'' میں جو ادارتی نوٹ قلم بند کیا گیا ہے، اس میں تحریر ہے:

''حضرت محدث جلیل رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریر خود آپ کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی آپ کے مسودات میں موجود تھی، ذیل میں یہ تحریر من وعن شائع کی جارہی ہے، اس تحریر میں صرف یہ تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کا عنوان آپ کی تحریر میں یہ تھا ''مجلس تحقیقات شرعیہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے''۔ ضرورت کی وجہ سے اس کا عنوان بدل کر وہ رکھ دیا گیا ہے جو اوپر مذکور ہے''۔

احقر مرتب کا اندازہ ہے کہ یہ تحریر ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۷ء کے قریب کی ہوگی۔

پندرہویں شعبان کی حدیث

غالباً کسی نے پندرہویں شعبان کے روزے کے متعلق حضرت محدث الاعظمیؒ سے استفسار کیا تھا، تو آپ نے اس کے متعلق یہ مختصر مگر جامع تحریر سپرد قلم کرکے روانہ کی تھی۔ یہ ''المآثر'' جلد نمبر۲ شمارہ نمبر۳ رجب-شعبان-رمضان ۱۴۱۴ھ میں شائع ہوئی تھی، اس کی اشاعت کے وقت جو ادارتی نوٹ لکھا گیا ہے، اس میں تحریر ہے:

''یہ مضمون ہمیں حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب معروفی مدظلہ استاذ

حدیث دارالعلوم دیوبند کی عنایت سے ملا''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر دارالعلوم دیوبند کے کسی استاذ یا صاحب علم کے پاس تھی۔

اس مضمون میں بہت سی عبارتوں کا ترجمہ حاشیہ میں ہے، جس کے آخر میں (ادارہ) لکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''المآثر'' میں اشاعت کے وقت ترجمہ ادارہ کی طرف سے کیا گیا تھا۔

اسلامی پرسنل لا میں باب کفو

کفاءت سے متعلق یہ اہم تحریر ''المآثر'' جلد نمبر۸ شمارہ نمبر۱، محرم-صفر-ربیع الاول ۱۴۲۰ھ میں شائع ہوئی تھی، اس کے شروع میں ادارے کی طرف سے یہ نوٹ قلم بند کیا گیا ہے:

''۱۹۷۲ء کے آخر میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے بمبئی میں ایک عظیم الشان کنونشن ہوا تھا، حضرت محدث کبیرؒ نے غالباً اسی کے بعد یہ تحریر قلم بند فرمائی تھی، اس طرح یہ تحریر کم از کم پچیس برس پہلے کی ہے، اتفاق کی بات ہے کہ اسلامی فقہ اکیڈمی نے پھلواری شریف پٹنہ میں ۱۷؍تا ۱۹؍اپریل ۱۹۹۹ء کو منعقد ہونے والے سیمینار کے لیے مسئلہ کفاءت کو موضوع بحث بنایا تھا، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ موقع اور حالات کی مناسبت سے یہ تحریر شائع کردی جائے''۔

مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مطالبہ

یہ مختصر مضمون مسودہ کی شکل میں موجود تھا، ''المآثر'' جلد نمبر۱۸ شمارہ نمبر۳ میں شائع ہوا ہے۔

سید الشہداء کی تحقیق

امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ سے ایک رسالہ ''النجم'' کے نام سے نکالا کرتے تھے، جو رد شیعیت میں اپنے وقت کا مشہور رسالہ

تھا، یہ مضمون اسی رسالہ کے محرم ۱۳۵۵ھ کے شمارہ ''شہداء نمبر'' میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں جب حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ کی یادگار میں سہ ماہی رسالہ ''المآثر'' جاری ہوا، تو اس کے جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۱، بابت ربیع الآخر - جمادی الاولی - جمادی الاخری ۱۴۱۶ھ میں دوبارہ شائع کیا گیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں سوءِ ادبی اور اس کا جواب

یہ مبسوط اور مفصل مضمون بھی اولاً ''النجم'' میں جمادی الاولیٰ وجمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ کے شمارے میں طبع ہوا تھا، دوبارہ ''المآثر'' کے جلد اول شمارہ نمبر ۲و۴ میں یعنی ۱۴۱۳ھ کے دوسرے وچوتھے شمارے میں شائع کیا گیا۔

فتوحات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ''دارالعلوم'' میں اپریل ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قائدانہ وفاتحانہ زندگی اور اسلامی حدود کی توسیع میں آپ کی عظیم الشان خدمات پر نہایت جامع اور پُر مغز مضمون ہے۔

یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ

بعض افراد کے بارے میں بہت سی بے سروپا باتیں اور غیر مستند روایتیں تاریخ کی کتابوں اور عربی ودوسری زبانوں کے لٹریچر میں راہ پاگئی ہیں۔ ان ہی میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لڑکے یزید کی ذات بھی ہے۔ جس کی بایوگرافی اور سوانح نگاری میں بہت زیادہ بے اعتدالی سے کام لیا گیا ہے، اور اس کے متعلق ہر وہ بات جائز اور روا رکھی گئی ہے، جو اس فرمانروا کی ذات کو مجروح اور عیب دار بناتی ہو، چاہے اس کا تعلق حقیقت سے ہو یا نہ ہو۔ حضرت محدث الاعظمیؒ کا یہ مضمون ایک مکتوب کی صورت میں ہے، جسے آپ نے ایک شامی عالم علامہ ابوالیسر عابدین کی کتاب أغالیط المؤرخین کی ایک فصل کا ترجمہ کر کے مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی مفتی دارالعلوم دیوبند کے پاس روانہ

کیا تھا۔ یہاں یہ ذکر کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کہ اس کے آخر میں جو تاریخ درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر ۱۳۹۹ھ یعنی ۱۹۷۹ء کی ہے۔ لیکن یزید کے متعلق علامہ اعظمیؒ کا نقطۂ نظر بہت پہلے سے یہی تھا، جو اس میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے تقریباً ۲۰؍برس پیشتر ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ آپ نے ''تبصرہ بر شہید کربلا و یزید'' تصنیف کی تھی، جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ لیکن اس کا تفصیلی تعارف ''حیات ابوالمآثر جلد ثانی'' میں صفحہ ۳۵۷ سے ۳۸۲ تک کر دیا گیا ہے۔

حضرت محدث الاعظمیؒ کا یہ ترجمہ جو اس جلد میں شامل ہے، ''المآثر'' جلد ۳ شمارہ ۲ میں شائع ہوا تھا۔

سیرت ابراہیم بن ادہم اور ان کے مدفن کی تحقیق

اس مضمون میں مشہور ولی اور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم کے احوال کا نہایت پُر اثر نقشہ کھینچا گیا ہے، اور ان کی زاہدانہ ومتوکلانہ زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے، ان کی زندگی اور کسب معاش کو ان لوگوں کے لیے نمونۂ عمل دکھایا گیا ہے جو تصوف وطریقت کے راہرو ہوتے ہیں، سلوک طے کرتے ہیں، اور پیری مریدی کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں، نہایت سبق آموز مضمون ہے۔ پہلی دفعہ ''الفرقان'' اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا، اور دوبارہ اس کی اشاعت ''المآثر'' جلد ۸ شمارہ ۴ میں ہوئی۔

واقدی

یہ مختصر مگر بصیرت افروز اور فیصلہ کن تحریر دراصل عظیم اسلامی سکالر، ''صدیق اکبرؓ'' اور ''عثمان ذوالنورینؓ'' جیسی کتابوں کے مصنف مولانا سعید احمد اکبرآبادی - متوفی ۱۴۰۵ھ = ۱۹۸۵ء - کے ایک مکتوب کا جواب ہے۔ مولانا اکبرآبادی نے خط لکھ کر حضرت محدث الاعظمیؒ سے واقدی کی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا تھا، جواب میں حضرت محدث الاعظمیؒ نے یہ تحریر سپرد قلم فرما کر ان کو روانہ فرمائی تھی۔ اس کے وصول ہونے کے بعد

مولانا اکبرآبادی نے اس کے متعلق جو خط لکھا تھا، اس میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا:

''واقدی پر آپ کا نوٹ میرے نزدیک حرف آخر کا حکم رکھتا ہے، اب میں اپنے مضمون میں آپ کے حوالہ کے ساتھ نقل کروں گا، آپ کے نوٹ سے مجھ کو بڑی تقویت ہوئی، حضرت شاہ صاحب (۱) کی رائے بھی تقریباً یہی تھی، سخت افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ ہمارے ملک کے بعض علماء نے واقدی کی توہین وتنقیص کو گویا ایمان کا جزبنالیا ہے''۔(۲)

مولانا اکبرآبادی کے واسطے لکھی ہوئی اس تحریر کی نقل حضرت محدث الاعظمیؒ کے کاغذات میں محفوظ تھی، جو''المآثر'' کے جلد نمبر۱۴ شمارہ نمبر۱، محرم-صفر-ربیع الاول ۱۴۲۶ھ میں شائع ہوئی تھی۔

سیف وقلم

رسالہ''دارالعلوم'' کے اپریل ۱۹۵۷ء کے شمارے میں یہ مضمون اشاعت پذیر ہوا تھا، مجھے یاد آرہا ہے کہ یہ مضمون''تذکرہ'' میں بھی دیکھا ہے۔ حضرت محدث الاعظمیؒ نے مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ کے بعد ۱۳۴۹ھ میں وہاں دارالمطالعہ والتصنیف کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا تھا، جس کے مقاصد میں ایک رسالے کا اجراء بھی تھا، چنانچہ آپ کی زیرادارت ربیع الاول ۱۳۴۹ھ میں''تذکرہ'' کا ایک شمارہ جاری بھی ہوا تھا، لیکن غالباً ایک ہی شمارہ نکل بھی سکا، اس کے بعد جاری نہیں رہ سکا۔

جوادساباط

اسلام کے عظیم مجاہد کے احوال زندگی پر یہ معلومات افزا اور چشم کشا تحریر''معارف'' اعظم گڈھ میں اپریل ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، بعد میں''المآثر'' جلد نمبر۱۱ شمارہ نمبر۱ میں بھی اس کو شائع کیا گیا۔

(۱) حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری نوراللہ مرقدہ مراد ہیں۔
(۲) المآثر جلد۱۴ شمارہ نمبر۱، ص:۸۳

پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں

یہ مفصل مضمون ایک مستقل رسالے کی طرح ہے، جو تصوف وطریقت کے ایک مخصوص سلسلے کے خاصان خدا اور برگان دین کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ یہ بھی''معارف'' میں اکتوبر ونومبر ۱۹۵۴ء کے دوشماروں میں شائع ہوا تھا۔

اس مضمون کے بعد ضمیمہ کے طور پر ایک استدراک بھی ہے، یہ بھی''معارف'' ہی کے جنوری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس سے علمی امانت ودیانت اور انکسار وتواضع کا اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی ذرا سی لغزش اور فروگزاشت کا احساس ہوتے ہی بغیر کسی پس وپیش اور تردد کے اس کا اعتراف کرلیا، یہ ہے علم وتحقیق کی شان اور علمی عظمت وبلندی۔

حیات مبارکہ کے تین دور اور ان کی خصوصیات

سرزمین ہند کی نامور شخصیت، بطل حریت، جنگ آزادی کے بے باک مجاہد، عظیم عالم دین، آسمان رشد وہدایت کے نیر تاباں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ -متوفی ۱۳۷۷ھ=۱۹۵۷ء- کی حیات مبارکہ کے مختلف گوشوں پر یہ مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے۔ جو''الجمعیۃ'' کے''شیخ الاسلام'' نمبر میں شائع ہوا تھا۔

امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ

روافض اور شیعوں کے رد میں حضرت امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ -متوفی ۱۳۸۱ھ=۱۹۶۲ء- نے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ انھوں نے شیعیت کے زور کو توڑنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، حضرت محدث الاعظمیؒ کے حضرت امام اہل سنتؒ سے بہت گہرے اور مضبوط روابط تھے، اور حضرت امام اہل سنت آپ کے علم پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت محدث الاعظمیؒ نے اس تحریر میں اپنے تعلقات اور قلبی تاثرات درج کردیے ہیں۔

مولانا عبداللطیف نعمانی

حضرت محدث الاعظمیؒ کے رفیق درس اور ہمدم دیرینہ حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر حضرت محدث الاعظمیؒ کی بے تکلف تحریر ہے۔جس میں زمانۂ طالب علمی سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک کے طویل سفر پر نہایت اجمال واختصار کے ساتھ روشنی ڈال کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ یہ تحریر ’’تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی‘‘ میں شائع ہوئی تھی۔

علم وفضل میں خواتین کا حصہ

اس میں صرف ایک خاص دور کی ان خواتین کا ذکر کیا گیا ہے، جن کا علم حدیث کی تحصیل اور اس کی اشاعت میں حصہ رہا ہے۔حالانکہ یہ تذکرہ بہت مختصر ہے، لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین نے بھی علم حدیث کی اشاعت میں کس قدر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔اس مضمون سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو علم وفضل کے کس مقام پر فائز کیا ہے۔

کچھ اہم معروضات:

اس تمہید کو ختم کرنے سے پہلے چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۱:- مضامین کی کمپوزنگ کے بعد ان کی پروف ریڈنگ پوری محنت وجانفشانی کے ساتھ کی گئی ہے، اور غلطیوں کی اصلاح میں حتی الامکان کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔

۲:- اکثر مضامین کے مسودات محفوظ ہیں، مطبوعہ مضامین میں سے جس کا مسودہ موجود ہے، اس کے ساتھ مطبوعہ کا مقابلہ کرکے صحت کا پوری طرح اہتمام اور اطمینان کیا گیا ہے۔بعض مضامین کے مطبوعہ اور مسودہ کی ترتیب میں کچھ فرق ہے، تو ترتیب میں مطبوعہ کا خیال رکھا گیا ہے۔اور جہاں کتابت وطباعت کی غلطیاں واقع ہوگئی ہیں، وہاں مسودہ کے مطابق تصحیح کی گئی ہے۔

۳:- ان مقالات ومضامین میں عربی، فارسی یا اردو کے جو اقتباسات ہیں، حتی الامکان ان کے مآخذ سے مراجعت کی کوشش کی گئی ہے۔اگر عبارتوں میں اختلاف ملا ہے، تو اکثر جگہ حاشیے میں اس اختلاف کی توضیح کر دی گئی ہے۔

۴:- مسودوں سے جو مضامین ومقالات نقل کیے گئے ہیں، ان میں اگر کہیں عطف وربط کے حروف مثلاً ’’سے‘‘ یا ’’کا‘‘، ’’کے‘‘ وغیرہ چھوٹے ہیں، تو وہاں اپنے ذوق سے ان حروف کو اس طرح [......] متن کے درمیان بڑھا دیا گیا ہے، اور اس کے لیے کوئی حاشیہ نہیں دیا گیا ہے۔

۵:- کتابوں کے حوالے عموماً متن کے ساتھ اقتباس کے بعد مذکور تھے۔ان کو محض نمایاں کرنے کی غرض سے نمبر دے کر حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔

۶:- حضرت محدث الاعظمیؒ کو رموز اوقاف کے استعمال کا خود بہت اہتمام تھا، ہم نے ان مقالات ومضامین میں ان کا مزید اہتمام کیا ہے۔

۷- بہت سے مسودات میں مضمون کے آخر میں دستخط یا نام اور اس کے نیچے تاریخ درج ہے، جو مطبوعہ مضامین میں نہیں ہیں۔اس طرح کے مضامین میں تاریخ کی افادیت کے لیے مسوّدہ سے نام اور تاریخ لے کر اس میں درج کر دیے گئے ہیں۔

خداوند قدوس سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر کاوش کو شرف قبول عطا فرمائے، اور یہ کتاب اہل علم کے لیے ایک قیمتی تحفہ ثابت ہو۔وما توفیقی إلا باللہ.

مسعود احمد الاعظمی

۴/صفر ۱۴۳۵ھ

۸/دسمبر ۲۰۱۳ء

☆......☆......☆

آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا

مسئلہ ختم نبوت اسلام کا وہ بدیہی مسئلہ ہے، جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو مسئلہ قرآن کریم میں بصراحت مذکور ہو، اور جو صدہا احادیث صحیحہ میں بالفاظ غیر مشتبہ بیان کر دیا گیا ہو، اس کے خلاف منھ سے کوئی لفظ نکالنے کی جرأت کوئی مسلمان کیونکر کرسکتا ہے؟ اور اگر کوئی نام نہاد مسلمان اس مسئلہ سے اختلاف بھی کرے تو مسلمان اس کی آواز کو کیا وقعت دے سکتے ہیں؟ لیکن چونکہ مسلمانوں کی اکثریت ٹھوس اسلامی معلومات سے بے بہرہ اور صحیح مذہبی تعلیمات سے بے خبر ہے، اس لیے ان کی واقفیت کے لیے یہ چند سطریں لکھی جاتی ہیں۔

قرآن میں ختم نبوت کا اعلان:

قرآن کریم سورۂ احزاب پارہ ۲۲ رکوع (۲) میں خدا کا ارشاد ہے: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ﴾

حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ:

''نہیں ہے محمد ﷺ باپ کسی کا مردوں تمھارے میں سے ولیکن پیغامبر خدا کا ہے اور ختم کرنے والا تمام نبیوں کا''۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنے فوائد میں لکھتے ہیں کہ:

''یعنی بعد از وے ہیچ پیغمبر نباشد'' (ترجمہ) آپ کے بعد کوئی پیغمبر نہ ہوگا۔

اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ اپنے فوائد ''موضح القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں''۔

اور حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں''۔

اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اپنے فوائد میں لکھتے ہیں کہ:

''آپ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلہ پر مہر لگ گئی۔ اب کسی کو نبوت نہیں دی جائے گی''۔

اور امام بغوی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ﴾ **ختم الله به النبوة، وقرأ ابن عامر وعاصمٌ خاتَم بفتح التاء على الإسم أي آخرهم، وقرأ الآخرون بكسر التاء على الفاعل لأنه ختم به النبيين، قال ابن عباس: يريد: لولم أختم به النبيين لجعلتُ له ابناً يكون بعده نبياً، ورُوي عن عطاء عن ابن عباس أنَّ الله تعالى لما حكم أن لا نبي بعده لم يُعطِه ولداً ذكراً يصير رجلا**[1]۔

امام بغوی کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ خاتم النبیین کی مراد یہ ہے کہ اللہ نے آنحضرت ﷺ پر نبوت ختم کردی۔ خاتَم بفتح التاء پڑھا جائے تو خاتم النبیین کا مطلب ''آخری نبی'' ہے، اور خاتِم بکسر التاء پڑھا جائے تو ''نبیوں کے ختم کرنے والے'' ترجمہ ہوگا (غرض یہ ہے کہ دونوں قرأتوں کا حاصل ایک ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا)۔ امام المفسرین حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ اگر میں نے آنحضرت ﷺ پر نبیوں کا سلسلہ ختم نہ کردیا ہوتا تو آپ کو کوئی ایسا بیٹا دیتا جو آپ کے بعد نبی ہوتا۔

دوسری روایت میں ابن عباسؓ نے یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کردیا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، تو اس نے آنحضرت ﷺ کو کوئی ایسا لڑکا نہ دیا جو

(۱) معالم التنزیل: ۵/۲۱۸

جوان ہو۔

اورخازن نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

وخاتم النبيين ختم به النبوة فلا نبوة بعده أي ولا معه . (ج۵:ص۲۱۸)

یعنی اللہ نے آپ پر نبوت ختم کردی، پس آپ کے بعد کسی کو نبوت نہ دی جائے گی، اور نہ آپ کے ساتھ اب کسی کو دی جائے گی۔

اورلسان العرب جونہایت مستند لغت ہے، اس میں ہے:

ختام القوم وخاتمهم أي آخرهم، وفي التنزيل العزيز: ﴿ماكان محمد أبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين﴾ أي آخرهم.

اورقاموس اوراس کی شرح تاج العروس میں ہے:

والخاتم من كل شيء عاقبته وآخرته، والخاتم آخر القوم كالخاتم ومنه قوله خاتم النبيين أي آخرهم.

ان دونوں عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ آیت میں خاتم النبیین کے معنیٰ ''آخری نبی'' کے ہیں۔

امام غزالی الاقتصاد میں فرماتے ہیں:

إن الأمة فهمت من هذا اللفظ أنه أفهم عدم نبي بعده أبداً، وعدم رسول بعده أبداً، و أنه ليس فيه تأويل ولا تخصيص، ومَن أوَّله بتخصيص فكلامه من أنواع الهذيان لا يمنع الحكم بتكفيره، لأنه مكذِّب لهذا النص الذي أجمعت الأمة على أنه غير مأوَّل ولا مخصوص.

یعنی تمام امت نے لفظ خاتم النبیین سے یہی سمجھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی اور کوئی رسول کبھی نہ ہوگا، اور اس لفظ میں کوئی تاویل وتخصیص نہیں، اور جو اس میں کوئی تخصیص کرے اس کا کلام بیہودہ بکواس ہے، اس کی تاویل اس پر کفر کا حکم لگانے سے نہیں روک سکتی، اس لیے کہ

اس نے اس نص صریح کو-جس کے غیر مأول وغیر مخصوص ہونے پر امت محمدیہ کا اجماع ہے-جھٹلایا ہے۔

اسی کے قریب قریب علامہ قاضی عیاض نے شفاء میں فرمایا ہے۔

اورجلال الدین محلی نے لکھا ہے: **به ختموا** یعنی خاتم النبیین کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر انبیاء ختم کردیے گئے۔

اورتفسیر مدارک میں ہے:

أي آخرهم يعني لا يُنبَّأ أحد بعده.

یعنی خاتم النبیین کا مطلب آخری نبی ہے، اور یہ کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

یہ صرف پندرہ نام بطور نمونہ کے لکھے جاتے ہیں، ورنہ اگر ان علماء کے اقوال کو جمع کرنے کا ارادہ کیا جائے، جنھوں نے خاتم النبیین کی مراد ''آخری نبی'' سمجھی اور بتائی ہے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ آپ امام غزالی کی عبارت میں پڑھ چکے ہیں کہ تمام امت محمدیہ کا اتفاق ہے کہ خاتم النبیین کی صاف وصریح مراد یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی ورسول نہ ہوگا۔

احادیث میں ختم نبوت کا اعلان:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے تحذیر الناس (ص۱۰) میں فرمایا ہے کہ احادیث میں یہ مضمون حد تواتر کو پہنچ گیا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ حضرت مولانا کے دعوائے تواتر کے ثبوت میں نمونہ کے طور پر چند حدیثیں ملاحظہ ہوں:

۱:- **إنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلا رَسولَ بعدِيْ ولا نبيَّ** یعنی بے شبہہ رسالت ونبوت ختم ہوگئی، پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا نہ نبی (دیکھو ترمذی شریف ۲/۵۱) بروایت انس رضی اللہ عنہ۔

۲:- **أنَا مُحَمَّدٌ النَّبِيُّ الأُمِّيُّ وَلا نَبِيَّ بَعدِي.** میں نبی ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا (دیکھو مسند احمد ۲/۱۷۲) عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔

۳:- لَمْ يَبْقَ بَعدِي مِنَ النُّبُوَّةِ إلَّا المُبشِّراتُ. میرے بعد نبوت میں سے کچھ باقی نہ رہا، ہاں بشارت دینے والے خواب رہ گئے (بخاری) عن ابی ہریرۃ ؓ۔

۴:- جِئتُ فختَمتُ الأنبياءَ. میں آیا پس میں نے نبیوں کے سلسلہ کو ختم کر دیا (مسلم شریف ۲/۲۴۸)۔

۵:- وأنا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لا نَبِيَّ بَعدِي. میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا (ابوداؤد ۲/۱۲۶، ترمذی ۲/۴۵، مسند ۵/۱۷۸)

۶:- وأنا الْعَاقِبُ الَّذِيْ لَيْسَ بَعدِي نبيٌّ. (میں عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا) (ترمذی ۲/۱۰۷، مسلم ۲/۲۶۱)

۷:- لا نُبُوَّةَ بَعديْ إلا الْمُبَشِّراتُ میرے بعد نبوت نہیں ہے مگر بشارت دینے والے کے خواب ہیں (مسند احمد ۵/۴۵۴ بروایت ابوطفیل ؓ)

۸:- لَوْ كَانَ بَعديْ نبيٌّ لَكانَ عُمرُ بنُ الخَطَّابِ. اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتے۔ (ترمذی ۲/۲۷۸)

۹:- إلَّا أنَّه لا نُبُوَّة بعدِي (ترمذی ۲/۲۱۴ عن سعد بن ابی وقاص، مسلم ۲/۲۷۸)

۱۰:- إلَّا أنَّه لا نبِيَّ بعديْ (ترمذی ۲/۲۱۴ عن جابر ؓ)

دونوں حدیثوں کا حاصل یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

۱۱:- كَانتْ بَنُو إسرائيلَ تَسُوسُهمُ الأنبياءُ كُلَّمَا هَلَكَ نبيٌّ خَلَفَه نبيٌّ وإنَّه لا نبيَّ بعدِي یعنی بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرتے تھے۔ جب ایک نبی کا انتقال ہوتا دوسرا اس کی جگہ پر آتا تھا، اور میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا (بخاری ۱/۴۹۱، مسلم ۲/۱۲۶، ابن ماجہ ۲۱۲ بروایت ابوہریرۃ ؓ)۔

۱۲:- ذَهَبَتِ النُّبُوةُ وبَقِيَتِ المُبَشِّراتُ (مسند احمد ۶/۳۸۱، فتح الباری ۱۲/۳۰۵ وابن ماجہ ۲۵۶ بروایت ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا)۔

۱۳:- وخُتِمَ بِي النبيُّونَ (مسلم ۱/۱۱۹، ترمذی ۱۸۸ بروایت ابوہریرۃ)۔

۱۴:- حدیث شفاعت: أنتَ رسولُ اللهِ وخَاتَمُ الأنبياءِ (ترمذی ۲/۶۶

ومسلم بروایت ابوہریرہ)

۱۵:- يَا آدمُ إنَّه آخِرُ النَّبِيِّيْنَ مِنْ ذُرِّيَّتِك (طبرانی صغیر: ۲۰۷) اے آدم علیہ السلام! وہ یعنی محمد ﷺ تیری ذریت میں سب سے آخری نبی ہوں گے۔

۱۶:- فإنيْ آخِرُ الأنبياءِ ومَسْجِديْ آخِرُ المَساجِدِ (مسلم ۱/۴۴۶ ونسائی ۱/۱۱۳ بروایت ابوہریرہ)

۱۷:- أنا خَاتِمُ الأنبياءِ ومَسجِديْ خَاتِمُ مَساجِدِ الأنبياءِ. (رواه البزار عن عائشةؓ ذكره الهيثمي في المجمع ٤/٤)

۱۸:- ذَهَبَتِ النُّبُوَّةُ فَلا نَبِيَّ بَعديْ إلا المُبَشِّراتُ (رواه الطبراني والبزار عن حذيفة بن أسيد كما في مجمع الزوائد ١٧٣/٧) نبوت جاتی رہی پس میرے بعد نبوت نہیں ہے بجز اس کے کہ بشارت والے خواب رہ گئے ہیں۔

۱۹:- فأنا مَوضِعُ اللَّبِنَةِ وأنا خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ، پس میں (قصر نبوت میں) اینٹ کی جگہ ہوں اور میں آخری نبی ہوں (مسلم ۲/۲۴۸ بروایت ابوہریرہ)

۲۰:- حدیث ۱۹ بروایت ابوسعید خدریؓ، امام مسلم نے اس کی اسناد ذکر کر کے کہا کہ ابوسعیدؓ نے بھی ابوہریرہؓ کے مثل کہا (مسلم ۲/۲۴۸) اور امام احمد نے حدیث ابوسعید مسند ۳/۹ میں روایت کی ہے کہ اس میں یہ ہے: فجِئتُ أنا فأتْمَمتُ تلكَ اللَّبِنَةَ یعنی پھر میں آیا تو میں نے اس عمارت (قصر نبوت) کو پورا کر دیا۔

۲۱:- لا يَبْقَى بَعدِيْ مِنَ النُّبُوةِ إلا المُبشِّراتُ (أخرجه أحمد والبزار كما في المجمع ١٧٢/٧) میرے بعد نبوت باقی نہ رہے گی، بس بشارت والے خواب رہ جائیں گے۔

۲۲:- حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا: يَا أيُّهَا النَّاسُ إنَّه لا نَبِيَّ بَعدِيْ ولا أُمَّةَ بَعْدَكُم (مجمع الزوائد ۸/۲۶۳) اے لوگو! بے شک میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی دوسری امت نہیں۔ یعنی میں آخر الانبیاء اور تم آخر الامم ہو۔ ☆......☆......☆

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعَالَمِیۡنَ

حضرت مسیح علیہ السلام کو دنیا میں آئے ہوئے تقریباً چھ سو برس گزر چکے ہیں، روئے زمین بعینہٖ وہی نقشہ پیش کررہا ہے جو عموماً انبیاء ومرسلین اور مصلحین امت کے برکات وجود اور آثارِ فیض سے ایک مدت دراز تک محروم رہنے کے بعد ہوا کرتا ہے، دنیا کا گوشہ گوشہ تاریک، روئے زمین کا چپہ چپہ تیرہ وتار ہے، اِس سرے سے اُس سرے تک کوئی حق وصداقت کی دھندلی سی روشنی بھی نظر نہیں آتی، رشد وہدایت کے کسی ٹمٹماتے ہوئے چراغ، یا جھلملاتے ستارے کا سہارا بھی نہیں ہے، تہذیب وتمدن کا چراغ گل ہے، فلسفہ وحکمت کا بازار سرد ہے، سارے عالم میں ایک عام گمراہی اور ضلالت پھیلی ہوئی ہے، دنیا حق پرستی کے نام سے ناآشنا ہوچکی ہے، باطل پرستی کا زور ہے، کفروشرک، فسق وفجور، ظلم وعدوان کی گرم بازاری ہے، افراد انسان توحید کا سبق بھلا بیٹھے ہیں، آخرت کی یاد دلوں سے محو ہوچکی ہے، زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں صرف ایک خدا کی عبادت کی جاتی ہو، کہیں خیر وشر کے دو الگ الگ خدا مانے جاتے ہیں، کوئی مسیحؑ کی الوہیت کا دم بھر رہا ہے، کوئی عزیزؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے رہا ہے، کہیں پر ہیکلوں کی پوجا ہورہی ہے، کہیں بے شمار مورتیاں پجتی ہیں، کوئی ستارہ پرستی پر ریجھا ہوا ہے۔ پھر عبادت کی بھی عجیب عجیب صورتیں تراش لی گئی ہیں، مختلف ضروریات کے مختلف حاجت روا فرض کرلیے گئے ہیں۔ الغرض ایک عجیب طوفان بے تمیزی برپا ہے، زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے، جس میں بے اعتدالیاں راہ نہ پاگئی ہوں، عقائد، عبادات، معاملات، ان میں سے ہر ایک میں افراط وتفریط اور طرح طرح کی بے شمار خرابیاں اور قسم قسم کی کمزوریاں داخل ہوگئی ہیں۔

ایسی حالت میں جب کہ اقوام وملل کی ہر حالت قابل اصلاح، ان کی زندگی کے تمام شعبے مناسب ترمیم کے محتاج تھے، اور ان کے تمام عقائد واعمال میں بہت کچھ تعدیل وتقویم کی ضرورت تھی، رب العالمین کی غیرت کو حرکت ہوئی، اس کا دریائے رحمت جوش میں آیا، اور چاردانگ عالم میں اپنی توحید کا ڈنکا بجانے کے لیے ایک منادیٔ توحید، اور اقوام وملل کے مردہ جسموں میں اخلاق فاضلہ کی روح پھونکنے کے لیے ایک زبردست معلم اخلاق اور سیاسیات واصول حکمرانی، قواعدِ سلطنت وضوابطِ رعایا پروری ومعدلت گستری کی عملی تعلیم دینے کے لیے ایک بے نظیر ماہر سیاست اور انسانوں کی ہر کمزوری وپستی کو دور کرنے کے لیے ایک مصلح اعظم کو اپنی رسالت وخلافت کا بیش بہا خلعت دے کر مبعوث فرمایا، جو ایسے وقت میں جب کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تشنہ کام تھا، فاران کی چوٹیوں سے ابر رحمت بن کر نمودار ہوا، اور فضائے عالم میں محیط ہوکر اس شان سے مصروف بارش ہوا کہ اس کے باران فیوض وبرکات سے مدت کی جلی ہوئی کھیتیاں لہلہانے لگیں، صدیوں کی خشک اور مردہ زمین سیراب وشاداب ہوگئی، ﴿فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہَا الۡمَآءَ اہۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ﴾.

اس مقام پر یہ نکتہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے، کہ معروضات سابقہ صرف شاعرانہ نکتہ آرائیاں نہیں ہیں، حاشا وکلا! بلکہ ترجمان وحی ﷺ نے بھی اپنی تعلیم وارشاد کی حقیقت اسی تمثیل کے ذریعہ سمجھائی ہے:

مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللّٰہُ بِهِ مِنَ الهُدَی وَالعِلْمِ كَمَثَلِ الغَيْثِ الكَثِيرِ أَصَابَ أَرْضاً، فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ، وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰہُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا، وَسَقَوْا، وَزَرَعُوا؛ وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللّٰہِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِي اللّٰہُ بِهِ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْساً وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰہِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ.

ترجمہ: ’’اس سرمایۂ علم وہدایت کی مثال جسے لے کر میں آیا ہوں، بارش کے پانی کی سی ہے، جس کا کچھ حصہ عمدہ اور سیر حاصل زمینوں کو ملتا ہے اور وہ سبزہ اور گھاس اگاتی ہیں؛ کچھ حصہ ناقابل کاشت حصوں میں پہنچتا ہے، ان میں پانی جمع ہوتا ہے جو آدمیوں اور جانوروں کے پینے اور زراعتوں میں آب رسانی کے کام آتا ہے؛ ایک حصہ زمین وہ بھی ہوتا ہے، جو پانی روک سکے نہ سبزہ اگائے، اس کو چکنا گھڑا سمجھو، پانی پڑا اور ڈھلک گیا۔ اسی طرح میرے علم وہدایت سے بھی کچھ لوگ صرف اپنی ذات کو، کچھ اپنے علاوہ دوسروں کو بھی نفع پہنچاتے ہیں، اور کچھ بدبخت ایسے بھی ہیں جنھیں حرکت تک نہیں ہوتی، آنکھ اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں‘‘۔

وہ مہر جہاں تابِ رسالت افق عرب سے طلوع ہو کر اس ادا سے تجلی ریز ہوا کہ اس کی ضیا پاش کرنوں سے عالم کون کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا، زمین کا گوشہ گوشہ اس کی تجلیات سے بقعۂ نور بن گیا۔

کفر وشرک کی تو برتو ظلمتیں کافور ہو گئیں، الحاد وبے دینی کا پردہ چاک ہو گیا، لاکھوں بے بصارت آنکھیں بینا، اور محروم سماعت کان شنوا، اور سیاہ تاریک دل انوار سے معمور ہو گئے۔ خدا کے اس منادی کی ایک للکار سے مدتوں کے مدہوشِ غفلت چونک اٹھے، داعیٔ اسلام کی ایک آواز میں برسوں کی سرمست خواب قومیں بیدار ہو گئیں، انسانوں نے از سر نو اپنے خالق سے رشتے جوڑے جن کو وہ توڑ چکے تھے، اور ان کی گردنیں پھر اسی آستانہ پر خم ہو گئیں، جس سے وہ یک لخت بیزار ہو گئے تھے، اور چند سالوں کی قلیل مدت میں عبادات کے تمام اسرار ورموز، فلسفہ اور اخلاق کے تمام نکات، تہذیب وتمدن کے کل اصول، سیاست وحکمرانی کے تمام آئین ان کو سکھا دیے، اور ان کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی خرابیوں کی اصلاح فرما دی، دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ فرستادۂ حق درحقیقت دنیا والوں کے لیے فرشتۂ رحمت، پیام مسرت، مجسمۂ عدل وانصاف، پیکر عفو واحسان ہے، اور وہ بے شک

﴿وَ يَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ﴾ کی مجسم تفسیر ہے۔

اس کی تفسیر کہ آپ نے فرائض رسالت کیوں کر انجام دیے؟ وہ اصلاحات وتعلیمات جو صرف آپ کا طرۂ امتیاز ہیں کیا کیا ہیں؟ آپ نے کن کن عنوانوں سے اپنے ’’رحمۃ للعالمین‘‘ ہونے کا ثبوت دیا؟ اور وہ کون کون سے واقعات ہیں، جو آپ کی اس حیثیت کو نمایاں کر رہے ہیں؟ ایک دفتر میں بھی نہیں سما سکتیں، اس کے لیے آپ کی مکمل سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہم چند عنوانوں کے ماتحت صرف نمونہ پیش کر سکتے ہیں:

۱:- اگلی شریعتوں میں احکام نہایت سخت نافذ کیے گئے تھے، اور ان امتوں کی سرکشی، تمرد اور اکھڑ پنے کی وجہ سے تشدد اور سخت گیری سے کام لیا گیا تھا، مثلاً حکم تھا کہ توبہ کرنا ہو تو جان دے دی جائے؛ جن اعضاء سے گناہ سرزد ہوں، کاٹ ڈالے جائیں؛ بدن کپڑے کا جو حصہ نجاست آلودہ ہو جائے، قینچی سے تراش دیا جائے؛ کسی کے قاتل سے دیت لینا حرام ہے، بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ قاتل قصاص میں مارا جائے؛ اونٹ کا گوشت، گائے، بھیڑ، بکری کی چربی کھانا حرام ہے؛ مال غنیمت کو اپنے مصرف میں لانا جائز نہیں، اس کو اکٹھا کر کے جلا دیا جائے؛ عبادت خانوں کے علاوہ اور کہیں ادائے نماز جائز نہیں۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کے صدقہ میں یہ سختیاں اٹھا لی گئیں، خدا نے فرمایا: ﴿وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ﴾.

۲:- زمانۂ جاہلیت میں والد وولد، بھائی بہن، میاں بیوی، خادم ومخدوم کے تعلقات نہایت ناخوش گوار ہو گئے تھے، ان تعلقات کو خوشگوار بنانے، اور علاقہائے قرابت وغیرہ کو مستحکم کرنے کے لیے آپ نے ایسے اصول تعلیم کیے، اور وہ آئین مقرر کیے کہ دنیا کا کوئی مذہب ان کی مثال پیش کرنے سے قطعاً عاجز ہے۔

اولاد اور والدین کے حقوق:

ماں باپ کو اولاد کے ساتھ الفت وشفقت کے برتاؤ کرنے کی تاکید کی، فرمایا:

۱:- جو چھوٹوں پر رحم نہ بڑوں کا لحاظ کرے، وہ ہماری جماعت سے نہیں (ترمذی)۔

۲:- شفقت و مہربانی سے کوئی بدبخت ہی محروم رہتا ہے (احمد، ترمذی)۔

۳:- جو آدمیوں پر رحم نہ کرے گا اس پر خدا رحم نہ کرے گا (صحیحین)۔

اولاد کے فرائض میں داخل کر دیا گیا کہ والدین کی رضاجوئی، اور ان کو آرام وآسائش پہنچانا اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دے لیں، اور ان کے اکرام اور فرماں برداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ فرمایا:

۱:- خدا کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے، اور اس کی ناراضی باپ کی ناخوشی میں (ترمذی)۔

۲:- فرمایا کہ اور سارے گناہ تو خدا جتنا چاہتا ہے بخشتا ہے، مگر والدین کی نافرمانی کا خمیازہ آدمی اپنی زندگی میں بھگتتا ہے (بیہقی)۔

کیا یہ تاکیدی احکام اس بات کی کافی شہادت نہیں کہ سرور کائنات ﷺ کے مبارک قلب میں رحم وکرم اور شفقت والفت کا دریا موج زن تھا، کیا اس شخص سے بھی ایسی تعلیمات کی توقع کی جاسکتی ہے جس کا دل ہمدردی ورحم دلی کی کیفیات سے ناآشنا ہے۔

بعض عرب فاقہ کشی، یا غیر کفو میں شادی کرنے کے ڈر سے اپنی اولاد کو زندہ دبا دیتے تھے، قرآن نے اس رسم کو سختی سے روکا اور رحمۃ للعالمین ﷺ کے طفیل میں یہ رسم مٹ گئی ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ﴾ اور فرمایا: ﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾.

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا خدا نے حرام قرار دیا ہے (صحیحین)۔

بدوی عرب اپنے بچوں کو پیار نہیں کیا کرتے تھے، چنانچہ ایک بدوی آنحضرت ﷺ کو کسی بچے کا بوسہ لیتے دیکھ کر متعجب ہوا اور کہا کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں چوما کرتے، آپ نے فرمایا کہ خدا اگر تیرے دل سے رحمت وشفقت نکال لے تو میں کیا کرسکتا ہوں، یعنی تم بے رحم

ہو (بخاری ومسلم)۔

یہ معلوم ہے کہ سرور کائنات ﷺ دُرِّ یتیم تھے، اس لیے خدمت واکرام والدین کی عملی تعلیم کی کیا صورت تھی، تاہم آپ کی رضاعی ماں جن کا آپ نے دودھ پیا تھا، زندہ تھیں، آپ جعرانہ میں گوشت تقسیم کررہے تھے کہ وہ تشریف لائیں، آپ نے چادر مبارک اتار کر بچھادی اور اس پر ان کو بٹھادیا (ابوداؤد)۔

اس سے آپ نے بتادیا کہ رضاعی ماں اس اکرام کی مستحق ہے، تو حقیقی والدین کا جتنا بھی اکرام کیا جائے کم ہے۔

بھائی بھائی میں علاقۂ محبت کو مستحکم کرنے کے لیے ارشاد ہوا:

حَقُّ كَبِيرِ الإِخْوَةِ عَلَى أَصْغَرِهِمْ حَقُّ الوَالِدِ عَلَى وَلَدِه (بیہقی) — بڑے بھائی کے حقوق بھی باپ کے سے ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ تمام اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک، رواداری کی نہایت سختی سے تاکید کی، فرمایا کہ: اس قوم پر نزول رحمت کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، جس میں کوئی قرابت داروں سے بدسلوکی کرنے والا ہوتا ہے (بیہقی)۔

غور کرو آپ کے دل میں مخلوق کا کتنا درد تھا، کہ کسی شخص کی اپنے رشتہ داروں سے کوئی بدسلوکی آپ کو گوارا نہیں، آپ کسی کو ملول خاطر دیکھنا نہیں چاہتے۔

پڑوسی کے ساتھ ہمدردی:

فرمایا: اس کا ایمان کامل نہیں، جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہیں (مسلم)۔

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پڑوسی کے ساتھ ہمدردی کرنے کی اس کثرت سے تاکید کی کہ ہم کو یہ خیال ہونے لگا کہ اس کو وراثت میں بھی شریک فرمائیں گے (صحیحین)۔

عامۃ المسلمین کی خیر خواہی:

حضرت جریر راوی ہیں کہ منجملہ ان امور کے جن پر بیعت لی جاتی تھی، ہر مسلمان کی خیر خواہی بھی ہے (مسلم، بخاری)۔

یہ بھی فرمایا کہ دین چند چیزوں کی خیر خواہی کا نام ہے، ان میں سے ایک مسلمان کی خیر خواہی بھی ہے (مسلم)۔

فرمایا: مسلمان کا خون، اس کا مال، اس کی آبرو، دوسرے مسلمان پر حرام ہے (مسلم)

تمام اہل زمین کے ساتھ رحمدلی:

ارشاد ہوا:

الرَّاحِمُونَ يَرحَمُهم الرَّحمانُ، ارحَمُوا مَنْ في الأرضِ يَرحمُكم مَنْ في السماء (ابوداؤد، ترمذی)۔

رحم کرنے والوں پر خدا رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

اور فرمایا:

الخَلْقُ عِيالُ اللهِ فأحَبُّ الخَلقِ إلى اللهِ مَنْ أحْسَنَ إلَى عِيالِه (شعب الایمان)

مخلوق عیال خدا ہے، پس خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اپنے عیال پر احسان کرے۔

خادموں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک:

۱:- آپ کی آخری وصیتوں میں سے ایک یہ ہے:

اتَّقُوا اللهَ فِيمَا مَلَكَتْ أيْمَانُكم (ابوداؤد)

یعنی اپنے لونڈی غلاموں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔

۲:- حضرت ابوذرؓ نے ایک بار ایک عجمی غلام کو کچھ برا بھلا کہہ دیا، غلام نے حضورؐ

کے پاس شکایت کی، آپ سخت ناراض ہوئے، فرمایا:

أبا ذر إنَّكَ امروٌ فيك جاهليةٌ إنَّهم إخوانُكم، فَضَّلَكم اللهُ عليهم، فمَن لَمْ يُلائِمْكم فبِيعُوه ولا تُعذِّبوا خلقَ الله. (ابوداؤد)

یعنی اے ابوذر تم میں ابھی جاہلیت کی بو آتی ہے، یہ غلام بھی تمہارے بھائی ہیں، فرق اتنا ہے کہ اللہ نے تم کو ان پر یک گونہ فضیلت دے دی ہے، جو غلام تمہاری خواہش کے مطابق نہ نکلیں ان کو فروخت کر دو، اور خدا کی مخلوق کو عذاب و تکلیف نہ دو۔

۳:- ایک بار ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے غلام کو پیٹ رہا ہے، آپ نے فرمایا کہ یاد رکھو، خدا تم سے کہیں زیادہ صاحب قدرت ہے، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آنحضورؐ تھے، فوراً اس غلام کو آزاد کر دیا، آپ نے فرمایا کہ تم اگر ایسا نہ کرتے تو آتش جہنم تم کو جھلس ڈالتی (ابوداؤد)۔

۴:- ایک صحابی نے پوچھا کہ حضرت! خادم سے کتنی بار درگذر کی جائے؟ آپ نے فرمایا دن میں ستر بار (ابوداؤد)۔

۵:- سوید بن مقرن فرماتے ہیں کہ ہم سات بھائی تھے، ہمارے ساتھ ایک خادم بھی تھا، چھوٹے بھائی نے خادم کے ایک طمانچہ رسید کر دیا، آپ نے خادم کو آزاد کرنے کا حکم فرمایا (ابوداؤد)۔

عورتوں کی دادرسی:

عہد جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ جو بدسلوکیاں روا رکھی جاتی تھیں، ان پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، ان کی داستان نہایت طویل ہے، عورتیں وراثت سے مطلقاً محروم کر دی جاتی تھیں، ان کی حیثیت ایک زرخرید باندی سے زیادہ نہ تھی، ان کی بے بسی و مجبوری کی کوئی انتہا نہ تھی، رسول رحمت کی تشریف آوری ان کے حق میں فرشتۂ رحمت کی آمد ثابت ہوئی،

رحمۃ للعالمین ﷺ کی بعثت کا دن ان کے لیے زندان مظلومی سے رہائی کا دن تھا، سرکار دوعالم ﷺ نے ان کو حقوق زندگی میں قریب قریب برابر کا شریک قرار دیا، میراث میں ان کا حصہ مقرر کیا گیا:

﴿لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ﴾

یعنی ماں باپ یا دوسرے رشتہ دار جو چھوڑ کر مر جائیں، اس میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔

۱:- آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

استوصُوا بِالنِّساءِ خَیراً (صحیحین) عورتوں سے خوبی سے پیش آؤ۔

۲:- اور فرمایا: ''اپنی بی بی کو لونڈیوں کی طرح نہ مارو'' (ابوداؤد)۔

۳:- اور فرمایا کہ: ایک شخص اپنی بی بی کو پیٹتا ہے اور تھوڑی دیر بعد ہی شاید اس کے پاس لیٹے گا، یعنی اس کو شرم نہیں آتی '' (صحیحین)۔

۴:- اور فرمایا: ''خدا کی باندیوں کو یعنی عورتوں کو نہ مارو'' (ابوداؤد)۔

۵:- اور فرمایا: ''عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو''۔

۶:- اور فرمایا: ''بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنی بیبیوں کیلئے بہتر ثابت ہوں'' (ترمذی)

۷:- زمانۂ جاہلیت میں جتنی بار چاہیں، طلاق دے کر رجعت کرلیں، بہت سے بے رحم عورتوں کو یوں تنگ کیا کرتے تھے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے اس مصیبت سے بھی عورتوں کو نجات دلائی، مذہبی قانون مقرر ہوگیا کہ تین بار طلاق دینے کے بعد رجعت حرام ہے۔

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ (الی) فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ﴾.

جانوروں کے ساتھ رحم دلی:

''رحمۃ للعالمین ﷺ'' کی رحمت اور شفقت کچھ انسانوں ہی تک محدود نہ تھی، بے

زبان جانور بھی بہرہ اندوز ہوئے، انسانوں کی طرح وہ بھی اپنے مالکوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر بارگاہ رسالت میں اپنی زبان بے زبانی سے شاکی ہوتے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے۔

۱:- ایک صاحب نے کہیں سے ایک چڑیا اور اس کے چند بچے پکڑ لیے تھے، انھیں لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان کے پکڑنے کا قصہ سنایا، آپ نے فرمایا:

ارجِعْ بِهِنَّ حتى تضَعَهنَّ مِنْ حيثُ أخَذتَهنَّ وأمَّهن معَهُنَّ (ابوداؤد)۔ یعنی انھیں لے جاؤ اور ان کو ان کی ماں کے ساتھ وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے پکڑ لائے ہو۔

۲:- بعض سنگ دل زندہ جانوروں کو کہیں باندھ کر نشانہ درست کیا کرتے تھے، آپؐ نے فرمایا ایسا کرنے والا ملعون ہے: ''إنَّ النبيَّ ﷺ لَعَنَ مَنِ اتَّخَذَ شَيئاً فِيهِ الروحُ غرَضاً''.

۳:- جانوروں کے منھ میں مارنے سے منع فرمایا، یہ بھی فرمایا کہ داغنا ہو تو چہرہ پر نہ داغا جائے (مسلم)۔

۴:- فرمایا: ایک کتا ایک کنویں کے پاس پیاس سے دم توڑ رہا تھا، ایک زناکار عورت نے کنویں سے پانی بھر کر اسے پلایا، اسی حیلہ سے اس کی بخشش ہوگئی، پھر آپ نے فرمایا کہ ہر ذی حیات کے کھلانے پلانے میں ثواب ہے (بخاری ومسلم)۔

۵:- فرمایا: ''یہ بھی صدقہ کی ایک قسم ہے کہ کسی کے باغ یا کھیت سے کوئی چڑیا یا چوپایہ کچھ کھالے''۔ (بخاری ومسلم)۔

۶:- فرمایا: ''ایک عورت کو صرف اتنی سی بات پر عذاب دیا گیا کہ اس نے ایک بلی باندھ رکھی تھی، جو بھوک کی تکلیف سے بندھی بندھی مرگئی، اس نے نہ خود کھلایا اور نہ اسے کھولا کہ وہ خود اپنی روزی تلاش کرلیتی'' (بخاری ومسلم)۔

۷:- فرمایا ''جو کوئی بلاوجہ ایک چڑیا کی جان لے گا، تو اس سے باز پرس ہوگی'' (نسائی)

یہ ایک مختصر نمونہ تھا، اور صرف چند مثالیں تھیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں، تاہم ایک نکتہ شناس کو آپ ؐ کی ''رحمۃ للعالمینی'' کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں۔ ہر شخص اگر متأملانہ نگاہ سے دیکھے تو بآسانی فیصلہ کرسکتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے کمزوروں کی جو حمایت، ضعفاء کی دستگیری، مظلوموں کی دادرسی، محتاجوں کی حاجت برآری، مصیبت زدوں کی مشکل کشائی فرمائی ہے، دنیا میں اس کی نظیر نہیں پائی گئی، زمانہ اس کی مثال نہیں پیش کرسکتا۔

صدق اللہ مولانا العظیم: ''وما أرسلنک اِلا رحمةً للعالمین'' فصلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ أجمعین.

☆......☆......☆

اسلام اور صنف نازک

جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی چار دانگ عالم میں چھائی ہوئی ہے۔ ربع مسکون پر جہل وضلالت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ نہ کہیں تمدن کا چراغ روشن ہے نہ مذہب کی شمع افروز، ﴿ظُلُمَاتٌ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ﴾ کا سچا نقشہ پیش نظر ہے۔ ایسی تیرگی وتاریکی میں آفتاب اسلام مشرق حجاز سے طلوع ہوتا ہے، اور اس کی ضیا بار کرنوں کی جلوہ ریزی سے دنیا کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھتا ہے۔ اسلام کی ضیا گستری کسی خاص خطہ وبقعہ اور کسی مخصوص گروہ وجماعت کو مقصود ومحدود نہیں ہوتی، بلکہ آفتاب عالم تاب سے ذرۂ بے مقدار تک سب کے سب یکساں انوار وبرکات کا اکتساب کرتے ہیں۔ داعی اسلام حیوانات کے لیے بھی فرشتۂ رحمت بن کر آتا ہے ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنَاكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعَالَمِيۡنَ﴾ پھر انسان تو انسان ہی ہے، اپنی نوع کے ساتھ شفقت ورافت کا سلوک تو طبع سلیم کا بھی اقتضا ہے۔ ان کے ساتھ جتنی بھی مہربانی کرے اور جس قدر بھی شفقت کے برتاوے رکھے مناسب ہے۔

یوں تو اسلام نے ہر قسم کے لوگوں سے رحمت ومہربانی کا سلوک کیا ہے، مگر کمزوروں اور بیکسوں پر اس کی خاص نظر عنایت ہے۔ فقراء ومساکین کو ایک اسلامی غرض کے لیے بارگاہ نبوی سے علاحدہ کرنے کی ممانعت کا حکم قرآن حکیم میں مصرح ہے: ﴿وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدَاةِ وَالۡعَشِيِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنَاكَ عَنۡهُمۡ (إلی) مَا مَتَّعۡنَا بِهٖ هٰۤؤُلَآءِ﴾ غلاموں کے ساتھ نیک برتاؤ اور کھانے پینے پہننے اوڑھنے میں مراعات مساوات کا حکم صحیح حدیثوں میں موجود ہے۔ غلاموں کو مارنے کی ممانعت ایک مؤکد اسلامی حکم ہے۔

اسلام اصلاح اعظم کا مجسم پیکر بن کر آیا تھا، اس نے انسانوں کے ہر شعبۂ زندگی

میں ایک زبردست اصلاح کی۔عبادات، معاملات، معاشرات ان سب کے لیے اس نے ایسے صحیح اور جچے تلے اصول مقرر کیے کہ انسانی عقلوں کی رسائی بھی وہاں تک محال ہے، ایسے اصول کی تشکیل تو درکنار۔

میں اس وقت معاشرتی اصلاح میں سے عورتوں اور مردوں کے باہمی تعلقات سے جو اصلاح متعلق ہے، اس کی بابت کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کی پُر درد کہانی سن کر کون سنگ دل ہے جو نہ رودے۔ لڑکیاں زندہ درگور کردی جاتی تھیں، عورتوں کے حقوق پامال تھے، بلکہ ان کا کوئی حق نہ تھا، ان کی ذلت وکس مپرسی کی کوئی انتہا نہ تھی، ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے دینا یا رکھنا تو اوپری دل سے۔کہیں تعدد ازدواج کی جو سوجھی ہے تو کسی عدد پر بس ہی نہیں کرتے، اور کہیں ایک پر اکتفا کی ہے تو دوسری عورتیں فقر وفاقہ سے مرتی ہیں، یا شہوت پرستی میں ہزاروں طرح کی مصیبتیں جھیلتی ہیں، تو ان کی بلا ان کی جوتی سے۔ایسی خطرناک حالت میں اسلام نے عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کس طرح کھڑا کیا؟ اور انھیں ذلت کے گڑھے سے کیوں کر نکالا؟ ان کے حق کو کیسے زندہ کیا؟ اور ان کی کتنی زبردست دست گیری فرمائی؟ ان سوالات کے خاطر خواہ جوابوں کے لیے ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کے مبارک صفحات اور احادیث رسول کریم ﷺ کا بنظر تعمق مطالعہ کیا جائے۔آیئے ہم آپ کو ان مقامات کی سیر کرائیں جہاں ان باتوں کا تذکرہ ہے۔

۱:-قرآن حکیم نے لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا قطعاً حرام قرار دیا ﴿وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ یعنی قیامت کے دن اس کی بھی بازپرس ہوگی، کہ لڑکی زندہ کیوں دفن کی گئی۔

۲:-قرآن حکیم نے عورتوں کے حقوق مردوں کے حقوق کے قریب قریب مقرر فرمایا ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾.

۳:-عورت ومرد دونوں کو تمام اوامر ونواہی میں مساوی قرار دیا: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ

وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصّٰٓئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ اور فرمایا: ﴿اِنِّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی﴾.

۴:-چار عورتوں سے زیادہ بیاہنے کی اجازت نہ دی، اور اگر عدل و برابری کا برتاؤ نہ ہو سکے تو ایک ہی پر اکتفا کرنے کو کہا ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾.

۵:-جاہلیت کی عادت تھی کہ جب کوئی یتیم لڑکی کسی شخص کو پرورش کرنے کو دی جاتی تھی اور اس کا جمال اس شخص کو اچھا معلوم ہوتا تھا تو وہ شخص چاہتا تھا کہ میں اس سے نکاح کرلوں اور پورا مہر جو اس کو دوسرے شخص سے اگر وہ نکاح کرتی تو ملتا وہ ہرگز نہ دیتا تھا، پس اس کی ممانعت کردی گئی اور حکم ہوگیا کہ اگر بے انصافی کروتو یتیموں سے نکاح کی اجازت نہیں، کسی اور سے جو تمھیں پسند ہو نکاح کرو، ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾.

۶:-زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ چھوٹے بچے اور عورتوں کو میت کے مال سے حصہ نہ دیا جاتا تھا، ایک بار ایک عورت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ میرا شوہر مرگیا ہے اور اس کے دو چھوٹے بچے میری پرورش میں ہیں، ان کو اس کی میراث سے کوئی حصہ نہ ملے گا؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا﴾. حکم ہوگیا کہ حصہ سب کو ملے گا، عورت، مرد، بالغ، نابالغ کی کوئی تخصیص نہیں، ہاں بحسب مراتب کمی زیادتی ضرور ہوگی۔

۷:-رسم تھی کہ جب کوئی شخص مرجاتا تھا تو اس کے اعزہ اس کی عورت پر کوئی چادر وغیرہ رسم کے مطابق ڈال دیتے اور اپنے کو اس عورت کا وارث سمجھتے، پھر اگر چاہتے تو ان میں

سے کوئی خود اس سے نکاح کر لیتا اور مہر وغیرہ کچھ نہ دیتا تھا، یا کسی دوسرے سے نکاح کر دیتے اور وہ جس قدر مہر دیتا وہ خود لے لیتے، ہاں وہ عورت اگر کپڑا اڈالنے سے پہلے اپنے گھر چلی جاتی تو پھر وہ خود مختار رہتی، اور کبھی ایسا بھی کرتے تھے کہ نہ خود اس سے نکاح کرتے اور نہ کسی دوسرے کو کرنے دیتے، بلکہ اس بے چاری کو یونہی روک رکھتے، جب وہ مر جاتی تو اس کا مال ومتاع لے لیتے۔ حق سبحانہ نے ان تمام جابرانہ رسوم اور ظالمانہ حرکات کو سختی سے بند کر دیا اور فرمایا کہ زبردستی عورتوں کے وارث نہ بنو اور نہ مال لینے کی غرض سے ان کو روک رکھو: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾.

۸:- زمانۂ جاہلیت کے ان شدید ترین مظالم میں سے جو بے بس عورتوں پر ڈھائے جاتے تھے، ایک یہ بھی تھا کہ جو شخص اپنی بی بی سے خفا ہوتا تو جھوٹ موٹ اس غریب پر کوئی تہمت رکھ کر اور کوئی الزام دے کر اس سے کچھ مال لے کر چھوڑ دیتا، اسلام نے اس ناروا ظلم کی بھی بندش کر دی اور حکم ہوگیا کہ جب تم اپنی بی بی سے خفا ہو کر اس کی جگہ دوسری کرنا چاہو، تو جو کچھ اسے پہلے دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لو، اور نہ اس پر اہل جاہلیت کی طرح تہمت لگاؤ: ﴿وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا﴾. پھر زن وشوہر کے گہرے تعلقات یاد دلا کر استعجاب ظاہر کیا جاتا ہے کہ باوجود اتنی بے تکلفی کے اور اس قدر انتفاع کے یہ مال لینا کیوں کر گوارا ہوتا ہے: ﴿وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنْكُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا﴾.

۹:- جاہلیت کی ایک رسم بد یہ بھی تھی کہ عورت کو طلاق دیتے اور جب عدت ختم ہونے کو ہوتی، بس رجوع کر لیتے، پھر طلاق دیتے، اسی طرح صدہا مرتبہ طلاق دیتے، دے کر رجوع کر لیتے۔ اسلام نے قانون مقرر کر دیا دو مرتبہ سے زیادہ طلاق دینے کے بعد پھر

اختیار رجعت باقی نہیں رہتا، دو کے بعد بھی اگر رجعت کرے، تو اچھے سلوک اور نیک برتاؤ کرے، یا چھوڑے تو حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دے: ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا﴾

اور اگر کہیں تین طلاقیں دے دیں، جب تو بدون دوسرا شوہر کیے پہلے کے لیے حلال نہیں ہو سکتی: ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾.

۱۰:- جاہلیت میں عورتوں کو مہر وغیرہ جو کچھ دیتے تھے اس کو اپنے تصرف میں لاتے تھے اور اس میں کوئی خرابی نہ سمجھتے تھے، خدائے اسلام نے اس تصرف کو بھی حرام اور ناجائز قرار دیا: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا﴾.

۱۱:- عہد جاہلیت میں طلاق کی عدت پر عمل نہ ہوتا تھا، طلاق دینے کے ایک برس کے بعد پھر عورت پر دعویٰ کر دیتے، اس وجہ سے کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح نہیں کر سکتا تھا، اور نہ خود وہ شخص اس کو روٹی کپڑا دیتا اور عورت کی جان ضیق میں پڑی رہتی۔ خدائے پاک نے اس ظلم کو بھی موقوف کر کے ایک زمانہ مقرر کر دیا کہ اس کے ختم ہوتے ہی وہ عورت دوسرے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، اور پہلے سے کوئی لگاؤ نہیں رہتا: ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾، ہاں عدت کے درمیان میں البتہ رجعت کا اختیار دیا ہے، مگر ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی ہے کہ رجعت جب کرنا جب اصلاح کا ارادہ ہو: ﴿وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾.

۱۲:- طلاق دینے پر جب عدت گذر جاتی تو عورت کے اولیا پھر پہلے شوہر سے نکاح نہیں کر دیتے تھے، جیسا کہ معقل بن یسار کا واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ ان کی بہن کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، بعد میں وہ پشیمان ہوئے اور چاہا کہ پھر نکاح کر لیں، معقل کو اس حرکت پر غصہ آ گیا، انھوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا، اس وقت یہ آیت نازل

ہوئی: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فلا تَعْضُلُوهن أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ اور بعضے کہتے ہیں کہ پہلا شوہر خود جبراً وظلماً دوسری جگہ کرنے سے روکتا تھا، تو یہ ممانعت صادر ہوئی۔ بہرحال یہ بھی ایک بے جا کارروائی عورت پر زبردستی کی جاتی تھی، اس سے نہی فرمادی گئی۔

۱۳:- بیوہ عورت نہایت ذلت وعسرت کے ساتھ بد سے بدتر حالت میں ایک برس تک عدت گذارتی، احادیث میں بیوہ کی اس خواری وذلت وبیکسی وکس مپرسی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، وارد ہوتا ہے کہ عورت کا شوہر جب مرتا تھا تو عورت ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں داخل ہوتی اور اپنے کپڑوں میں سے سب سے زیادہ میلے کچیلے کپڑے پہنتی، نہ خوشبو ملتی، نہ دوسری کوئی چیز چھوتی، اور اسی حالت میں ایک سال بسر کرتی۔ ایک سال کے بعد کوئی جانور، گدھا، یا بکری، یا کوئی چڑیا لائی جاتی اور اس کو وہ اپنے شرم گاہ سے مس کرتی، جس چیز کو وہ مس کردیتی وہ بہت کم جیتی تھی، پھر کوٹھری سے نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی کہ اس کو پھینکے، وہ پھینکتی جب جا کے عدت تمام ہوتی، اور خوشبوئیں وغیرہ اس کے لیے حلال ہوتیں۔ اس بیہودہ ولایعنی رسم کو بھی اسلام نے بند کردیا۔ ایک عورت نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ حضرت! میری لڑکی بیوہ ہوگئی ہے اور اس کی آنکھیں جوش کرآئی ہیں، اس کے لیے سرمہ استعمال کرسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، پھر آپ نے اسلام کی سہولت وآسانی اور جاہلیت کی سخت گیری کا اور خدا کی اس نعمت کا ذکر فرمایا ہے: **قَدْ كَانَتْ إِحداكُنَّ تُحْبَسُ حَوْلاً وإنَّمَا هِيَ أربعةُ أشهُرٍ وعَشراً.**

۱۴:- یہودیوں کے یہاں رسم تھی کہ جب عورت حائضہ ہوتی تو اس کے ساتھ کھانا پینا حتی کہ ایک گھر میں رہنا بھی حرام اور گناہ سمجھتے تھے، اور اس کو انتہائی نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اسلام نے اس کی بھی اصلاح فرمادی: **كانتُ اليهودُ إذَا حاضَتْ المَرأةُ مِنهُمْ لَمْ يُواكِلُوهُنَّ ولا يُشَارِبُوهُنَّ ولا يُجَامِعُوهُنَّ في الْبُيوتِ فَسَألُوا النَّبيَّ ﷺ فأنزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وجَلَّ** ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى﴾ **الآية.**

فأمرَهُم رسولُ اللّٰه ﷺ أنْ يُواكِلوهُنَّ ويُشَارِبوهُنَّ ويُجَامِعوهُنَّ في البُيُوتِ وأنْ يَصْنَعُوا بِهِنَّ كُلَّ شَيءٍ ما خَلا الْجماعَ الحديث (مسلم ونسائی وغیرہما)

اور صرف حکم ہی نہیں بلکہ نمونہ پیش کرکے دکھلا دیا:

كان يأخُذُ العَرْقَ فيُقْسِمُ عليَّ فيه فأعترِقُ منه، ثُمَّ أضَعُه فيأخُذُه فيَعْتَرِقُ منه، ويَضَعُ فمَه حيثُ وضَعْتُ فَمِي مِنَ العَرْق، ويَدْعُو بالشَّرابِ فيُقْسِمُ علَيَّ فيه مِنْ قَبْلِ أنْ يَشْرَبَ، فآخُذُه، فأشْرَبُ منه، ثم أضَعُه فيأخُذُه فيَشْرَبُ مِنه، ويَضَعُ فَمَه حيثُ وَضَعْتُ فَمي مِنَ القَدَح (نسائی)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ ایک ہڈی لے کر مجھے قسم دلاتے کہ میں اسے دانت سے نوچوں میں نوچتی اور رکھ دیتی پھر آپ نوچتے اور اپنا دہن مبارک وہیں رکھتے جہاں میں نے منھ لگایا تھا اسی طرح پیالے سے پانی پینے میں بھی کرتے۔

۱۵:- قریش کی عورتیں غریب بلی کی طرح زندگی بسر کرتی تھیں، کیا مجال جو شوہر کی کوئی بات دہراویں یا کسی بات کا جواب دیں، حضرت عمرؓ کی بی بی نے مدینہ میں پہنچ کر ان کی ایک بات کا جواب دے دیا تو ان کو ناگوار اور رنج ہوا اور ان کے قلب پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ بارگاہ نبوی میں جا کر شکایت کی، حضور ﷺ نے سن کر زیر لب تبسم فرمایا اور عورتوں کے متعلق کوئی امتناعی حکم صادر نہیں فرمایا، حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں:

وكُنَّا مَعْشَرَ قُرَيشٍ نَغْلِبُ النِّساءَ، فلَمَّا قَدِمْنا علَى الأنصارِ إذا قَومٌ تَغْلِبُهم نِساؤُهُم، فطَفِقَ نِسَاؤُنا يَأْخُذْنَ مِنْ أدبِ نِساءِ الأنصارِ، فصَخِبْتُ علَى امرَأتي، فرَاجَعَتْني، فأنْكَرْتُ أنْ تُراجِعَني، قالت: ولِمَ تُنْكِرُ أنْ أرَاجِعَک، فو اللّٰهِ إنَّ أزْواجَ النَّبيِّ ﷺ لَيُرَاجِعْنَه، وإنَّ إحْداهُنَّ لَتَهْجُرُه الْيَوْمَ حتَّى اللَّيلِ (بخاری).

یعنی قریش کی عورتیں مردوں سے دب کر رہتی تھیں، جب ہم مدینہ پہنچے تو وہاں معاملہ برعکس تھا، مرد عورتوں سے دب کر رہتے تھے، ہماری عورتوں نے ان کے چلن سیکھنے شروع کر دیے، ایک روز میں نے اپنی بی بی سے غصہ میں تیز لہجہ میں بات کی، اس نے میرا جواب دے دیا، مجھے سخت ناگوار ہوا، اس نے کہا میرے جواب دینے سے تمہیں ناگوار ہوا؟ خدا کی قسم رسول کریم ﷺ کی بیبیاں بھی آپ کا جواب دیتی ہیں یہاں تک کہ بعض بعض تو دن بھر بات نہیں کرتیں۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں شوہروں کی ہر بات کا جواب دے دیں؟ اور اسلام نے اسے جائز رکھا ہے، ہرگز نہیں۔ شوہروں کو جس سے ایذا ہو، وہ اسلام کی نظروں میں پسندیدہ نہیں، اس کی اگر ضرورت ہو تو نصوص سے اس کی حرمت بیان کی جاسکتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے وہ بندش اور قید سخت اور محکومیت روا نہیں رکھی ہے، جو آن والے قریشیوں نے جائز رکھی تھی۔

۱۶:- بلا ضرورت شرعیہ خواہ مخواہ کی بات میں مارنے سے منع کر دیا گیا اور بوقت ضرورت ایسے مارنے کی اجازت دی گئی جس سے سخت چوٹ نہ آئے: **وَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْباً غَيْرَ مُبَرِّحٍ**، اور بخاری شریف میں ہے: **لا يَجْلِدُ أَحَدُكُمْ امرأته جَلْدَ العَبْدِ ثُمَّ يُجَامِعُهَا في آخِرِ اليَوْمِ.** (ج۲:ص۷۷۴)

۱۷:- حجۃ الوداع میں حُجاج مسلمین کے جم غفیر میں بہت سے مؤکد اسلامی احکام کا اعلان کیا گیا تھا، ان میں ایک حکم یہ بھی تھا: **اتَّقُوا اللّٰهَ في النِّسَاء، فإنَّكُم أخَذْتُمُوهُنَّ بِأمَانِ اللهِ واسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللهِ ولَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَداً تَكْرَهُونَه، فإنْ فَعَلْنَ ذلك فاضْرِبُوهُنَّ ضَرْباً غيرَ مُبَرِّحٍ، ولَهُنَّ عَلَيكم رِزْقُهُنَّ وكِسْوَتُهُنَّ بِالمَعْرُوف.** یعنی تم اللہ سے عورتوں کے بارے میں ڈرو کہ تم نے ان کو اللہ کے امان میں لیا ہے اور ان کی شرم گاہوں کو کلمۃ اللہ سے حلال کیا ہے اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمھارے بستر پر کسی کو قدم نہ رکھنے دیں جس سے تم بیزار ہو، پس اگر وہ ایسا

کریں تو ان کو مارو اتنا کہ ہڈی نہ ٹوٹنے پائے اور ان کا حق تمھارے اوپر ان کو دستور کے موافق کھانا کپڑا دینا ہے، اور فرمایا:

اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيراً، فإنَّ المَرأةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ فإنَّ أعوجَ شَيءٍ في الضِّلَعِ أعلاه، فإنْ ذَهَبتَ تُقِيمُ كَسرْتَه، الحديث.

یعنی عورتوں سے سلوک سے پیش آؤ، اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر کی ہے تو اگر تو اس کو سیدھی کرنے لگے گا تو توڑ کے رکھ دے گا۔

☆......☆......☆

في التنفُّل بعد الوتر

(وتر کے بعد نفل نماز کا بیان)

الحمد لأهله والصلوة على أهلها أما بعد!

وتر کے بعد والی دو رکعتوں کے متعلق بارہا غور و فکر کی نوبت آئی، یہی سمجھ میں آیا کہ ان دو رکعتوں کو بیٹھ کر ہی پڑھنا افضل ہے۔ اب کی دفعہ آپ کی فرمائش پر از سر نو روایات کا تتبع کیا، لیکن خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی۔ اس رائے کی تائید میں جس قدر مواد مجتمع ہیں افسوس ہے کہ اس صحبت میں ان سب کو پیش کرنے سے معذور ہوں، اس لیے کہ آج کل بہت عدیم الفرصت ہوں، مختصراً چند باتیں پیش کرتا ہوں:

ا:- متعدد صحابیوں نے اس کی تصریح کی ہے کہ حضور ﷺ یہ دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ منجملہ ان کے حضرت عائشہ صدیقہؓ ہیں، جن کی نسبت سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"**أعلم أهل الأرض بوتر رسول الله ﷺ**"(۱)۔

ام المؤمنین کی یہ حدیث بطریق عراک عن ابی سلمہ صحیح بخاری **باب المداومة على ركعتي الفجر** میں، اور بطریق سعد بن ہشام عنہا (صحیح مسلم: ۱/۲۵۶) وابوداؤد **باب صلوة الليل** اور طحاوی (۱/۱۶۵) میں (الی غیر ذلک) اور بطریق یحییٰ عن ابی سلمہ (مسلم: ۱/۲۵۴) وابوداؤد **باب صلوة الليل**، وطحاوی (۱/۱۶۶) میں (الی غیر ذلک) اور بطریق محمد بن عمرو عن ابی سلمہ، ابوداؤد باب مذکور وطحاوی (۱/۱۶۶) میں اور بطریق زرارة

(۱) مسلم: ۱/۲۵۶

عنہا ابوداؤد میں، اسی طرح بطریق علقمہ بن وقاص بھی ابوداؤد میں۔

دوسرے حضرت ابو امامہؓ کی روایت ہے جو مسند احمد اور شرح معانی الآثار (ص: ۲۰۲) وغیرہما میں موجود ہے۔

تیسرے حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے جو ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

۲:- ابوداؤد ونسائی کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ضعف و پیرانہ سالی سے پہلے اور بعد برابر آپ کا یہی معمول تھا، یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی کرلیا ہو۔ ابوداؤد کا لفظ ہے:

ويقرأ في التاسعة ثم يقعد، فيدعو بما شاء الله أن يدعوَه ويسألَه، ويرغب إليه ويُسلِّم تسليمةً واحدةً شديدةً يكاد يُوقظ أهلَ البيت من شدة تسليمه، ثم يقرأ وهو قاعد بأم الكتاب، ويركع وهو قاعد، ثم يقرأ الثانية، فيركع ويسجد وهو قاعد، ثم يدعو بما شاء الله أن يدعوَ، ثم يُسلِّم وينصرف، فلم تزلْ تلك صلوٰةُ رسول الله ﷺ الخ(۱).

اور نسائی کا لفظ ہے:

فما زالت تلك صلاةُ رسول الله ﷺ(۲).

میرے اس بیان سے معلوم ہوگیا کہ کسی بزرگ کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ:

"بیان جواز کے لیے نفل بعد الوتر ایک مرتبہ یا دو مرتبہ پڑھا ہے"۔

اس بات کو نظر انداز نہ کیجیے گا کہ لفظ **ما زالت** حضرت عائشہؓ کا مقولہ ہے، جنھوں نے آنحضور ﷺ کی نمازوں کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے، اور ایک بار دو بار کے مدعی حضرات مشاہدہ کا تو دعویٰ نہیں کرسکتے، اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کوئی

(۱) باب في صلوة الليل کی تیرہویں حدیث بطریق زرارة۔

(۲) نسائی: ۱/۲۴۴، طریق سعد بن ہشام

روایت صحابہ کی بھی پیش نہیں کرتے۔ بہر حال حضرت عائشہؓ کے بیان کے مقابلہ میں کسی دوسرے غیر صحابی کے قول کو ترجیح دے کر حضرت عائشہؓ کے قول کی تاویل نہ کی جائے گی، بلکہ خود غیر صحابی کا قول اگر کسی طرح ماؤل ہو سکے تو خیر، ورنہ غیر مسموع۔

۳:- علاوہ بریں علامہ نووی نے حدیث عائشہؓ کے اتنے جزو ثم یصلی رکعتین کی تاویل کرنے کی جو علامت ذکر کی ہے، وہ خود نہایت کمزور و ناقابل التفات ہے، یعنی یہ کہ:

''صحیحین کی مشہور روایات میں ہے کہ آپ کی آخری نماز وتر ہوتی ہے''۔

صحیحین کے لفظ پر ذرا غور کیجئے اور بتایئے کہ کیا آپ کا بھی یہی مسلک ہے کہ جو صحیحین میں ہے وہی مانیں گے، چاہے غیر صحیحین کی دولاکھ صحیح روایات سے اس کے خلاف ہی کیوں نہ ثابت ہو۔

علامہ نووی کے فرمانے کا تو یہ مطلب ہوا کہ وتر کے بعد کوئی نفل مسنون- استحباباً- ہی نہیں، نہ کھڑے ہو کر، نہ بیٹھ کر؛ اور یہ خود آپ کے بھی خلاف ہے، اس لیے کہ آپ کھڑے ہو کر پڑھنے کے تو قائل ہی ہیں۔

میں اس وقت قیام وقعود سے قطع نظر کر کے ایسی روایات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جن سے نفل بعد الوتر کا حکم، اس پر حضور ﷺ کا عمل، اور صحابہؓ کا عمل بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ خود غور کیجئے کہ علامہ نووی نے جو بنیاد تاویل کی قائم کی ہے، کہاں تک صحیح ہے؟۔

۱:- عن ثوبانؓ مرفوعاً إن هذا السفر جهد وثقل فإذا أوتر أحدكم فليركع ركعتين فإن قام من الليل وإلا كانتا له[۱].

۲:- عن أنس أن النبي ﷺ كان يقرأ في الركعتين بعد الوتر بالرحمن والواقعة[۲].

(۱) دارمی، مشکوٰۃ: ۱۰۵، طحاوی: ۲۰۲

(۲) طحاوی: ۱/۲۰۲

۳:- عن أبي أمامة أن النبيَّ ﷺ كان يُصلِّيهما بعدَ الوِترِ وهو جالس يَقْرأ فيهما إذا زلزلت وقل يآ ايهاالكفرون[۱].

۴:- وہ تمام روایات جو حضرت عائشہؓ سے بطرق مختلفہ والفاظ متباینہ مروی ہیں۔

۵:- حضرت ابن عباسؓ کی حدیث بطریق سعید بن جبیر **ولفظه:**

بِتُّ في بيت ميمونة فصلَّى رسول الله ﷺ العشاءَ ثم جاء فصلَّى أربعاً، ثم قام فصلَّى خمس ركعات، ثم صلَّى ركعتين، ثم نام حتى سمعتُ غطيطَه أو خطيطَه، ثم خرج إلى الصلاة.

قال الطحاوي: ففي هذا الحديث أنه صلَّى إحدى عشرة ركعةً منها ركعتان بعد الوتر[۲].

۶:- قال النبي ﷺ لأبي بكر حذر هذا، وذلک حين قال أبو بكر: أما أنا فأصلي ثم أنام على وتر فإذا استيقظتُ صلَّيتُ شفعاً حتى الصباح[۳].

اس روایت میں گو وتر اول رات میں ہے اور نفل آخر رات میں، لیکن پھر بھی **اجعلوا آخر صلوتكم بالليل وتراً** کا معارضہ صحیح ہے۔

۷:- ابن عباس، عائذ بن عمرو، عمار، ابوہریرہ، عائشہ ؓ کے آثار جو طحاوی میں مذکور ہیں، ان سب چیزوں کا قدر مشترک یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں **اجعلوا آخر صلاتكم بالليل وتراً** کے خلاف ہیں، اور ان چیزوں کو سامنے رکھنے کے بعد امام نووی کا وہ جواب دل کو ذرا نہیں لگتا، اور غور کرنے کے بعد یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اکثر روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی آخری نماز یہی دو رکعتیں ہوتی تھیں۔

(۱) طحاوی: ۲۰۳، التلخيص الحبير: ۱۱۷، أحمد وطبرانی، مشکوٰۃ: ۱۰۵

(۲) طحاوی: ۱/۱۶۹

(۳) طحاوی: ۲۰۲، تلخیص بحوالہ بقی بن مخلد وغیرہ

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے قیام لیل کی اکثر روایات حضرت عائشہ، ابن عباس، زید بن خالد الجہنی، ابوامامہ، ام سلمہ، انس وغیرہم -رضی اللہ عنہم- سے منقول ہیں اور ان میں سے حضرت عائشہؓ کی روایت کے اکثر طرق میں اس کا ذکر ہے، اور درحقیقت قیام لیل و وتر کی روایات میں حضرت عائشہؓ کی روایت کو تمام صحابہ کی روایت پر ترجیح ہونی چاہیے، **لکونها أعلم أهل الأرض بوتر رسول الله** ﷺ، لیکن یہاں تو بحمداللہ تدافع وتعارض بھی نہیں ہے کہ ترجیح کا جھگڑا پیش ہو، بلکہ زید بن خالد کی روایت کے علاوہ سب کی روایت میں مطلق تنفل بعد الوتر کا ذکر موجود ہے اور ام سلمہؓ، ابوامامہؓ کی روایت میں جلوس کی بھی تصریح ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ حضرت عائشہؓ کی بعض روایات اور حضرت ابن عباسؓ کی اکثر روایات ان دو رکعتوں کے ذکر سے خالی ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ ذکر نہ ہونے سے نفی تو نہیں لازم آتی، پس وہ روایتیں مثبت روایتوں کے معارض نہیں ہوسکتیں **كما هو مصرح في موضعه.** ہمارے اصول کا بھی مشہور مسئلہ ہے: **لا يُنسب الى الساكت قول،** بہر حال روایاتِ فعل حضور میں تو تعارض کا شبہہ ہو نہیں سکتا، ہاں البتہ حدیث قولی **اجعلوا آخر صلاتكم بالليل وتراً** سے بلاشبہہ بظاہر نظر معارضہ ہوگا، لیکن اس معارضہ کا جواب دینا صرف اسی شخص کا فرض نہیں جو بیٹھ کر پڑھنے کا قائل ہے، بلکہ جو لوگ کھڑے ہوکر پڑھنے کو کہتے ہیں ان کو بھی رفع تعارض کی فکر کرنا ہوگی۔

رفع تعارض کی ایک صورت یہ ہے کہ **اجعلوا آخر صلاتكم الخ** میں صرف ان لوگوں سے خطاب ہے جو اول شب میں وتر پڑھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں اور اخیر شب میں اٹھنا چاہتے ہوں، **قال ابن حجر: وجعلوا الأمر في قوله اجعلوا آخر صلاتكم من الليل وتراً مختصاً بمن أوتر آخر الليل**[1] (فتح الباری: ۲/۳۱۷)

(۱) **قلت: ويؤيد هذا الجوابَ قولُه "آخر صلاتكم بالليل" فإن لفظ صلاة الليل لا يطلق الا على ما عدا رواتب العشائين، وذلك بصليه من يصليه في آخر الليل في معظم السنة، بل=**

دوسری صورت یہ ہے کہ آخر سے آخر حقیقی نہ مراد لیا جائے، بلکہ اضافی مراد لیا جائے، یعنی ہر نماز سے آخر نہیں بلکہ جو صلوٰۃ اللیل کا اکمل مصداق ہے اس کے آخر میں ہونا چاہیے۔ دو رکعتیں بعد والی گو صلوٰۃ اللیل کہلائیں گی، لیکن چونکہ وہ بطور تتمہ اور فذلکہ کے ہیں، اس لیے وتر کا ان سے مقدّم ہو جانا مضر نہیں۔ غرضیکہ معظم صلوٰۃ اللیل سے مؤخر ہونا مطلوب قرار دیا جائے۔

والجواب الثالث ما يستفاد من قول أبی هريرة: لو جئت بثلثة أبعرة فأ نختها ثم جئت ببعيرين فأنختهما، أليس ذلك يكون وتراً؟[1]

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں تطوع بعد الوتر کے لیے ایک خاص باب منعقد کیا ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے بعد امام نووی کے جواب کا ضعف ووہن اور زیادہ واضح ہو جائے گا۔

چونکہ آپ نے اختصار کی بہت تاکید کی ہے، اس لیے قلم کو بہت روک کر لکھتا ہوں اور اس بحث کو یہیں سے چھوڑتا ہوں۔

اب آپ کے اس قول "**صلُّوا كما رأيتموني أصلي** کے لحاظ سے (الی) رکوع کے وقت قیام کیا جائے" کی نسبت مختصراً عرض کرتا ہوں۔ روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو رکعتوں کا ذکر چار طرح ہوا ہے:

۱:- مطلق بلا بیان ہیئت وکیفیت **كما في رواية أنس ورواية ابن عباس من طريق سعيد ورواية ثوبان.**

۲:- مقید بہ ہیئت جلوس، لیکن اس کی تصریح نہیں کہ تمام ارکان بیٹھے بیٹھے ادا ہوئے

=هذا الجواب هو المتعين عندي، لأنه ﷺ **قد أمر من يوتر في أول الليل بأن يركع بعد الوتر ركعتين، ثم ذكر فائدة هذا الأمر أنه إن قام بعد ذلك في آخر الليل فذاك، وإلا كفتا له من قيام الليل، فيظهر بذالك أنَّ هذا الحكم لمن يوتر في أول الليل فلم يبق الا المصلي آخرَ الليل، فيختص الخطاب الذي في اجعلوا الخ به. اغتنم هذا فإنه مما فتح الله به على.**

(۱) معانی الآثار

یا کیا، کما في رواية أم سلمة وأبي وقاص وبعض روايات عائشة كما في طريق سعد بن هشام وغيره.

۳:-جلوس کی تصریح کے ساتھ اس کی بھی تصریح کہ قراءت بیٹھے بیٹھے کرتے رہے، جب تیس چالیس آیتیں رہ گئیں تو کھڑے ہوگئے اور قراءت پوری کر کے کھڑے کھڑے رکوع کیا، كما في طريق علقمة بن وقاص عن عائشة، وطريق يحيى عن أبي سلمة عنه.

۴:-جلوس کی تصریح کے ساتھ اس کی تصریح کہ سارے ارکان بحالت جلوس ادا ہوئے، كما في طريق زرارة عن عائشه عند أبي داؤد.

اب سنئے! پہلی دو قسم کی روایتیں تو کسی روایت سے معارض نہیں ہوسکتیں کہ ہیئت اداء رکعتین سے وہ بالکل ساکت ہیں ولا يُنسب إلى ساكت قول. رہ گئیں تیسری اور چوتھی قسم کی روایتیں، وہ بلاشبہہ متعارض ہیں، لیکن جمع بہت آسان ہے، یعنی یہ کہ دونوں کو دو مختلف وقتوں کی حالت کا بیان مانا جائے۔ ولا يستبعد هذا من تأمل في اختلاف روايات عائشة وابن عباس في أمور شتى وقد جمع العلماء بين تلك الروايات المختلفة المتباينة بما قد جمعتُ آنفاً...... راجع الفتح لابن حجر.

علاوہ بریں تیسرے طبقہ کے معارض حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

فإذا صلى قائماً ركع قائماً وإذا صلى قاعداً ركع قاعداً(۱).

وأخرجه مسلم أيضاً ولفظه إذا قرأ قائماً ركع قائماً وإذا قرأ قاعداً ركع قاعداً(۲).

پس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان دونوں کو مختلف پر حمل کیا جائے، فيجمع

(۱)أبو داؤد في صلاة القاعد

(۲)[مسلم:۱/۲۵۲]

بينهما بأنه كان يفعل كلاً من ذلک بحسب النشاط وعدمه والله أعلم(۱).

وههنا جمع آخر اهتدى إليه ابن خزيمة وهو أنَّ الركوع قاعداً محمولةٌ على ما إذا قرأ جميع القراءة قاعداً، وروايات الركوع قائماً على ما إذا قرأ بعضَها جالساً وبعضها قائماً. ذكره الحافظ في الفتح(۳/۲۳) وهذا الجمع من ابن خزيمة إنما كان بين روايتي عبد الله بن شقيق وهشام ابن عروة، لكنني أجريتُه في طريقَي رواية عائشة.

تیسری ایک بات بھی قابل غور ہے۔ رکوع کی یہ کیفیت (یعنی تیسری صورت) علی العموم آپ کی پوری صلوٰۃ اللیل کی بیان کی جاتی ہے، جس کو آپؐ نے پیرانہ سالی میں ادا کیا ہے، ملاحظہ ہو حدیث عائشہ من طريق هشام بن عروة عن أبيه (بخاری باب قيام النبي بالليل) حدیث عائشہ أيضاً من طريق أبي سلمة بن عبد الرحمن (بخاری، فتح:۲/۳۹۸) وحدیث عائشہ أيضاً من طريق عمرة (عند النسائی:۱/۲۴۴)

پس مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کسی راوی نے غلط فہمی سے اس کیفیت کو پیرانہ سالی کی پوری صلاۃ اللیل کے متعلق، جو حضرت نے بیان کیا تھا، اس کو اس اشتراک کی بنا پر کہ بعد الوتر والی بھی اول الذکر کی طرح بیٹھ کر پڑھی گئی ہے، بعد الوتر والی کے ساتھ چسپاں کر دیا ہو۔ چنانچہ دونوں جگہ اس کیفیت کا بیان طریق ابوسلمہ عن عائشہ ہی میں ملتا ہے، غير أن في أبي داؤد من طريق علقمة بن وقاص أيضاً.

☆......☆......☆

(۱)فتح:۳/۲۲

في التنفُّل بعد الوتر

وتر کے بعد نفل نماز کا بیان

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدنا النبي الأمين وعلى آله وصحبه أجمعين، أمابعد!

آپ کا دوسرا مکرمت نامہ موصول ہوکر موجب مسرت ہوا، شکر ہے کہ دو مسئلے تو صاف ہوگئے، اب صرف یہ شکوک رہے جاتے ہیں:

۱:- مازالت کے عموم کا بطلان **إذا قرأ قائماً ركع قائماً، وإذا قرأ قاعداً ركع قاعداً** سے۔

۲:- اختلاف ہیئاتِ اداءِ رکعتین۔

۳:- **صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم** کے عموم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا داخل نہ ہونا۔

تیسری بحث کو میں نے قصداً نظرانداز کیا تھا، اس لیے کہ آپ نے پہلے خط میں اس کو نہیں چھیڑا تھا، ہاں! پہلی اور دوسری بحث میری تحریر سے پیدا ہوئی ہے، پہلے میں انھیں دونوں کی نسبت عرض کرنے کے بعد دوسری بحث کے متعلق اپنے خیالات کو پیش کروں گا۔

۱:- **إذا قرأقائماً الخ** میں رکعتین بعدالوتر کے قراءت ورکوع کا خصوصیت کے ساتھ بیان نہیں ہے، بلکہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ کا عام دستور بتایا ہے کہ جب صلوۃ اللیل میں آپ قراءت[1] بیٹھ کر کرتے تو رکوع بھی بیٹھ ہی کر کرتے اور جب قراءت

(۱) بلکہ صحیح مسلم کے ایک طریق میں إذا افتتح الصلاة الخ ہے ۱۲ منہ

کھڑے ہوکر کرتے تو رکوع بھی کھڑے ہوکر کرتے۔

جب یہ دستور معلوم ہوگیا تو اب دیکھنا چاہئے کہ بعدالوتر والی میں آپ قراءت بیٹھ کر کرتے تھے یا کھڑے ہوکر، سو اس کو آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ بیٹھ کر کرتے تھے، لہٰذا مذکورہ بالا دستور عام کے رو سے رکوع بھی بیٹھے بیٹھے کرتے ہوں گے۔ پس اس طریق سے مسلم وابوداؤد کی یہ حدیث بھی اُس روایت کے معارض ہوجائے گی، جس کو لے کر آپ فرماتے ہیں کہ رکوع کھڑے ہوکر کرنا چاہئے۔

یہ تو ان سطور کی توضیح تھی جو پہلی تحریر میں اس حدیث کی بابت ہیں، اسی سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اس حدیث سے **مازالت** کے عموم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ یہ حدیث خاص **رکعتين بعد الوتر** سے متعلق نہیں ہے۔ پس اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے کھڑے کھڑے بھی پڑھا ہے **كما زعمتم**، یہ تو جب ثابت ہوتا جب حدیث میں یہ مذکور ہوتا کہ **إذا قرأ في الركعتين بعد الوتر قائماً ركع قائماً وإذ ليس فليس.**

میں حدیث **إذا قرأ قائماً ركع قائماً الخ** کو خصوصیت کے ساتھ رکعتین بعدالوتر کے متعلق اس لیے نہیں مانتا کہ ابوداؤد، مسلم میں پوری حدیث یوں مذکور ہے:

كان يُصلِّي ليلاً طويلاً قائماً وليلاً طويلاً قاعداً وكان إذا قرأ قائماً الخ[1]۔

اب دو صورتیں ہیں: یا تو یہ پوری صلوٰۃ اللیل کا- جس میں وہ دو رکعتیں بھی شامل ہیں- بیان ہوگا، تو معارضہ مذکورہ فی التحریر السابق صحیح ہے۔ اور اگر صرف رکعات قبل الوتر کی یہ کیفیت ہے تو معارضہ مذکورہ صحیح نہیں ہے، لیکن اس کی عدم صحت سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔

یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ پوری صلاۃ اللیل کے متعلق ماننے سے بھی **مازالت** کا عموم باطل نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ **ما زالت** خاص **رکعتین** کے متعلق ہے اور **إذا قرأ الخ** ان

(۱) مسلم: ۱/۲۵۲

سے اعم کے متعلق، لہٰذا اگر کھڑے ہوکر پڑھنا ثابت ہوگا تو اعم کے متعلق ثابت ہوگا اور اعم کی نسبت ثابت ہونے سے اخص کی نسبت ثابت ہونا لازم نہیں آتا۔

۲:- اختلاف ہیئات کے متعلق یہ گذارش ہے کہ یہ تو کسی روایت سے ثابت نہیں ہوتا کہ کل ارکان (یعنی قراءت ورکوع) آپ نے بحالت قیام ادا کیے ہوں، پس اس طرح دونوں رکعتوں کو پڑھنا تو بلاشبہہ خلاف سنت ہے۔ اب ان کو پڑھنے کے دو طریق ہیں، یا تو کل ارکان بحالت قعود؛ یا کچھ قراءت بحالت قعود، اور اس کے بعد کچھ بحالت قیام۔ بہرحال آج کل جس طرح کھڑے ہوکر پڑھتے ہیں اس کا تو ثبوت ہی نہیں تابہ کار فضیلت چہ رسد۔ رہ گئیں پچھلی دو صورتیں وہ دونوں ثابت ہیں، آپ جس کو چاہیے ترجیح دیجیے، میرے نزدیک ان دونوں میں پہلی صورت راجح ہے **لموافقة حديث مسلم وأبي داؤد: أنهما تُصلَّيان خفيفتين وقد صلاهما النبي ﷺ خفيفتين كما في رواية ابن ماجه والصلاة الثانية من الأخيرتين إنما تتيسر عند تطويل القراءة.**

۳:- **صلاة القاعد على النصف من صلاة القائم** میں حضرت رسول خدا ﷺ کی خصوصیت کا دعویٰ میرے نزدیک بہت زیادہ محل نظر ہے۔ اولاً جس لفظ سے خصوصیت پر استدلال کیا جاتا ہے وہ دلالۃ علی التخصیص کے باب میں نص نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک دوسرے معنی کا بھی بالکل مساوی احتمال ہے، اور شراح حدیث نے متعدد مواضع میں تصریح کی ہے کہ احتمال سے تخصیص ثابت نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے افعال میں اصل تشریع ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ **لكني لست كأحد منكم** کا علی التعیین وہی مطلب نہیں جس کو نووی نے بایں الفاظ ذکر کیا ہے:

> **أما قوله ﷺ لست كأحد منكم فهو عند أصحابنا من خصائص النبي ﷺ فجعلت نافلته قاعداً مع القدرة على القيام كنافلته قائماً تشريفاً له**[1].

بلکہ اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ میں تمھاری طرح جواں سال وتوانا نہیں ہوں

(۱) نووی مع مسلم: ۱/۲۵۳

بلکہ پیرانہ سالی کی وجہ سے قویٰ کمزور ہوگئے، اس لیے کھڑے ہوکر پڑھنے سے معذور ہوں اور قاضی عیاض مالکی نے یہی مطلب لکھا ہے:

> **''معناه أن النبي ﷺ لحِقه مشقةٌ من القيام لحطم الناس وللسن فكان أجره تاماً بخلاف غيره ممن لا عذر له**[1].

کہا جاسکتا ہے کہ نووی نے قاضی کے قول کو رد کردیا ہے۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں گے تو معلوم ہوجائے گا کہ نووی نے قاضی کا جو جواب دیا ہے وہ من قبیل المصادرۃ علی المطلوب ہے، نووی نے یہی تو کہا ہے کہ اس صورت میں حضور ﷺ کی تخصیص باقی نہیں رہتی، آپ ہی کہیے کہ قاضی تخصیص کے مدعی کب ہیں، آگے نووی کا یہ فرمانا کہ جب تخصیص نہ رہے گی، تو **لست كأحدكم** کا اطلاق مستحسن نہیں ہوگا۔ اس کی کیا مراد ہے؟ اگر یہ مراد ہے کہ خصوصیت کے علاوہ اور کسی معنی کے لیے اس کا استعمال مناسب نہیں، تو پوچھا جائے گا کہ کیوں؟ آخر دوسرے معنی مراد لینے میں کیا خرابی ہے؟ اور اگر یہ مراد ہے کہ **كأحدكم** مطلق ہے اور جب دوسرا معنی مراد لیا جائے گا تو اس کو غیر معذور کے ساتھ مقید کرنا پڑے گا، پس جب مقید مراد ہے تو اطلاق مستحسن نہیں تھا، تو سوال یہ ہے کہ مطلق سے مقید مراد لینا اسی جگہ غیر مستحسن ہوگیا یا اور بھی کہیں ایسا ہے؟ ابھی اسی واقعہ میں **صلاة الرجل قاعداً نصف الصلاة** وارد ہے، اس کی نسبت نووی فرماتے: **هذا الحديث محمول على صلاة النفل قاعداً مع القدرة على القيام الخ**، آپ ہی فرمایئے کہ حدیث میں نفل کی خصوصیت اور **مع القدرة الخ** کی قید کہاں مذکور ہے[2]۔

اگر قرائن خارجیہ کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو میں عرض کروں گا کہ قاضی نے بھی قرائن خارجیہ کی وجہ سے ایسا کیا ہے جن کو میں آگے ذکر کروں گا۔

(۱) نووی: ۲/۲۵۳

(۲) اس حدیث کا ایک لفظ یہ بھی ہے: ''**صلاة أحدكم وهو قاعد مثل نصف صلوته وهو قائم**'' ظاہر ہے کہ یہاں بھی احد سے مطلق مراد نہیں بلکہ غیر معذور مراد ہے، پس اسی طرح **لست كأحد منكم** سے **لست كأحد** غیر معذور مراد لینے (میں) کوئی قباحت نہیں۔

اگر کوئی یہ شبہہ کرے کہ معذور کے اجر کا تام ہونا تو سب کو معلوم ہے، پس یہ جانتے ہوئے حضرت عبداللہؓ اظہار تعجب کیسے کر سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً اسی میں گفتگو ہے کہ ان کو پہلے سے معلوم تھا، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود تو رسول اللہ ﷺ سے پوری حدیث سنی نہیں تھی[۱] کسی دوسرے صحابی کی زبانی[۲] ان کو صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ **صلاة الرجل قاعداً نصف الصلاة** اور اس حکم میں وہ معذور وغیر معذور کو مساوی سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو بیٹھ کر پڑھتے دیکھ کر سخت متحیر ہوگئے اور سر پر ہاتھ رکھ لیا اور ایک لمحہ کے لیے ان کے دل میں یہ خطرہ بھی نہ گذرا کہ ممکن ہے حضور ﷺ کو کوئی عذر ہو اور تعجب کے ساتھ سوال پر مجبور ہوئے۔ دوسرے یہ کیا ضرور ہے کہ حضور ﷺ کے عذر کا بھی علم ہو، پس ممکن ہے کہ اپنے خیال سے غیر معذور سمجھ کر اظہار تعجب کیا ہو۔

ثانیاً:- خصوصیت کے مدعی حضرات فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قیام وقعود کا ثواب یکساں ہے۔ حالانکہ یہ بالکل خلاف عقل ونقل ہے، روایات سے ثابت ہے کہ جب تک حضور ﷺ کو طاقت ہوتی تھی قیام ترک نہیں فرماتے تھے، ابن حجر فرماتے ہیں:

''أفادت (عائشة) أنه كان يديم القيام وأنه كان لايجلس عما يطيقه من ذلك''[۳].

پس یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قیام کو کوئی افضلیت جلوس پر حاصل نہیں ہے، تو حضور ﷺ کو قیام کا اس درجہ اہتمام کیوں تھا، پھر قیام بھی حضور کا قیام:

عن أبي ذر قال: قام النبي ﷺ بآية حتى الصباح يرددها[۴].

(۱) حدیث مؤطا سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت کی زبانی یہ حدیث سنی تھی لیکن جس موقع پر وہاں آپ نے فرمایا تھا اس سے مساوات معذور وغیر معذور اور زیادہ متبادر ہے ۱۲ منہ
(۲) صحیح مسلم میں ہے حدثت عن رسول الله الخ ۱۲ منہ
(۳) فتح: ۲/۳۹۸
(۴) طحاوی: ۱/۲۰۵، مستدرک: ۱/۲۴۱

عن أم قيس بنت محصن أنَّ رسول الله ﷺ لما أسنَّ وحمَلَ اللَّحمَ اتَّخذ عَموداً في الصلاة يعتمد عليه[۱]۔

ثالثاً:- متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے نفل نمازیں کبھی بلا عذر بیٹھ کر نہیں پڑھیں، ہاں جب پیرانہ سالی کا زمانہ آیا تو بیٹھ کر پڑھنے لگے، چنانچہ صحیح مسلم وابوداؤد میں ہے:

''عن عبد الله بن شقيق قال: قلت لعائشة: هل كان النبي ﷺ يصلي وهو قاعد؟ قالت: نعم، بعد ما حطمه الناس''[۲]۔

اور صحیحین میں ہے:

''ما رأيتُ رسولَ الله ﷺ يقرأ في شيء من صلاة الليل جالساً حتى إذا كبِر قرأ جالساً الخ''[۳].

اور نسائی ومسلم میں حضرت حفصہؓ سے مروی ہے:

''ما رأيتُ رسولَ الله ﷺ صلَّى في سبحته قاعداً حتى كان قبل وفاته بعام فكان يصلي في سبحته قاعداً، الخ''[۴].

اور حضرت عائشہؓ سے مسلم میں ہے:

''لمَّا بدَّن وثقُل كان أكثرُ صلاته جالساً''[۵]۔

الحاصل حضرت عائشہ وحفصہ رضی اللہ عنہما کا اتفاقی بیان ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا سبحہ (نفل) بڑھاپے سے پہلے کبھی بیٹھ کر پڑھتے نہیں دیکھا، اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حضور کو نوافل میں قیام کا کتنا اہتمام تھا؛ دوسری یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا آپ کو نفل پڑھتے دیکھنے کا واقعہ بھی معذوری کے بعد ہی کا ہوگا، اس لیے کہ

(۱) حاکم: ۱/۲۱۵ (۲) مسلم: ۱/۲۵۲
(۳) مسلم: ۱/۲۵۲ عن عائشہ، بخاری: ۲/۳۹۸
(۴) مسلم: ۱/۲۵۳ (۵) مسلم: ۱/۲۵۳

اس سے پہلے بیٹھ کر پڑھتے ہوئے آپ دیکھے نہیں گئے۔ اور یہاں پر یہ جواب بھی چسپاں نہیں ہوسکتا کہ حضرت عائشہؓ وحفصہؓ نے اپنی روایت کی نفی کی ہے، اس لیے کہ اس باب میں ان کی روایت راجح ہے، کیونکہ واقعہ نفل نماز کا ہے اور اعتقاد ہے کہ حضور نے نفل گھر میں پڑھی ہوگی کہ خود آپ کا ارشاد ہے:

''أفضل صلاة المرء في بيته إلا المكتوبة''

اور یوں بھی نوافل میں امہات المؤمنین خصوصاً حضرت عائشہؓ کی روایت پر زیادہ اعتماد ہے۔ بہرحال اگر عبداللہ بن عمروؓ کے دیکھنے کا واقعہ پیرانہ سالی کا واقعہ ہے تو **لستُ كأحد منكم** کا مطلب بالکل صاف ہے۔

اب ذرا حضرت عائشہؓ کی ان روایات کے ساتھ جن میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ پیرانہ سالی کے بعد ہی بیٹھ کر پڑھتے تھے، ابوداؤد والی خود حضرت عائشہؓ کی روایت پر غور کیجئے کہ فرماتی ہیں:

''ثم يقرأ وهو قاعد بأم الكتاب ويركع وهو قاعد ثم يقرأ الثانية فيركع ويسجد وهو قاعد ثم يدعو ماشاء اللهُ أن يدعوَ ثم يُسلِّم وينصرف، فلم تزل تلك صلاة رسول الله ﷺ حتى بدَّن فنقص من التسع ثنتين، فجعلها إلى الست والسبع وركعتين وهو قاعد حتى قُبِض على ذلك ﷺ''۔

دونوں روایتوں کو سامنے رکھنے کے بعد حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرتؐ اور کوئی نفل تو کبرسن سے پہلے کبھی بیٹھ کر نہیں پڑھتے، لیکن وتر کے بعد والی دورکعتیں کبرسن سے پہلے بھی برابر بیٹھ کر پڑھتے رہے اور جب کبرسن کی وجہ سے دورکعتیں تہجد کی کم کیں تو بھی ان دونوں کو باقی رکھ کر قیام والی دو کم کیں، اور ان کو بدستور سابق بیٹھ کر ہی پڑھتے رہے، یہاں تک کہ دنیا سے تشریف لے جانے کے وقت تک برابر یہی معمول تھا۔

میں نے اپنے خیالات بہت صفائی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کردیے۔ اگر

کوئی بات پسند آجائے تو دعا کیجئے گا، اور اگر اختلاف رائے ہو تو اس کا مطلق ملال نہیں ع

فللناس فيما يعشقون مذاهب

یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر شخص میرے خیال کا پابند ہوجائے۔ اس تمام ترگزارش کا یہ مطلب ہے کہ میرے اختیار کی یہ وجوہ ہیں۔

ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی
صدر مدرس مفتاح العلوم (مئو)
۷؍شوال ۴۹ھ

☆......☆......☆

إنَّ الإسنادَ مِنَ الدِّينِ

باب بیان إنَّ الإسنادَ مِنَ الدین:

یہ ایک باب کا عنوان ہے جس کو امام نووی نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں ایک جگہ قائم کیا ہے، اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حدیثوں کی سندیں بیان کرنا اور ان سندوں کے صحت وسقم کا علم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم دینا، یہ سب امور دین سے ہیں۔

اس کے ماتحت منجملہ اور مضامین کے ایک اہم مضمون حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی زبان سے یہ بیان ہوا ہے:

الإسناد من الدين، ولولا الإسناد لقال من شاء ما شاء[1]. اسناد دین کی ایک چیز ہے، اگر اسناد نہ ہوتی تو جو آدمی بھی جو کچھ کہنا چاہتا کہہ دیتا۔

یعنی اسناد آنحضرت ﷺ یا صحابہ کرامؓ یا ائمہ علم کی طرف کسی غلط بات کو منسوب کرنے سے مانع ہے، اور اس کی وجہ سے دین کے اندر تلبیس اور حق کے اندر باطل کی ملاوٹ کا دروازہ بند ہوگیا، اس لیے کہ اب جو شخص بھی یہ کہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے فلاں بات کہی ہے، تو فوراً سوال ہوگا کہ تم کو یہ کس سے معلوم ہوا؟ اور اس کو کس سے معلوم ہوا؟ پس اگر اس نے سلسلہ وار سب کی نشاندہی کر دی تو ایک واقف کار عالم فوراً سمجھ لے گا کہ یہ نسبت صحیح ہے یا غلط، وہ جان لے گا کہ اس سلسلہ کا وجود ہے یا نہیں، اگر ہے تو اس سلسلہ کا ہر ہر آدمی اعتبار کے قابل ہے یا نہیں، اگر اعتبار کے قابل ہے تو بیان کرنے والے کا بیان اور آنحضرت ﷺ کی طرف اس بات کی نسبت درست ہے، اور اگر اس سلسلہ کا وجود ہی نہیں

(۱) مقدمہ مسلم: ص۱۲

ہے، یا وجود ہے مگر اس سلسلہ کا کوئی ایک آدمی یا دو یا سب نامعتبر ہیں، تو یہ بیان اور نسبت صحیح نہیں ہے۔

اسی بات کو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اسی روایت کے اخیر میں یوں بیان کیا ہے کہ **فإذا قيل له من حدثك؟ بقي.** یعنی چونکہ اسناد ضروری ہے اس لیے اگر کوئی شخص کوئی بات بے سند بیان کرے اور اس سے کہا جائے کہ تم سے یہ کس نے بیان کیا؟ تو منھ تاکتا رہ جائے گا۔ یعنی اس کی تلبیس کارگر نہ ہوگی۔

اسناد کا ضروری ہونا اور اس کا امور دین سے ہونا آپ معلوم کر چکے، تو اب سنئے کہ اسناد کا دارومدار یا اسناد کا قوام وہ اسمائے رجال یعنی راویوں کے نام ہیں جو اسناد میں سلسلہ وار بیان ہوتے ہیں، پس اسناد اور علم اسناد کے دین ہونے سے اسمائے رجال کی معرفت اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور ان کی جانچ پڑتال کرنا بھی لازمی طور پر امور دین سے ہوا۔

اور واشگاف سننا چاہتے ہوں تو ایک واقعہ سنئے:

امام مسلمؒ نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ان سے ایک شخص نے کہا:

> **يا أبا عبد الرحمن! الحديث الذي جاء: إنَّ مِنَ البِرِّ بَعْدَ البِرِّ أنْ تُصَلِّيَ لأبَوَيْكَ مَعَ صَلاتِكَ وَتَصُومَ لَهُمَا مَعَ صَوْمِكَ** (یعنی) حضرت! وہ حدیث جو آئی ہے کہ ایک حسن سلوک کے بعد دوسرا حسن سلوک ماں باپ کے ساتھ یہ ہے کہ تم ان کے لیے بھی اپنی نماز کے ساتھ نماز پڑھو اور ان کے لیے بھی اپنے روزے کے ساتھ روزہ رکھو، یعنی ان کی طرف سے تم نماز روزہ کر دیا کرو۔ ابن مبارک نے پوچھا یہ کس سے مروی ہے؟ یعنی کس نے اس کو روایت کیا ہے؟ سائل نے جواب دیا: یہ شہاب بن خراش کی حدیثوں میں سے ہے۔ ابن المبارکؒ نے کہا (شہاب تو معتبر آدمی ہیں مگر وہ خود

تو آنحضرت ﷺ سے سن نہیں سکتے، ان کا زمانہ حضرت کے بہت بعد ہے، تو)
انھوں نے کس سے سنا؟ سائل نے کہا، حجاج بن دینار سے، ابن المبارکؒ نے کہا
وہ بھی معتبر آدمی ہیں، مگر انھوں نے کس سے سنا؟ سائل نے کہا کہ انھوں نے
فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات بیان فرمائی ہے، یعنی انھوں نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اپنے درمیان کوئی واسطہ ذکر نہیں کیا، تو ابن المبارک
نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ اور حجاج کے درمیان دور دست بہت ہی لمبی چوڑی
ہلاکت خیز مسافت ہے، اتنی طویل کہ ان کو طے کرتے کرتے اونٹنیاں ہلاک
ہو جائیں گی، یعنی آنحضرت ﷺ تک حجاج خود تو پہنچ نہیں سکتے، وہ نصف صدی
بعد پیدا ہوئے ہیں، پھر انھوں نے حضرت سے کیسے سنا؟ اور اگر ان کا یہ مطلب
ہے کہ مجھ سے ایک اور شخص نے بیان کیا ہے تو پھر اس کا نام لینا چاہئے کہ وہ کون
ہے، اگر وہ صحابی ہے تو ٹھیک ہے اور اگر وہ صحابی نہیں ہے تو اس کو بھی بتانا پڑے گا
کہ اس نے کس سے سنا، اس کا نام ٹھکانا بتانا پڑے گا، بتانے سے اگر وہ صحابی
ثابت ہوگا تو اسناد متصل ہوگی اور قبول کی جائے گی، اور اگر وہ صحابی نہ ہوگا، تو
حدیث مرسل ہوگی، جس کے قبول کرنے میں اختلاف ہے۔

اس واقعہ سے کتنا واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ اسناد کے صحت وسقم کو معلوم کرنے کے
لیے رجال کی معرفت از حد ضروری ہے، جس کے بدون اسناد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا
سکتا اور نہ اس کے صحت وسقم کا اندازہ لگایا جا سکتا۔

اس لیے اللہ رب العزت نے اسناد سے فائدہ اٹھانے کے لیے اور دین کے اس
شعبہ کو قائم اور کارآمد بنانے کے لیے شروع سے اپنے بندوں میں سے کچھ باصلاحیت
بندوں کو اس کام کے لیے چن لیا، اور ان کو رجال کی چھان بین اور ان کے احوال کی معرفت
حاصل کرنے کی توفیق بخشی، ابتدا میں تو اس فن کی تعلیم وتلقین اور علم اسماء الرجال کی فنی تربیت
صرف زبانی تھی، بعد میں اس فن کے ماہرین نے اس فن کو مدوّن فرمایا۔

اس فن میں قدیم ترین تصنیفات جو دستیاب ہیں، ان میں امام احمدؒ (المتوفی
۲۴۱ھ) کی کتاب **العلل ومعرفة الرجال** اور یحییٰ بن معین امام الجرح والتعدیل
(المتوفی ۲۲۳ھ) کے جوابات جو انھوں نے الدوری،...... اور عثمان بن سعید الدارمی
(المتوفی ۲۸۰ھ) کے سوال کرنے پر دیے ہیں، اور عجلی (المتوفی ۲۶۱ھ) کی کتاب تاریخ
الثقات ہے۔

ان کے بعد پھر بعض ائمہ فن نے صرف ثقہ راویوں کو کتاب الثقات کے نام سے
اکٹھا کیا، جیسے ابن حبان (المتوفی ۳۵۴ھ) اور ابن شاہین (المتوفی ۳۸۵ھ) نے کتاب
الثقات تصنیف کی۔

اور بعض ائمہ نے صرف ضعفا کو تاکا اور صرف ان کے نام جمع کیے، جیسے ابن حبان
کی کتاب **الضعفاء والمجروحین** اور عقیلی (المتوفی ۳۲۲ھ) کی کتاب **الضعفاء** اور
دارقطنی (المتوفی ۳۸۵ھ) کی کتاب **الضعفاء** اور ابن عدی (المتوفی ۳۶۵ھ) کی
الكامل في الضعفاء.

اور کسی نے دونوں کو سامنے رکھ کر شرح وبسط کے ساتھ جہاں تک ہوسکا ثقات اور
ضعفاء دونوں کا استیعاب کیا، جیسے عبدالرحمٰن بن ابی حاتم (المتوفی ۳۲۷ھ) نے کتاب
الجرح والتعدیل لکھی۔

اور اس کام کو ان سے پہلے امام بخاری (المتوفی ۲۵۶ھ) نے بڑی تحقیق اور بڑی
جستجو اور ایک حد تک استیعاب کے ساتھ کیا ہے۔ ان کا شاہکار آج **التاریخ الکبیر** کے نام
سے علمی کتب خانوں کی زینت بنا ہوا ہے۔

ان ناقدین رجال کے علاوہ علی بن المدینی، عمرو بن علی فلاس، ابوخیثمہ اور ان کے
تلامذہ مثلاً ابوزرعہ، ابوحاتم اور مسلم وجوزجانی، اور ان کے شاگرد نسائی، ابن خزیمہ، ترمذی اور
دولابی وغیرہ نے بھی رجال ورواۃ حدیث پر کلام کیا ہے، اور اس فن میں کتابیں لکھی ہیں۔

ان میں سے ابن المدینی کی کتاب **العلل** اور جوزجانی کی **أحوال الرجال** اور

نسائی کی کتاب **الضعفاء** اور دولابی کی کتاب **الأسماء والکنی** آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں، اور اہل علم کو ان سے استفادہ کے مواقع میسر ہیں؛ لیکن ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں عام طور پر صحاح ستہ اور مسند احمد کی سند لینے اور ان کے درس و مذاکرہ کا رواج اور اہتمام ہے، اس لیے ان کے رجال پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں عام طور پر وہی متداول ہیں، صحاح ستہ کے رجال پر جس امام نے بالتخصیص کتاب تصنیف کی، اور ان کے تمام رجال کو مکمل طور پر ایک کتاب میں جمع کیا، وہ حافظ عبدالغنی (المتوفی ٦٠٠ھ) ہیں، ان کی کتاب کا نام **الکمال** ہے، حافظ ابوالحجاج مزی دمشقی نے اس کتاب کو مہذب کر کے اضافہ کے ساتھ لکھا اور اس کا نام **تہذیب الکمال** رکھا، یہ کتاب ابھی تین چار سال پہلے تک دستیاب نہیں تھی، ہند و بیرون ہند کے مختلف کتب خانوں میں اکثر اس کے ناقص نسخے اور شاذ و نادر کامل نسخے پائے جاتے تھے، چند سال پہلے موسسۃ الرسالہ بیروت نے بہت تحقیق کے ساتھ اس کو شائع کرنا شروع کیا، میرے پاس اس کی چند ابتدائی جلدیں موجود ہیں۔ بہرحال تہذیب الکمال کے عام طور پر دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً ایک صدی سے حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب سے کام لیا جاتا تھا، جس کا نام **تہذیب التہذیب** ہے۔ اور جو پہلی بار دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ١٣٢٥ھ میں شائع ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر کے علاوہ دوسرے حفاظ حدیث اور ناقدین رجال نے بھی **تہذیب الکمال** پر کام کیا ہے، مثلاً ذہبی نے **تذھیب التہذیب** لکھی، حافظ مغلطائے نے بھی ایک کتاب لکھی ہے، جس کے کچھ اجزاء قلمی بعض کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

مسند احمدؒ کے رجال پر حافظ حسینی نے کتاب لکھی تھی، اس کو سامنے رکھ کر حافظ ابن حجر نے **تعجیل المنفعۃ** تصنیف کی، یہ کتاب بھی دائرۃ المعارف حیدرآباد میں پہلی بار ١٣٢٤ھ میں طبع ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب **تہذیب التہذیب** کا ایک نہایت مفید اختصار **تقریب التہذیب** کے نام سے تصنیف کیا، اس کتاب کو بھی سب سے پہلے منصۂ شہود پر

لانے کا شرف ہندوستان کو حاصل ہے، میری دانست میں سب سے پہلے یہ کتاب ١٢٧٢ھ میں مطبع احمدی میرٹھ سے شائع ہوئی۔

اب رہے مسند احمد اور صحاح ستہ سے باہر کے رجال تو کچھ دنوں تک **میزان الاعتدال** اور اس کے بعد **لسان المیزان** کے سوا کوئی اور کتاب عام طور پر اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کی دسترس سے باہر تھی، مجبوراً انھیں چشموں سے پیاس بجھانے کی کوشش کی جاتی تھی، ''میزان الاعتدال'' ہندوستان میں ـــھ میں اور مصر میں ١٣٢٥ھ میں طبع ہوئی۔ اور ''لسان المیزان'' ١٣٣٠ھ میں حیدرآباد سے شائع ہوئی، لیکن چونکہ **لسان المیزان**، **میزان الاعتدال** کا اختصار اور ایک حیثیت سے اس کا تتمہ ہے، اور **میزان الاعتدال** حافل کو بنیاد بنا کر تصنیف کی گئی ہے، جو ''کامل'' کا تکملہ اور ذیل ہے، اور کامل صرف ضعیف و مجروح راویوں کے ناموں کا گنجینہ ہے، اس لیے **میزان الاعتدال** اور **لسان المیزان** سے ثقہ راویوں کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا، لیکن جب ١٣٦١ھ میں امام بخاری کی تاریخ کبیر منظر عام پر آئی، اور اس کے دس برس بعد ١٣٧١ھ میں ابن ابی حاتم کی کتاب **الجرح والتعدیل** چھپ کر شائع ہوئی، تو ایک حد تک یہ خلا پر ہوا، اور جب ١٤٠٣ھ میں ابن حبان کی کتاب **الثقات** دائرۃ المعارف حیدرآباد سے نو جلدوں میں شائع ہوئی، تو اس کمی کا احساس کم سے کم تر ہو گیا، پھر ١٤٠٥ھ میں امام عجلی کی کتاب **تاریخ الثقات** کے شائع ہونے سے ثقات کے مراجع میں ایک اور قابل قدر اضافہ ہوا۔

اسماء الرجال سے متعلق تصنیفات کے اس طویل سلسلہ پر نظر ڈالنے سے بہت اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مقبول اور غیر مقبول احادیث کو ایک دوسرے سے ممتاز بنانے کا ائمہ حدیث کو کتنا اہتمام تھا، اور اس اہتمام کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسماء الرجال کی معرفت کتنا اہم دینی فریضہ ہے۔

☆......☆......☆

پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث

صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الخندق میں ایک طویل حدیث بروایت حضرت جابرؓ مروی ہے، جس کی اسناد یوں ہے: حدثنا خلاد بن يحيى، حدثنا عبد الواحد بن أيمن، عن أبيه قال: أتيت جابراً رضى الله عنه فقال الخ. اس حدیث کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

ثم قام (رسول الله ﷺ) وبطنُه معصوبٌ بِحَجَرٍ ولَبِثْنا ثلاثة أيام لا نذوق ذواقاً الخ.

پھر رسول اللہ ﷺ کھڑے [ہوئے] اس حال میں کہ ان کا شکم مبارک پتھر سے بندھا ہوا تھا اور ہم نے تین دین سے کوئی چیز نہیں چکھی تھی۔

یہ حدیث یونس بن بکیر کے مغازی میں بھی ہے، اس کے الفاظ حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق یہ ہیں:

وبطنُه مَعْصوبٌ بحجرٍ مِنَ الجوع.

یعنی بھوک کی وجہ [سے] آپ ﷺ کا پیٹ پتھر سے بندھا ہوا ہے۔

نیز یہ حدیث مسند احمد ص...... میں بھی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

أصابهم جَهْدٌ شديدٌ حتى رَبَطَ النبيُّ ﷺ علَى بَطنِه حجراً من الجوع.

یعنی ان حضرات کو سخت مشقت لاحق ہوئی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا۔

پتھر باندھنے کا ذکر صرف اسی ایک روایت میں نہیں ہے، بلکہ دوسری روایتوں میں بھی ہے، ازانجملہ ایک حدیث ترمذی میں بروایت حضرت ابوطلحہؓ مروی ہے، اس کے الفاظ

یہ ہیں:

شكونا إلى رسول الله ﷺ الجوعَ، فرفعنا عن بطوننا عن حجر حجر، فرفع رسول الله ﷺ عن بطنه عن حجرين[1].

یعنی ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور پیٹ سے کپڑا ہٹا کر ایک ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا، تو آنحضرت ﷺ نے اپنے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے دکھائے۔

اورازاں جملہ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت انسؓ سے مروی ہے:

قال: جئتُ رسولَ الله ﷺ يوماً، فوَجَدتُه جالساً وقد عَصَبَ بطنَه بِعِصابةٍ، فقلت لبعض أصحابه: لِمَ عَصَبَ رسول الله ﷺ بطنَه؟ فقالوا: من الجوع[2].

یعنی حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا، تو آپ ﷺ کو اس حال میں بیٹھا ہوا پایا کہ آپ ﷺ پیٹ پر پٹی باندھے ہوئے تھے، میں نے بعض اصحاب سے اس کا سبب پوچھا؟ تو انھوں نے بتایا کہ بھوک کی وجہ سے۔

اوراسی حدیث میں ابونعیم کی روایت میں رَبَطَ علی بطنِه حجراً من الجوع وارد ہوا ہے[3]۔

اورازانجملہ صحیح بخاری برہامش فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۲۳ وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان اپنی نسبت ہے:

وإنْ كنتُ لأَشُدُّ الحجرَ على بطني من الجوع.

یعنی بھوک کی وجہ سے میں اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا تھا۔

اورازانجملہ ترغیب وترہیب منذری برہامش مشکوٰۃ ص ۵۰۲ میں امام ابن سیرین کا

(۱) مشکوٰۃ باب فضل الفقراء وماكان من عيش النبی ﷺ ص: ۴۴۰

(۲) فتح الباری: ۶/۳۸۰ (۳) ایضاً: ۶/۳۸۰

قول منقول ہے:

إنْ كانَ الرجلُ من أصحاب النبي ﷺ يأتي عليه ثلاثة أيام لا يجد شيئاً يأكله، فيأخذ الجلدة فيَشويُها، فيأكلُها، فإذا لم يجدْ شيئاً أخذَ حجراً، فشَدَّ صَلْبَه[۱].

یعنی بعض بعض صحابیوں کو تین تین دن یوں گذر جاتے تھے کہ کچھ کھانے کو نہیں ملتا تھا، پھر اگر کوئی چمڑے کا ٹکڑا ہی مل گیا تو اسی کو بھون کر کھا لیتے، اور اگر وہ بھی نہ ملا تو کوئی پتھر لے کر (پیٹ پر باندھ لیتے اور اس طرح) پیٹھ مضبوط کر لیتے۔

اور از انجملہ مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے:

وإنه ليأتي على أحدنا الأيام ما يجد طعاماً يُقيمُ به صلبَه حتى إنَّ أحدَنا ليأخذ الحجرَ فيشُدُّ به على أخمص بطنه ثم يشده بثوبه ليقيم صلبه[۲].

یعنی ہم [میں] سے کسی کسی کو کئی کئی دن گذر جاتے کہ اتنا کھانے کو بھی نہیں ملتا کہ اس سے پیٹھ سیدھی کر سکے، یہاں تک کہ بعض لوگ پتھر پیٹ پر رکھ کر پھر کپڑے سے باندھ لیتے تھے تاکہ پیٹھ سیدھی رکھ سکیں۔

اور از انجملہ حضرت مغیرہؓ کی حدیث ہے: فإذا أنا معصوب الصدر (نہایہ ابن الاثیر:۳/۱۱۳) ابن الاثیر نے اسی مقام پر لکھا ہے:

وكان من عادتهم إذا جاع أحدُهم أن يَشُدَّ جوفَه بعِصابةٍ وربما جَعَل تحتَها حجراً.

عرب کی عادت تھی کہ جب بھوکے ہوتے، تو پیٹ کو پٹی سے باندھ لیتے اور بسا اوقات پٹی کے نیچے پتھر رکھ کر باندھتے تھے۔

اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے:

(۱) از: كتاب الجوع لابن أبي الدنيا بإسناد جيد

(۲) ترغیب وترہیب برحاشیہ مشکوٰۃ:۵۰۲، وفتح الباری:۱۱/۲۲۳

وفائدة ربْطِ الحجرِ على البطن أنها تَضمُر من الجوعِ فيُخشَى على انحناء الصُّلْبِ بواسطة ذلك، فإذا وَضَعَ فوقَها الحَجَرَ وشدَّ عليها العِصَابةَ استقامَ الظَّهر[۱].

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

قال العلماء: فائدةُ شدِّ الحجَرِ المساعدةُ على الاعتدال والانتصاب، أو المنعُ من كثرة التحلُّل من الغذاء الذي في البطن، لكون الحجر بقدر البطن، فيكون الضُّعفُ أقلَّ، أو لتقليل حرارة الجُوع ببرد الحَجَر.

اور اسی مقام پر خطابی کا قول نقل کرتے ہیں:

ومن أقام بالحجاز وعرَف عادتَهم، عرَف أنَّ الحجرَ واحدُ الحجارةِ، وذلك أنَّ المجاعةَ تعتريهم كثيراً، فإذا خوَى بطنُه، لم يُمكِن معه الانتصاب، فيعمِدُ حينئذٍ إلى صفائحَ رِقاقٍ في طُول الكفِّ وأكبر، فيَربِطُها على بطنه، وتُشَدُّ بعِصابةٍ فوقَها فتعتَدِلُ قامتُه بعضَ الاعتدال[۲].

تیسری جگہ لکھتے ہیں:

وأما قوله: وما يُغني الحجرُ من الجوع؟ فجوابه: أنه يُقيمُ الصُّلبَ لأنَّ البطن إذا خلا ربما ضعُف صاحبه عن القيام لانثناء بطنه عليه، فإذا ربَطَ عليه الحجَرَ اشتدَّ وقوِي صاحبه على القيام، حتى قال بعض من وقع ذلك له: كنتُ أظُنُّ الرِّجلَينِ يحمِلانِ البَطنَ فإذا البطنُ يحمِلُ الرَّجلَين[۳].

ان سب عبارات کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱) فتح الباری:۷/۲۷۸ (۲) ایضاً:۱۱/۲۲۳ (۳) ایضاً:۴/۱۴۹

۱- سخت بھوک کی حالت میں پیٹ پر پتھر باندھنا قدیم سے عرب کی عادت تھی۔

۲- اور یہ عادت حجاز میں خطابی المتوفی ــــــــہ[1] کے زمانہ تک جاری تھی۔

۳- اور اس کا فائدہ یہ تھا کہ کئی دن کے فاقہ سے جب پیٹ بالکل خالی ہوجاتا ہے، تو پیٹھ جھکنے لگتی ہے اور سیدھا کھڑا ہونا دشوار ہوجاتا ہے، ایسی حالت میں پیٹ کے طول وعرض کے برابر پتلے پتلے پتھر لے کر پیٹ پر رکھنے اور ان کو کسی کپڑے سے کس کر باندھ دینے سے پیٹ کا حصہ سخت ہوجاتا ہے اور پیٹھ سیدھی ہوجاتی ہے۔

۴- یہ فائدہ محض قیاسی اور خیالی نہیں ہے، بلکہ تجربہ اس کا شاہد ہے، چنانچہ بعض تجربہ کاروں کا بیان ہے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ پیٹ کو پیر اٹھائے ہوئے ہیں، لیکن اس تجربہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ پیروں میں کھڑے ہونے کی صلاحیت پیٹ کی بدولت ہے۔

☆......☆......☆

(۱) مسودہ میں سنہ کے بعد بیاض ہے، علامہ خطابی کا سنہ وفات ۳۸۸ھ ہے، آپ کا نام حمد بن محمد بن ابراہیم تھا، ابو سلیمان کنیت تھی، حضرت عمرؓ بن الخطاب کے بھائی زید بن خطاب کی نسل سے تھے۔ بہت بڑے فقیہ ومحدث تھے۔

دو متبرک اجازت نامے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علمی خانوادہ میں شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی - رحمہما اللہ - کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ولی اللہی علوم ومعارف کے خزانہ کو شاہ عبدالعزیز کے بعد جس نے وقف عام کیا، وہ شاہ محمد اسحٰق ہی تھے، اور ان کے بعد یہ دولت جس کو نصیب ہوئی وہ شاہ عبدالغنی تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند - جن کے فیض سے نشر واشاعت حدیث کے آج بیسیوں ادارے قائم ہوچکے ہیں - حضرت شاہ عبدالغنی ہی کے خرمن علم کے خوشہ چیں تھے۔

آج کل خوش قسمتی سے مجھ کو دو اجازت نامے دستیاب ہوئے، جن میں سے ایک حضرت شاہ محمد اسحٰق کے دست مبارک کا ہے، جس کو انھوں نے مولانا محمد طاہر کے لیے لکھا ہے، اور دوسرا حضرت شاہ عبدالغنی کے قلم کا ہے جو مولانا عبداللہ کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ ان ہی اجازت ناموں کو میں اہل علم کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مجازلہ حضرات کا مختصر سا تعارف بھی کرادیا جائے۔

مولانا محمد طاہر

اعظم گڑھ کے ضلع میں مئو سے ۵؍میل پر شمال مغرب جانب، ٹونس کے شمالی کنارہ پر پورۂ شیخ معروف نام کی ایک چھوٹی سی بستی ہے، مولانا محمد طاہر یہیں کے رہنے والے تھے۔ مولانا سخاوت علی جونپوری سے علوم ظاہری، اور مولانا کرامت علی جونپوری سے فیوض باطنی حاصل کیے، مولانا کرامت علی نے بیعت لینے کی اجازت بھی ان کو عطا فرمائی

تھی، مطبوعہ اجازت نامہ جس میں مولوی محمد طاہر صاحب کا نام مولانا کرامت علی نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا تھا، حقیر کی نظر سے گذرا ہے۔

حسب ذیل قلمی کتابیں میں نے آپ کے کتب خانہ میں دیکھی ہیں:

صحیح بخاری، صحیح مسلم، مجالس الابرار مکتوبہ ۱۲۶۶ھ، جامع صغیر سیوطی، المنار للنسفی خود مولانا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت خوش خط، مسند امام اعظم تا کتاب الحج، اشعۃ اللمعات جلد سوم، صلوۃ مسعودی، موطا، حصن حصین، رسالہ في بيان الخطاب بأغثني يا رسول الله واتخاذ الأطعمة في المواليد والأعراس للشيخ عابد السندي، اور القول في سماع الأموات.

ایک دوسرے کتب خانہ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی فتح المنان في تائيد مذهب النعمان کا نسخہ میں نے دیکھا ہے، جو مولانا محمد طاہر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا سال کتابت مولانا نے اپنے قلم سے ۱۲۶۱ھ لکھا ہے۔

مولانا محمد طاہر ان علمی کمالات کے علاوہ جسمانی طاقت میں بھی شہرۂ آفاق تھے، اور اس سلسلہ میں ان کے ایسے ایسے واقعات مشہور ہیں، جن کو لوگ بہ مشکل باور کریں گے۔

۱۲۶۰ھ میں آپ نے حجاز کا سفر کیا ہے، اور اسی سفر میں حضرت مولانا محمد اسحاق سے جو اس وقت ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے تھے[1]، حدیث کی کچھ کتابیں پڑھی ہیں، اور حضرت مولانا نے ان کو سند لکھ کر عطا فرمائی ہے۔

نقل سند

بسم الله الرحمن الرحيم. الحمد لله رب العلمين، والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وآله وصحبه أجمعين، أمابعد! فيقول خادم علماء الآفاق محمد إسحاق عفا الله عنه وتجاوز عن السيئات: إنَّ

(۱) توفي رحمه الله سنة ١٢٦٢هـ (ابوالمآثر عفا اللہ عنہ)

المولوي محمد طاهر طهَّره الله (في) الباطن والظاهر، قد قرأ عليّ الأحاديث النبويةَ على صاحبها ألفُ ألفِ تحيةٍ وصلوةٍ زكيةٍ، فعليه أن يشتغل بقرأة علم الحديث وتعليمه بشروطه المعتبرة عند أهله، وأوصي له بتقوى الله وسنة رسول الله وأن يُداوِمَ على طاعة الله وذكرِه في الخلوات والجلوات، وأن يَجتَنبَ عن المعاصي والبِدعات، وآخر دعوانا أن الحمد لله.

حرّره الثاني من شهر الجمادى الأولى سنة ستين بعد الألف والمأتين سنة ١٢٦٠هـ في مكة المعظمة كرّمها الله.

مولانا محمد طاہر کی وفات ۱۲۹۶ھ میں ہوئی۔

....

مولانا عبداللہ

مئو ضلع اعظم گڈھ کے مشہور و جید علماء میں سے تھے، مدرسہ غفاریہ رسڑا ضلع بلیا میں مولانا تراب علی لکھنوی - المتوفی ۱۲۸۱ھ - اور مولانا عبدالحلیم لکھنوی - المتوفی ۱۲۸۵ھ - سے (غالباً جون پور میں) کتب درسیہ کی تحصیل کی، صحیح تاریخ تو معلوم نہیں، لیکن ۱۲۷۷ھ سے پہلے ہی فارغ ہو کر اعظم گڈھ میں منشی صفدر حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر کے مکان پر غالباً تعلیمی سلسلہ سے مقیم تھے، جیسا کہ مولانا عبدالحلیم کے ایک مکتوب (بنام مولانا عبداللہ) سے ظاہر ہوتا ہے، مولانا ایک ماہر طبیب تھے، منطق فلسفہ میں بھی بڑا دخل تھا، لیکن اسی کے ساتھ فقہ وحدیث سے انتہائی شغف تھا، منطق میں ایک رسالہ ”عرفان العرفان“ آپ کی یادگار ہے، جو مولانا عبدالحلیم کے رسالہ ”العرفان“ کی شرح ہے۔

طب میں آپ کا بڑا شہرہ تھا، حدیث وفقہ میں بھی مہارت حاصل تھی، اعلیٰ درجہ کے خوش نویس بھی تھے، کتابوں کا کافی ذخیرہ آپ کے کتب خانہ میں تھا، مگر اب بہت تھوڑی کتابیں رہ گئی ہیں، مولانا عبدالحلیم نے عرفان العرفان کا ذکر اپنے مکتوب میں کیا ہے، اور

مولانا عبدالحی نے حاشیہ میرزاہد ملا جلال میں ایک جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

مولانا عبداللہ کتابوں کے بڑے شائق تھے، آپ کی اولاد میں کوئی اہل علم نہیں ہے، اس لیے بہتیری کتابیں ضائع ہوگئیں، تاہم آپ کے کتب خانہ میں اب بھی بعض کتابیں عمدہ موجود ہیں، جن میں سے حسب ذیل کتابیں بعض حیثیات سے قابل ذکر ہیں:

۱- **تفسیر کشاف** قلمی نصف اول: شروع کے چند ورق غائب ہیں کتابت صاف ہے۔

۲- **شمائل ترمذی محشی** قلمی: چھوٹی تقطیع پر نہایت خوشخط ہے۔

۳-**أشعة اللمعات** ترجمہ فارسی مشکوٰۃ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی: ربع ثالث وربع رابع، قلمی، خط پاکیزہ۔

۴-**شرح ملا علي القاري** برموطا امام محمد تا **باب القراءة في صلوٰة العيد قلمي.**

۵-تذکرۃ الاولیاء شیخ فریدالدین عطارؒ: قلمی خوشخط

۶-**قصر الآمال بذكر حال المآل** ازمولوی رفیع الدین مرادآبادی قلمی: احوال بعدالموت میں۔

۷- **قاموس اللغة للفيروز آبادي**، قلمی: کتابت ۱۰۸۴ھ

۸-**سعديه برقطبى** قلمی: کتابت ۱۱۰۰ھ

۹-**شرح قوشجيه** از مصلح الدین لاری

۱۰-**مضمار التحقيق شرح مسلم العلوم** قلمی از نظام الدین محمد عابد

مولانا عبداللہ نے کئی برس تک نوانگر ضلع بلیا میں درس دیا، اخیر میں اپنے مکان پر مطب کرتے تھے۔

۱۲۸۶ھ میں آپ نے سفر حج کیا، اوراسی سال مدینہ منورہ میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں اوائل بخاری وترمذی پڑھ کر آپ سے علم حدیث کی سند حاصل کی۔

نقل سند

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله الذى هدى من شاء من عباده لطلب السنة، والصلوة والسلام على من أخبرنا وحدثنا عن شريعته، فيا له علينا من اللطف والمنة، فالصلوة عليه وعلى اٰله الهادين إلى طريق الجنة، أما بعد! فقد وفد عليَّ في المدينة المنورة، الفاضلُ الشيخ عبد الله، وقرَأَ عليَّ طَرَفاً من أوائل صحيح البخاري وكذلک من أول جامع الحافظ أبي عيسى الترمذي، وطلَبَ مني الإجازةَ للأمهات الستة وغيرِها من كُتُبِ الحديث والتفسير، فأجزتُ له بما أجاز به والدي ومرشدي الشيخ أبو سعيد الدهلوي، وسيدي الشيخ محمد إسحاق، ومولانا الشيخ عابد السندي[1] والشيخ إسماعيل بن إدريس الرومي المدنيان بشرط مراجعة غريب اللغة وأسماء الرجال، والورع والتقوى، والعملِ بما سنَّ به المصطفى واٰله المجتبى عليه وعلى اٰله من الصلوات أفضلها ومن التحيات أكملها.

قال بفمه وكتبه بقلمه عبد الغني[2] بن أبي سعيد المجددي

في المدينة المنورة في الخانقاه المجددي

سنة ألف ومأتين وستة وثمانين

مولانا عبداللہ نے ۱۳۲۱ھ میں انتقال کیا، مئو محلّہ پیارے پورہ کے مغربی جانب باغ میں آپ کا مزار ہے۔

☆......☆......☆

(۱) توفي سنة ١٢٥٧هـ

(۲) توفي سنة ١٢٩٤هـ

پندرہویں شعبان کی حدیث

پندرہویں شعبان کے روزے کے باب میں جو حدیث ابن ماجہ میں آئی ہے، وہ موضوع نہیں ہے۔ کسی ماہر حدیث عالم نے اس کو موضوع نہیں کہا ہے۔ تحفۃ الاحوذی کی عبارت سے اس حدیث کے موضوع ہونے پر استدلال کرنا جہالت ہے۔ اس حدیث کے راویوں میں ابوبکر بن ابی سبرہ ضرور ہے، اس کی نسبت بے شک یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حدیثیں بناتا تھا، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زیر بحث حدیث اس کی بنائی ہوئی اور موضوع ہے، محض اس بنا پر کہ سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہے، اس سے تو بس اتنا لازم آئے گا کہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن حضرات نے سنن ابن ماجہ کی موضوع احادیث کی نشاندہی کی ہے، ان میں اس حدیث کا ذکر نہیں ملتا۔ **ما تمس إليه الحاجة** میں وہ ساری حدیثیں مذکور ہیں جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

اصول حدیث وغیرہ کی مختلف کتابوں میں جگہ جگہ یہ تصریح مل سکتی ہے کہ کسی حدیث کی سند میں کوئی کذاب یا وضاع راوی پایا جائے، تو محض اتنے سے وہ حدیث موضوع نہیں ہو جائے گی، جب تک کہ دوسری کوئی دلیل اس کے موضوع ہونے پر دلالت نہ کرے۔ مثال کے طور پر (فتح المغیث: ۱/۲۵۱) ملاحظہ کیا جائے، امام بخاری لکھتے ہیں:

هذا مع أن مجرد تفرد الكذاب بل الوضاع ولو كان بعد الاستقصاء والتفتيش من حافظ متبحر تام الاستقراء غيرُ مستلزم لذلك بل لا بد معه من انضمام شيء مما سيأتي(۱).

(۱) (ترجمہ) محض کسی جھوٹے بلکہ وضاع حدیث کا کسی حدیث میں متفرد ہونا اگرچہ اس کا ثبوت کسی متبحر اور دیدہ ور حافظ حدیث کی تحقیق سے ہو، اس کو (یعنی حدیث کے موضوع ہونے کو) مستلزم نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ کسی اور دلیل کا انضمام بھی ضروری ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے (ادارہ)

اسی طرح راوی کو منکر الحدیث اور حدیث کو منکر بھی کہا گیا ہو، تب بھی اس کو موضوع کہنا جائز نہیں۔ حدیث **لا تقولوا سورة البقرة** کو امام احمد نے منکر اور اس کے راوی عبیس کو منکر الحدیث کہا ہے، اس بنا پر ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں داخل کر دیا تو حافظ ابن حجر نے اس پر سخت اعتراض کیا۔
فرماتے ہیں:

أفرط ابن الجوزي في إيراد هذا الحديث في الموضوعات، ولم يذكر مستنَده إلا قولَ أحمد وتضعيف عبيس وهذا لا يقتضي الوضع (اللآلي المصنوعة: ۱/۲۳۹)(۱)۔

سطور بالا سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس شخص نے یہ بات کہی ہے کہ روایتِ فضیلۃ صوم شعبان میں ابوبکر بن عبداللہ راوی واضع الحدیث تھا، اس لیے یہ روایت موضوع ٹھہری، بالکل غلط ہے، ایسی جہالت کی بات کوئی عالم نہیں کہہ سکتا، مولانا عبدالرحمٰن مرحوم کیسے ایسی بات کہہ سکتے ہیں، مولانا تو اس حدیث کو پندرہویں رات کی فضیلت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، اور اس سے اس شخص کے اوپر حجت قائم کرتے ہیں، جو یہ کہتا ہے کہ شعبان کی پندرہویں رات کی فضیلت ثابت نہیں۔
تحفۃ الاحوذی کی عبارت بعینہٖ نقل کی جاتی ہے:

منها حديث علي رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلَها وصوموا نهارها (إلى) رواه ابن ماجه وفي سنده أبو بكر بن عبد الله بن أبي سبرة القرشي العامري المدني قيل اسمه عبد الله وقيل محمد، وقد ينسب إلى جده، رمَوه بالوضع كذا في التقريب وقال الذهبي في

(۱) (ترجمہ) ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوعات کی قبیل سے شمار کر کے تشدد سے کام لیا ہے اور دلیل میں سوائے حضرت امام احمد کے قول اور عبیس کی تضعیف اور کچھ نہیں ذکر کیا، لیکن یہ بات اس کے موضوع ہونے کی مقتضی نہیں ہے (ادارہ)۔

الـميزان: ضعَّفه البخاري وغيره، روى عبد الله وصالح ابنا أحمد عـن أبيهـمـا قـال: كـان يـضع الحديث، وقال النسائي: متروك انتهى.

فهـذه الأحـاديـث بـمـجـموعها حجة على من زعم أنه لم يثبـت فـي فـضيـلة ليـلة الـنـصف من شعبان شيء. (تحفۃ الاحوذی: ۵۳/۲)[۱]۔

دیکھیے مولانا مبارک پوری ابن ماجہ کی حدیث نقل کرکے اس کے راوی پر جو جرح ہے اس کو بھی نقل کرتے ہیں، اس کے باوجود اس حدیث کو دوسری ضعیف حدیثوں کے ساتھ ملا کر حجت بھی قرار دیتے ہیں۔ کیا موضوع حدیث کو بھی دوسری حدیث کے ساتھ ملا کر حجت بنایا جاسکتا ہے؟ یہ بات کوئی عالم نہیں کہہ سکتا۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے جس طرح اس حدیث کو موضوع نہیں کہا ہے، بلکہ صرف ضعیف قرار دیا ہے، اسی طرح حافظ منذری نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور چوں کہ اس کو انھوں نے اپنی کتاب ترغیب وترہیب میں ذکر کیا ہے، اس لیے وہ حسب تصریح سیوطی موضوع نہیں ہے۔ سیوطی فرماتے ہیں:

إذا عـلِـمتُم بالحديث أنه في تـصـانيف المنذري صاحب

جب تمھارے علم میں یہ بات آجائے کہ کوئی حدیث منذری صاحب ترغیب وترہیب کی

(۱) (ترجمہ) انھیں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شعبان کی ۱۵/تاریخ آئے تو رات میں عبادت کرو اور دن میں روزہ رکھو، -الی- اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابوبکر بن عبداللہ بن ابی سبرہ القرشی العامری المدنی ہے، ان کا نام لوگوں نے عبداللہ بتایا ہے بعض لوگوں نے محمد بتایا ہے۔ اس کی نسبت عموماً ان کے دادا کی جانب ہوتی ہے، لوگوں نے اس کو وضع حدیث کا مرتکب ٹھہرایا ہے۔ ایسے ہی تقریب میں ہے، امام ذہبی نے میزان میں فرمایا ہے کہ امام بخاری وغیرہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور عبداللہ وصالح بن احمد بن حنبل نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ وہ حدیث گھڑتا تھا اور امام نسائی نے فرمایا کہ وہ متروک ہے۔ پس یہ تمام حدیثیں مجموعی اعتبار سے اس شخص کے خلاف حجت ہیں، جس نے گمان کیا ہے کہ پندرہویں شعبان کی رات کے سلسلہ میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے۔ تحفۃ الاحوذی ج ۲: ص ۵۳ (ادارہ)

التـرغيـب والتـرهيب فاروه مطمئنين[۱].

تصنیفات میں موجود ہے تو اس کو اطمینان سے بیان کرسکتے ہو، یعنی یہ کہ وہ موضوع نہیں ہے۔

اب تک ہم نے یہ بیان کیا کہ یہ حدیث موضوع نہیں اور اس کو موضوع قرار دینا جہالت ہے، ہاں وہ ضعیف ضرور ہے، مگر اس کا ضعف اس پر عمل کرنے سے مانع نہیں ہے۔

حافظ ابن عبدالبر نے کتاب العلم میں یہ حدیث روایت کی ہے:

مـن بـلـغــه عـن الله فـضلٌ فـأخذ بـذلـك الـفضل الذي بلغه أعطاه الله تـعـالـى مابلغه وإن كان الذي حدثه كاذباً.

(جس کسی کو کسی کام پر کسی ثواب کی اطلاع ہے، اور وہ اس پر کاربند ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ ثواب دیدے گا جس کی اطلاع اس کو پہنچی ہے اگرچہ جس نے بیان کیا ہے وہ جھوٹا ہے)۔

حافظ ابن عبدالبر اس کو روایت کرکے فرماتے ہیں کہ:

اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے اس لیے کہ ابومعمر عباد بن عبداللہ اس کا تنہا راوی ہے اور وہ متروک راوی ہے، مگر اہل علم اپنی جماعت کے ساتھ فضائل وثواب کے کاموں کے باب میں بہت ڈھیل دیتے ہیں اور ہر طرح کی حدیثوں میں سختی سے کام لیتے ہیں[۲]۔

خطیب بغدادی نے کتاب الکفایۃ میں امام احمد وغیرہ ائمہ حدیث کا قول نقل کیا ہے:

إذا روينا في الحلال والحرام شدَّدنا وإذا روينا في الفضائل تساهلنا[۳]۔

اور یہی بات امام نووی اور حافظ عراقی وغیرہ نے وضاحت کے ساتھ مکمل کیا ہے۔

(۱) الرحمة المرسلة في شأن حديث البسملة:۱۵

(۲) اللآلي المصنوعة: ۲۱۵/۱

(۳) جب ہم حرام وحلال کے باب میں حدیث نقل کرتے ہیں تو پوری احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جب فضائل کے باب میں روایت کرتے ہیں تو سہولت برتتے ہیں۔ (ادارہ)

نووی نے لکھا ہے:

يجوز عند أهل الحديث التساهل في الأسانيد الضعيفة ورواية ما سوى الموضوع من الضعيف والعمل به من غير بيان ضعفه في غير صفات الله والأحكام[(۱)].

اہل حدیث کے نزدیک ضعیف سندوں میں تساہل برتنا اور موضوع کو چھوڑ کر ضعیف حدیثوں کو روایت کرنا اور ان پر عمل کرنا ان کا ضعف بیان کیے بغیر جائز ہے، مگر اللہ کی صفات اور احکام کی حدیثوں میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

☆......☆......☆

(۱) تدریب الراوی:۱۹۶

ہندوستان میں علومِ حدیث کی تالیفات

برہان-اگست وستمبر ۱۹۵۳ء- میں مسطورہ بالاعنوان کے ماتحت مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری کا مضمون پڑھ کر خیال ہوا کہ، اگرچہ مولانا نے تمام تالیفات کے استیعاب کا ارادہ نہیں کیا ہے، تاہم اس سلسلہ کی جن تالیفات کا اب تک ذکر نہیں ہوا ہے، ان میں سے جن کے نام اس وقت ذہن میں ہیں، ان کو بھی پیش کر دیا جائے تو خالی از فائدہ نہیں ہے، ذیل کی سطریں اسی خیال کی تکمیل ہیں۔

۱:- **ترجمه مشارق الأنوار**: علوم حدیث کی ہندوستانی تالیفات میں یہ ایک قدیم تالیف ہے، ملا عزیز اللہ مداری لکھتے ہیں:

شیخ سلیمان محدث کہ از فحول محدثیں بودہ، صاحب ترجمہ صغانی ست درہشت صد وشصت وپنج ترجمہ تمام کردہ بنظر شریف میر سید صدر جہاں گزرانیدہ[(۱)]

شیخ سلیمان محدث زبردست محدثین میں سے تھے، انھوں نے صغانی (مشارق الانوار) کا ترجمہ کیا ہے، ۸۶۵ھ میں ترجمہ پورا کر کے میر سید صدر جہاں کی خدمت میں پیش کیا۔

۲:- **معدن الأسرار شرح مدارج الأخبار**: مولانا ابوسلمہ صاحب نے جس مدارج الاخبار کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے[(۲)] یہ کتاب اسی کی شرح ہے، شرح ومتن

(۱) تحفۃ الابرار قلمی ورق:۲۱

(۲) اس کتاب کا ذکر مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی شروح مشارق کے سلسلہ میں کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو معارف دسمبر ۴۷ء) مولانا ابوسلمہ بہاری نے شاید سہواً اس کو غیر مذکور تالیفات میں شمار کر دیا، ہاں سابق الذکر کا مدارج الاخبار کو شرح مشارق لکھنا صحیح نہیں ہے۔

دونوں خواجہ مبارک بن شیخ ارزانی کی کاوش ومحنت کا نتیجہ ہیں، معدن الاسرار کا سال تصنیف ۹۵۲ھ ہے، اوراس کوخواجہ مبارک نے اسلام خاں سور کے نام سے معنون کیا ہے[۱]۔

اس کتاب کے مصنف کا اصل نام مبارک ہے، مگر اُس عہد کے دستور کے مطابق ان کا نام باپ کے نام کے ساتھ ملا کر خواجہ مبارک ارزانی لکھا جاتا تھا، بعد میں کسی نے شاید مبارک کو لقب ووصف سمجھ کر حذف کر دیا اورصرف خواجہ ارزانی لکھ دیا، جس سے شبہ ہونے لگا کہ ان کا نام خواجہ ارزانی ہے؛ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، ملا عزیز اللہ مداری جو خواجہ مبارک کے نواسے ہیں، انھوں نے ان کا نام خواجہ مبارک ارزانی اور ان کے والد کا نام شیخ ارزانی لکھا ہے، ملا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''از فحول محدثین بود'' اور ان کی تصنیفات حدیثیہ میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں:

۳:- **ریحانی شرح مشکوٰۃ المصابیح.**

۴:- **شرح حدیث إنما الأعمال بالنیات وحدیث الإیمان بضع وسبعون شعبة.**

''مدارج الاخبار'' کے مصنف کا نام شاہ یٰسین صاحب بنارسی نے بھی خواجہ مبارک لکھا ہے، اوران کو ''زبدۃ المحدثین'' کے لقب سے یاد کیا ہے، اورلکھا ہے کہ عالم باعمل اور محدث کامل تھے (مناقب العارفین قلمی)۔

۵:- **الفصول شرح جامع الأصول**، ازحضرت شیخ علی متقی المتوفی ۹۷۵ھ: اس کا قلمی نسخہ بانکی پور میں ہے۔

۶:- **شمائل النبي ﷺ** - ازشیخ مذکور: اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ میں ہے۔

۷:- **البرهان في علامات مهدي آخر الزمان**: بڑی تقطیع کے چھیاسی ورق کا ایک رسالہ ہے، اس کے مؤلف شیخ علی متقی رحمہ اللہ ہیں، مہدی کے باب میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں، ان کو مصنف نے اس رسالہ میں یکجا کردیا ہے، مؤلف کا بیان ہے

(۱) تحفۃ الابرار قلمی ورق ۳۲

کہ میں نے سیوطی کے رسالہ ''العرف الوردی'' کو مبوّب کردیا ہے اور ''جمع الجوامع'' سے کچھ احادیث کا اضافہ بھی کیا ہے۔

۸:- حواشی مشکوٰۃ، ازشیخ عبداللہ سندی: مصنف حضرت شیخ علی متقی کے خلیفہ خاص اور یارانِ بااختصاص میں تھے، علم حدیث شیخ متقی اور ابن حجر مکی سے حاصل کیا تھا، عربیت میں اتنے ماہر تھے کہ ابن حجر ان سے کہا کرتے تھے: **أعربوا لنا هذا الكلام** (ذرا اس کی عربی کردو) شیخ عبداللہ کے اجازت نامہ میں ابن حجر نے یہاں تک لکھ دیا کہ انھوں نے جتنا مجھ سے استفادہ کیا، اس سے زیادہ میں نے ان سے استفادہ کیا۔ شیخ عبداللہ نے مشکوٰۃ کا ایک نسخہ تصحیح کا کمال اہتمام کرکے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اوراس پر حاشیہ بھی لکھا تھا، حواشی میں مذہب حنفی کی تائید اوراس کے دلائل ذکر کیے تھے، فرماتے تھے کہ میں نے مشکوٰۃ کو حنفی بنادیا ہے، یہ بھی فرماتے تھے کہ میں نے اپنی عمر میں سب سے اچھا کوئی کام کیا ہے تو یہی مشکوٰۃ کی تصحیح ہے، مجھ کو اسی سے مغفرت کی امید ہے۔ ۹۹۶ھ میں وفات پائی[۱]۔

۹:- **الحواشي على منهاج العمال في سنن الأقوال**: منہج العمال شیخ علی متقی کی تصنیف ہے اوراس پر مولانا نجیب بن قاسم چندراوتی احمد آبادی نے حاشیہ لکھا ہے، اس میں حمد وصلوٰۃ کے بعد فرماتے ہیں:

أما بعد! فقد فرغت من مطالعة هذه النسخة......ومن تصحيحها ومقابلتها وكتابة حواشيها من أولها إلى آخرها بعون الله وحسن توفيقه في الضحوة الكبرى في اليوم التاسع والعشرين من الشهر المعظم المبارک شهر رمضان عمت وشاعت بركاته سنة ست وخمسين وتسع مائة في شهر أحمد آباد صينت عن الآفات والبليات وحرسها الله عن الحوادث والنكبات، فالمأمول من الناظرين والمرجو من المستفيدين من هذه النسخة أن لا

(۱) تقصار، حدائق الحنفیہ، تذکرہ علمائے ہند

ينسَـونـي مـن دعـائهم المستجاب. قاله أفقر العباد إلى الله الغني نجيب بن قاسم المرحوم الجندراوتي.

منہج العمال کا قلمی نسخہ جس پر یہ حواشی ہیں جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں ہے، یہ نسخہ محشی کے بھانجے قاضی عبداللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کا سن کتابت ۹۸۶ھ ہے، شیخ نجیب کا مزید حال معلوم نہیں ہوسکا، خود ان کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ حواشی مصنف کی زندگی میں لکھے ہیں، کچھ بعید نہیں کہ وہ شیخ مصنف کے شاگرد بھی ہوں۔

۱۰:- **مختصر المواهب اللدنية:** یہ شیخ طاہر بن یوسف سندی کی تالیف ہے، اس کا قلمی نسخہ میں نے جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں دیکھا ہے، اس کے سرورق پر نسخہ کے قدیم مالک علی بن عبداللطیف سندی نے کتاب و مصنف کتاب کا نام یوں لکھا ہے:

''**الفوائد الأحمدية لتاج المحدثين شيخ طاهر السندي**''.

مگر خود مؤلف نے کتاب کے اخیر میں یوں لکھا ہے:

هـذه الـنسـخة فـوائـد مـحـمـديـه مستخرجة منتخبة من المواهب اللدنية استخرجها فقير طاهر بن يوسف.

اس نسخہ کا کاتب حسین بن یحییٰ ہے، جس نے اس کو ۱۰۰۲ھ میں نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کم از کم دسویں صدی ہجری میں تالیف ہوئی ہے، مؤلف کی وفات ۱۰۰۳ھ میں ہوئی، ان کے حالات کے لیے میرا مضمون ''ضمیمۂ حیات شیخ عبدالحق'' ملاحظہ کیا جائے۔

۱۱:- **أسامي رجال صحيح بخاري:**

۱۲:- **موجز القسطلاني** (قسطلانی شرح بخاری کا اختصار):

۱۳:- **ملتقط جمع الجوامع** (سیوطی کی جمع الجوامع کا انتخاب):

یہ تینوں کتابیں بھی تاج المحدثین علامہ طاہر بن یوسف سندی کی تصنیف ہیں۔

۱۴:- **شـرح صـحـيـح الـبـخـاري:** مصنفہ حکیم عثمان بن شیخ عیسی بن الشیخ

ابراہیم صدیقی بوبکانی سندی ثم البرہانفوری: آپ شیخ وجیہ الدین علوی اور قاضی محمود مور پی اور شیخ حسین بغدادی کے شاگرد تھے، اور قاضی نصیر الدین بن شیخ سراج محمد بنبانی، شیخ صالح سندی اور قاضی عبدالسلام سندھی شارح مختصر وقایہ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل تھا، آپ کی تصنیفات میں شرح بخاری کے علاوہ بیضاوی کے حواشی بھی ہیں، ۱۰۰۸ھ میں چوروں کے ہاتھ سے شہید ہوئے[1]۔

کتب خانہ رامپور میں ایک کتاب دو جلدوں میں **غـايـة التـوضـيـح لـلجـامـع الـصـحـيح** مصنفہ علامہ عثمان بن ابراہیم الصدیقی الحنفی کے نام سے موجود ہے، میرا خیال ہے کہ وہ یہی کتاب ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

۱۵:- شرح شمائل ترمذی: تصنیف شیخ محمد عاشق بن عمر حنفی محدث فقیہ، شاگرد مخدوم الملک عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری - المتوفی ۹۹۰ھ -: مصنف نے ۱۰۳۲ھ میں وفات پائی، اس کتاب کا قلمی نسخہ مولانا شمس الحق ڈیانوی کے کتب خانہ میں تھا، اب معلوم نہیں موجود ہے یا ضائع ہوگیا۔

۱۶:- **ثبت الشيخ عبد الحق المحدث الدهلوي:** یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں شیخ اپنی اسانید حدیث جمع کر دی ہیں، اور وہ اجازت نامے بھی نقل کر دیے ہیں جو ان کے شیوخ حدیث نے ان کو مرحمت فرمائے ہیں۔

۱۷:- **أشرف الوسائل** شرح شمائل ترمذی: یہ کتاب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پڑپوتے شیخ سیف اللہ (بن نور اللہ بن نور الحق بن عبدالحق) کی تصنیف ہے، ۲؍رجب ۱۰۹۱ھ کو مکمل ہوئی اور اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کی گئی[2]۔

۱۸:- ترجمہ فارسی شمائل ترمذی: یہ کتاب قطب الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد میں اور ان کے حکم سے ۱۱۲۳ھ میں تالیف ہوئی، چھوٹی تقطیع کے ۳۳۹ ورق پر لکھی

(۱) گلزار ابرار ص......

(۲) حیات شیخ عبدالحق: ۲۶۱

ہوئی جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں موجود ہے، میں نے اس کا سرسری مطالعہ کیا ہے، دیباچۂ کتاب میں مؤلف نے اپنا نام قاضی محمد عاقل بن شیخ محمد خا کی بتایا ہے، اور ان الفاظ میں اپنا تعارف کرایا ہے:

’’آستاں بوس مدرسۂ امام المحققین شیخ نور محمد لاہوری، ومدرسۂ قدوۃ المحدثین والمفسرین شیخ الحرمین شیخ احمد عرف شیخ جیون‘‘۔

اس تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف ملا جیون امیٹھوی -المتوفی ۱۱۳۰ھ- کے شاگرد تھے۔

۱۹:- **زبدة المقاصد في تجريد الزوائد**: یہ **المقاصد الحسنة** (سخاوی) کا خلاصہ ہے، مؤلف نے لکھا ہے کہ میں نے مقاصد حسنہ سے ان چیزوں کو منتخب کر کے جمع کر دیا ہے، جو رسول خدا ﷺ کا کلام قطعاً نہیں ہیں، بلکہ امت کے کسی عالم یا ولی وغیرہ کا کلام ہے، مگر حدیث کے نام سے ان کی شہرت ہے، اس رسالہ میں وہ اقوال حروف کی ترتیب پر مذکور ہیں پہلا قول **آخر الطب الكي** ہے۔

۲۰:- **تذكرة الأحياء في تصفية الإحياء**: یہ حافظ عراقی کی تخریج احادیث احیاء العلوم کی تلخیص ہے، مؤلف کا بیان ہے کہ میں اس رسالہ میں صرف ان روایات کو تخریج احیاء سے منتخب کر لیا ہے جو موضوع یا منکر ہیں، یا جن کی سند میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب یا مردود یا متروک یا فاسق راوی ہے، یا جس کی سند محدثین کے نزدیک معروف نہیں ہے۔

یہ دونوں کتابیں شیخ ابوالفضل عبدالحق بن فضل اللہ المحمدی البنارسی کی تالیف ہیں، مؤلف کا سال وفات ۱۲۸۶ھ ہے۔

بحمد اللہ سبحانہ میں نمبر ۷ و۱۶ و۱۹ و۲۰ کے مطالعہ سے بہرہ یاب ہوا ہوں۔

۲۱:- **رسالة صداق السيدة فاطمة الزهراء**، تصنیف شیخ صبغۃ اللہ بن محمد غوث مدراسی: سال تصنیف ۱۲۷۹ھ

۲۲:- **إزالة الصمة في حديث اختلاف الأمة**. تصنیف شیخ صبغۃ اللہ المدراسی

۲۳:- **رسالة تعليم النساء الكتابة**، تصنیف شیخ سابق الذکر۔

ان تینوں رسالوں کے قلمی نسخے کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں میرے مطالعہ سے گذرے ہیں۔

۲۴:- **ذيل القول المسدد**: یہ حافظ ابن حجر کے رسالہ **القول المسدّد** کا تتمہ ہے، اور اسی کے ساتھ حیدرآباد میں چھپا ہے، اس کے مصنف بھی شیخ صبغة الله مذکور ہیں، سال تصنیف ۱۲۷۹ھ ہے۔

۲۵:- **كشف الأحوال في نقد الرجال**: یہ بھی سابق الذکر محدث کے بھائی شیخ عبدالوہاب بن مولوی محمد غوث کی تصنیف ہے، اور **المقاصد الحسنة** کے ساتھ طبع ہو کر لکھنؤ سے مدت ہوئی شائع ہوچکی ہے۔

۲۶:- رسالہ در اصول حدیث:

۲۷:- فرہنگ صحیح مسلم:

۲۸:- تذکرۃ الموضوعات:

یہ تینوں کتابیں دار العلوم ندوہ میں موجود ہیں اور فہرست میں مصنف کا نام مولانا عبداللہ محمدی الہ آبادی لکھا ہوا ہے، ان میں سے بعض خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں، سن کتابت ۱۲۶۵ھ ہے۔

۲۹:- خیر المواعظ: احادیث کا ایک عمدہ مجموعہ ہے، طبع بھی ہو چکا ہے، اس کی دو جلدیں ہیں، اس کے مصنف مولانا محمد زماں خاں شاہجہاں پوری استاذ نظام الملک محبوب علی خاں نواب حیدرآباد ہیں، آپ کی شہادت ۱۲۹۲ھ میں ہوئی، تفصیلی حالات کے لیے تذکرہ علمائے ہند ملاحظہ کی جائے۔

۳۰:- **أربعين مسمى أحاديث الحبيب المتبركة** ﴿۱۲۵۶ھ﴾: یہ تاریخی نام ہے، جمع کردہ حضرت مفتی عنایت احمد (تلمیذ حضرت شاہ اسحاق دہلوی) متوفی ۱۲۷۹ھ۔

۳۱:- أربعين مسمى به تسخير ﴿۱۲۷۰ھ﴾ (تاریخی نام): حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اربعین کا منظوم ترجمہ، از مولوی ہادی علی لکھنوی۔

۳۲:- ضوء المشكوٰة.

۳۳:- ظفر الأماني بشرح مقدمة الجرجاني: اصول حدیث میں بہت محققانہ کتاب ہے، مصنفہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی المتوفی ۱۳۰۴ھ۔

۳۴:- سلطان الاذکار مصنفہ نواب نورالحسن خاں ولد نواب صدیق خاں بھوپالی: اذکار نبوی کا بہت عمدہ مجموعہ ہے، طبع ہو چکا ہے۔

۳۵:- کشف الأستار عن رجال معاني الآثار، مصنفہ مولانا ابوتراب رشداللہ شاہ صاحب العلم الرابع (پیر جھنڈا سند): معانی الآثار امام طحاوی کے رجال کے بیان میں ہے، خود مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے علامہ عینی کی ''مغانی الاخیار'' سے ان رجال کے حالات نقل کر لیے جو صحاح ستہ کے راوی نہیں ہیں، اس کے بعد ''معانی الآثار'' میں جو صحاح ستہ کے راوی ہیں ان کے حالات ''تقریب'' و ''تہذیب'' سے لے کر اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب دیوبند سے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ ان کو علامہ عینی کی ''مغانی الاخیار'' کا نسخہ ۱۳۲۳ھ میں مدینہ منورہ میں ملا تھا۔

۳۶:- أسماء رجال كتاب الآثار: امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار کے رجال کا بیان ہے۔

۳۷:- تسهيل المنهج في أسماء رجال كتاب الحجج: یہ کتاب امام محمد کی كتاب الحجج کے رجال کے بیان میں ہے، یہ دونوں کتابیں مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کی تصنیف ہیں، خدا ان کو جزائے خیر دے کہ اس ضروری کام کی طرف ان کو توجہ ہوئی اور انھوں نے یہ علمی خدمت انجام دی، مگر افسوس ہے کہ یہ کام جتنی محنت و کاوش اور تلاش و جستجو سے انجام دینے کا تھا، اتنی محنت اور جستجو سے وہ کام نہ لے سکے، اس لیے بہت سے رجال کی نسبت وہ اس فن کے ماہرین کے اقوال نہ پا سکے اور نہ ان کو وہ رجال کتب

رجال میں مل سکے، اس لیے ان کی نسبت صرف لم أرَ مَن ضعَّفه یا لم أعرفه لکھ دینے پر اکتفا کر لیا، نیز رجال کے ناموں میں ناقلوں کی ستم ظریفی سے جو تحریف ہو گئی ہے اس پر بھی تنبہ نہیں ہوا، مثلاً:

اَبان بن لقیط کی نسبت انھوں نے لکھا کہ: لم أرَ مَن ضعَّفه، حالانکہ یہ نام ہی غلط چھپ گیا ہے، صحیح نام إیاد بن لقیط ہے اور وہ صحیح مسلم و سنن کا راوی ہے اور ابن معین وغیرہ نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔

اور البراء بن قیس کی نسبت لکھ دیا: مقبول والله أعلم، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راوی ان کو کتب رجال میں نہیں ملا اور اپنے وجدان سے اس کو مقبول قرار دیا؛ حالانکہ اس کا ذکر ثقات ابن حبان اور تاریخ بخاری میں موجود ہے۔

اور مثلاً علی بن ندیمہ کی نسبت صرف اتنا لکھا کہ: لم يُجرَح ولم يضعَّف، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو تحریف ہوئی ہے، اس پر ان کو تنبہ نہیں ہوا اور اس لیے یہ نام ان کو کتب رجال میں نہیں ملا، تو اپنی طرف سے لم يجرح ان کو لکھنا پڑا؛ حالانکہ صحیح علی ابن بذیمہ ہے اور وہ سنن کا راوی اور تہذیب التہذیب میں مذکور ہے۔

اور جیسے کہ حکیم بن عتبہ ان کو کتب رجال میں نہیں ملا، تو صرف یہ لکھ کر آگے بڑھ گئے کہ أخرج له الإمام محمد بن الحسن فهو مقبول، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس نام میں دو غلطیاں ہو گئی ہیں، اس لیے وہ کہیں نہیں ملا، صحیح الحکم بن عتیبہ ہے اور تہذیب التہذیب میں مذکور ہے۔

اسی طرح اس سے روایت کرنے والا نہ الحسن الجبير ہے نہ الحسن بن أبجر؛ بلکہ الحسن بن الحُر ہے، جو تہذیب میں مذکور ہے، مولانا فرنگی محلی نے الحسن بن أبجر کو تلاش کیا، نہیں ملا تو محض اپنے وجدان سے ''مقبول'' کہہ کر ختم کر دیا۔

یونہی داؤد بن قيس الفراء کو مطبوعہ نسخہ انجح میں کاتبوں نے الفزاری لکھ دیا ہے۔ مولانا کو داؤد بن قيس فزاری کہیں نہیں ملا تو لکھا: لم أقف على تضعيفه،

حالانکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا صحیح الفراء ہے اور وہ تہذیب میں مذکور ہے۔

اسی طرح **زبیر بن الصلت** کہیں نہیں ملا تو لکھا: **لم أرمن نبَّه علی ضعفه،** حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ نام غلط چھپا ہے، صحیح **زبید بن الصلت** ہے اور اس کا ذکر طبقات ابن سعد اور تعجیل المنفعۃ میں ہے۔

یہ مشتے نمونہ ازخروارے ہے، ورنہ اس طرح کی اور بھی بہت سی فروگذاشتیں ہیں۔

اسماء رجال کتاب الآثار بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے، اس میں بھی اس طرح کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً:

۱- افلح بن قیس کی نسبت یہ لکھ کر کہ محفوظ ابوالافلح ہے، میزان سے یہ نقل کر دیا کہ **لا ندري من هو**، حالانکہ میزان میں یہ فقرہ ایک دوسرے راوی کی نسبت مذکور ہے، یہاں جس ابوالافلح کا ذکر ہے، وہ ثقہ اور معروف ہے، جیسا کہ تہذیب ۳۶۹/۱، اور تہذیب التہذیب ۳/۱۲ سے ظاہر ہے۔

۲- ابوعازیہ لکھا کہ میں ان سے واقف نہیں ہوا، مگر میں گمان کرتا ہوں کہ یہ ابوالغادیۃ ہیں۔ حالانکہ وہ بے شبہ ابوالغادیۃ ہیں، اگر ابوالغادیہ نہ ہوتے تو ابوعازیہ نام کے راوی کا ذکر تعجیل المنفعۃ یا تہذیب میں ہونا ضروری تھا، جیسا کہ تعجیل المنفعۃ کے مقدمہ سے ظاہر ہے۔ اس کے مثل اور بھی نظائر اس کتاب میں ہیں۔

۳- **عبد الملك بن عمير عن رجل من آل أبي حثمة أو من البلحرث** کی نسبت کچھ نہیں لکھا، حالانکہ تہذیب میں عبدالملک کا حال شرح وبسط سے مذکور ہے۔

۴- کدام بن عبدالرحمٰن کے ذکر میں اتنا لکھ کر چھوڑ دیا کہ: **لا يعرف، مجهول من الثالثة كذا في التقريب وقد روى عند محمد،** حالانکہ تہذیب میں ہے کہ ان سے عثمان بن واقد اور امام ابوحنیفہ نے روایت کی ہے، اور دو شخصوں نے ان سے روایت کی ہے تو اصول حدیث کے رو سے وہ مجہول نہیں رہے، اسی لیے تہذیب میں ابن حجر نے ان کو

مجہول کہنے کی نسبت ابن حزم کی طرف کی ہے۔

مولانا کے اوہام میں سے ایک وہم یہ بھی ہے کہ انھوں نے تعجیل المنفعۃ کو شیخ ابن حجر مکی کی تصنیف قرار دیا ہے[1]، حالانکہ وہ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے جو اول الذکر سے اقدم واعلم ہیں۔

نیز امام طحاوی کو کتاب الآثار، امام محمد کا شارح قرار دیا[2]، حالانکہ کسی تذکرہ نویس نے ان کی تصنیفات میں شرح آثار امام محمد کا ذکر نہیں کیا ہے، نہ ان کو اس کا شارح لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں کتابوں میں یہ جو لکھا ہوا ملتا ہے: **ذكره الطحاوي في شرح الآثار** تو اس سے مولانا نے شرح آثار محمد سمجھ لیا، حالانکہ لکھنے والوں کی مراد شرح الآثار سے شرح معانی الآثار ہے۔

۳۸:- **الدرر الباهرة في الأحاديث المتواترة:**

۳۹:- **الباقيات الصالحات في الأسانيد والأوائل والمسلسلات:**

یہ دونوں رسالے بھی مولانا عبدالباری مرحوم کے ہیں، ان کا موضوع ان کے ناموں سے ظاہر ہے، یہ سب کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

۴۰:- **المناهل السلسلة فی الأحاديث المسلسلة،** مطبوعہ مصر۔

۴۱:- **الإسعاد بالإسناد، مطبوعه مصر:** یہ دونوں کتابیں شیخ عبدالباقی ایوبی انصاری فرنگی محلی ثم المدنی کی تصنیف ہیں۔ مولانا عبدالباقی کی وفات ابھی چند برس پہلے ہوئی ہے۔

۴۲:- **زجاجة المصابيح:** یہ کتاب مشکوٰۃ کے طرز پر لکھی گئی ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ کے مصنف شافعی ہیں، انھوں نے فروع میں وہ حدیثیں ذکر کی ہیں جن سے شوافع کی تائید ہوتی ہے، اور زجاجۃ المصابیح کے مصنف حنفی ہیں، انھوں نے فروع

---

(۱) دیکھو مقدمہ التعلیق المختار: ۳۰

(۲) مقدمہ تعلیق مختار: ۶۵

میں وہ حدیثیں نقل کی ہیں، جن سے حنفیہ کا مذہب ثابت ہوتا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد -جو کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصوم پر مشتمل ہے- پانچ سو نوے صفحات میں حیدرآباد سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، کتاب کے مؤلف مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ حیدرآبادی ہیں، جابجا مصنف کے قلم سے حواشی بھی ہیں، جن میں فقہی مباحث اور احادیث توجیہات ہیں، حواشی میں احادیث کی صحت وضعف اور رجال کی بحث بالکل نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی ضروری چیز تھی۔

۴۳:- شرح شمائل ترمذی مصنفہ باباحاجی: اس کا قلمی نسخہ ابھی حال میں میری نظر سے گذرا ہے اور اسی وجہ سے اس کو تینتالیسویں نمبر پر جگہ ملی، ورنہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے اس کا ذکر بہت پہلے ہونا چاہئے، اس لیے کہ اس کا سال تصنیف ۹۷۷ھ یا ۹۸۶ھ ہے۔ یہ شمائل ترمذی کی شرح فارسی زبان میں ہے۔

میرے خیال میں اس کتاب کے مصنّف شیخ بابامسعود کشمیری کے صاحبزادہ شیخ بابا حاجی ہیں، جن کی نسبت ''اسرارالابرار'' میں مذکور ہے کہ:

''صاحب استعداد کاملہ بود، وخداوند ارشاد شاملہ واہل کشف وکرامات بود، وخرمن ریاضات وانبار عبادات[1]۔

سن وفات معلوم نہیں ہوا، مگر ''اسرارالابرار'' کا سال تصنیف ۱۰۶۳ھ ہے، اور بابا حاجی کی وفات اس سے پہلے ہوچکی تھی۔

۴۴:- **قلائد الأزهار شرح كتاب الآثار** مصنفہ مولانا مہدی حسن شاہ جہاں پوری مفتی دارالعلوم دیوبند: امام محمد کی کتاب الآثار کی بہت مبسوط اور محققانہ شرح ہے، آثار کی تخریج اور رجال پر بحث کا بھی التزام ہے، میں نے جگہ جگہ سے دیکھا ہے، مفتی صاحب کی محنت قابل داد ہے، **جزاه الله خيراً**، اب تک چھپنے کی نوبت آئی، کتاب اس قابل ہے کہ کوئی صاحب ہمت اس کو طبع کرادے۔

(۱) اسرارالابرار: ورق ۱۹۹

۴۵:- **الحاوي لرجال الطحاوي**: اس کتاب کا ذکر اس سلسلہ میں محض **تحدث بالنعمة** کے طور پر ہے، حقیر راقم الحروف نے اس کتاب میں ''مشکل الآثار'' اور ''معانی الآثار'' دونوں کے رجال جمع کیے ہیں اور بقدر امکان پوری تحقیق سے ان کے حالات لکھے ہیں، نیز دونوں کتابوں میں اسماء الرجال میں جو تحریفات وتصحیفات ہوئی ہیں، ان کی تصحیح میں بھی بہت کاوش کی ہے، اب تک طبع نہیں ہوئی۔

ان مصنفات کے علاوہ ہندوستانی تالیفات میں ہم کو:

۴۶:- **رسالة في لغات المشكوة** : مصنفہ شیخ محمد طاہر پٹنی۔

۴۷:- **حاشيه مشكوة**: مصنفہ شیخ طیب برہان پوری[1]۔

۴۸:- رسالہ سودمند (جس میں تمام اقسام حدیث کو نہایت سلیقہ سے جمع کیا گیا تھا) مصنفہ شاہ میر شیرازی گجراتی[2] کے نام بھی ملتے ہیں[3]۔

نیز اسی سلسلہ کی چیز مولانا عبدالباری مرحوم کی **التعليق المختار على كتاب الآثار** ہے، جو امام محمد کی کتاب الآثار پر مبسوط حاشیہ ہے اور غالبًا اب تک طبع نہیں ہوا ہے۔

اور اس کتاب پر ایک مختصر حاشیہ مولانا محمد اسحاق ہندی ثم المدنی کا بھی ہے، جس کی نسبت مولانا عبدالباری مرحوم کا بیان ہے کہ میں نے اس کو دیکھا ہے، وہ نافع ہے اور جہاں ضرورت تھی وہیں حاشیہ لکھا ہے، مولانا اسحاق ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ میں مقیم ہو گئے تھے اور ان کی وفات وہیں ۱۳۲۲ھ میں ہوئی، مسجد نبوی میں کتاب الآثار کا درس دیا

(۱) دراصل سندھی ہیں وہیں تعلیم بھی پائی، مفتی یونس سندھی آپ کے استاذ ہیں، سندھ سے ایلچ پور (برار) اور وہاں سے برہان پور آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ۹۹۰ھ اور ۱۰۰۰ھ کے درمیان وفات ہوئی (گلزار)

(۲) حیات شیخ عبدالحق میں شاہ میر کا جو سال وفات نقل کیا گیا ہے، غلط ہے۔صاحب گلزار ابرار نے شاہ میر کا سال وفات بتایا ہی نہیں ہے۔ ہاں ان کے پوتے سید ابوتراب کی نسبت البتہ یہ لکھا ہے کہ سن ایک ہزار پانچ تک زندہ رہے اور مرآت احمدی میں ہے کہ سید شاہ میر شیرازی سلطان محمود بیگڈہ کے عہد میں ۸۹۸ھ میں جاپانیر آئے اور وہیں ان کا مزار ہے، اور ان کے پوتے یا پڑپوتے سید ابوتراب کا سال وفات ۱۰۰۳ھ ہے۔

(۳) ملاحظہ ہو حیات شیخ عبدالحق: ۴۲

کرتے تھے[1]۔

اسی سلسلہ کی ایک کتاب **معلم القاری شرح ثلاثیات امام بخاری** بھی ہے۔ یہ کتاب مولانا رضی الدین ابوالخیر عبدالمجید خاں داماد نواب وزیرالدولہ کی تصنیف ہے اور چھپ چکی ہے۔ مصنفِ کتاب، حدیث میں شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن سراج حنفی حرم مکی کے شیخ المدرسین کے شاگرد تھے، ۱۲۶۱ھ میں انھوں نے حج کیا اور اسی سال شیخ مذکور کے پاس صحیح بخاری پڑھی اور اسی سال یہ رسالہ تصنیف کیا۔

☆......☆......☆......☆......☆

(۱) مقدمہ تعلیق مختار: ۶۷

مسئلہ رویت ہلال

رویت ہلال کے باب میں مجلس تحقیقات شرعیہ کا جو فیصلہ قومی آواز مورخہ ۱۱ رمئی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا ہے، وہ مجموعی حیثیت سے قابل قبول نہیں ہے، اس کے بعض اجزاء حبر الامت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتویٰ اور اجماع فقہا کے خلاف ہیں، اس لیے دیانت کا تقاضا ہے کہ اس فیصلہ پر مجلس دوبارہ غور کرے۔

مجلس نے اس فیصلہ میں ایک عظیم الشان غلطی یہ کی ہے کہ وہ ریڈیو سے رویت ہلال کے اعلان کو یہ مانتے ہوئے کہ وہ شہادت اصطلاحی نہیں ہے بلکہ ''خبر'' ہے، یہ فیصلہ دیتی ہے کہ:

> ''ریڈیو کا غیر مسلم ملازم بھی اگر کسی ذمہ دار ہلال کمیٹی یا جماعت علما یا قاضی شریعت (بتصریح نام) کے فیصلہ کا اعلان کرے، تو یہ خبر بھی قابل تسلیم ہوگی اور صوم وافطار صوم کا حکم درست ہوگا''۔

حالانکہ فقہاء احناف کی تصریحات کے بموجب ایسی خبر قطعاً قابل قبول نہیں ہے، فقہ حنفی کی مشہور ومتداول کتاب درمختار میں ہے:

> **شهدا أنه شهد عند قاضي مصر كذا شاهدان برؤية الهلال في ليلة كذا، وقضى القاضي به و وجد استجماع شرائط الدعوى، قضى أي جاز لهذا القاضي أن يحكم بشهادتهما، لأن قضاء القاضي حجة وقد شهدوا به، لا لو شهدوا برؤية غيرهم، لأنه حكاية.**

تقریباً ایسا ہی فتح القدیر میں بھی ہے۔

طحطاوی لکھتے ہیں:

قوله لأنه حكاية أي أن هولاء الجماعة لم يشهدوا بالرؤية ولا على شهادة غيرهم، وإنما حكَوا رؤية غيرهم.

منح (۱/۱۷۷ طبع کلکتہ)

ایسا ہی فتح القدیر وعالمگیری ۱/۱۹۷ وشامی میں بھی ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

قلت: وكذا لو شهدوا برؤية غيرهم وأنَّ قاضي تلك المصر أمر الناس بصوم رمضان لأنه حكاية لفعل القاضي، وليس بحجة بخلاف قضائه (۲/۹۷ طبع مصر)۔

ان تصریحات کا خلاصہ یہ ہے:

۱:- محض خبر، یا کسی کے فیصلہ کا اعلان، بلکہ اس بات کی شہادت بھی کہ فلاں شہر میں فلاں فلاں نے چاند دیکھا ہے، صوم وافطار کے باب میں شرعاً معتبر نہیں۔

۲:- معتبر ہونے کی صرف دو صورتیں ہیں: یا تو خود ایک مسلمان عادل ہلال رمضان میں، اور دو ایسے ہی ہلال شوال میں شہادت دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے۔ یا دو عادل مسلمان شہادت دیں کہ ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو آدمیوں نے فلاں رات میں جب کہ مطلع صاف نہیں تھا - اگر مطلع صاف ہوگا، تو دو کی شہادت پر شہادت ظاہر الروایۃ میں مقبول نہ ہوگی، دیکھو شامی ص ۹۶ - چاند دیکھنے کی شہادت دی اور قاضی نے ان کی شہادت پر فیصلہ کر دیا۔

ان دو صورتوں کے علاوہ معتبر ہونے کی کوئی تیسری صورت نہیں ہے، الا یہ کہ ''استفاضۂ خبر'' کی صورت پیدا ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو کا اعلان ان میں سے کسی صورت میں داخل نہیں ہے، اس لیے کہ:

۱- اعلان کرنے والے دو مسلم عادل نہیں ہیں۔

۲- اعلان کرنے والا یہ نہیں کہتا کہ میرے سامنے چاند دیکھنے والوں نے شہادت دی۔

۳- وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ میرے سامنے قاضی نے فیصلہ کیا۔

یہاں پہنچ کر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض ترقی پسند عالم بڑی آسانی سے بلاتحقیق کہہ دیا کرتے ہیں، کہ ''فقہ حنفی'' میں ذرا تشدد ہے، مگر دوسرے ائمہ کے یہاں گنجائش ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اور کہنے والے یہ کہہ کر اپنی واقفیت کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں کرتے۔

ہم اس وقت دوسرے مکاتب فکر واجتہاد کے صرف چند حوالے پیش کرتے ہیں، آپ ان کو بغور پڑھیں اور بتائیں کہ اگر فقہ حنفی میں تشدد ہے، تو وہ تشدد دوسرے کس مذہب میں نہیں ہے!؟

سب سے پہلے شافعی مذہب کے مسلَّم امام نووی کا نام لیتا ہوں اور ان کی تصریح پیش کرتا ہوں، وہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

إنما لم يعملُ ابنُ عباسٍ بخبرِ كريب لأنَّه شهادةٌ فلا تَثبُتُ بواحد[1].

یعنی حضرت ابن عباسؓ نے کریب کی خبر پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ وہ شہادت ہے، اور شہادت کا ثبوت ایک شخص سے نہیں ہوتا۔

نووی کے کلام کی توضیح یہ ہے کہ:

حضرت ابن عباسؓ کی والدہ نے کریب کو ایک بار ملک شام میں حضرت معاویہؓ کے پاس کسی کام سے بھیجا تھا، کریب وہیں تھے کہ رمضان کا چاند آ گیا، بہت سے لوگوں نے چاند دیکھا اور حضرت معاویہؓ نے رویت کے بموجب روزہ رکھا اور رکھوایا، کریب نے خود بھی چاند دیکھا تھا، کریب کام سے فارغ ہوکر رمضان کے آخر میں مدینہ منورہ پہنچے، تو ابن عباسؓ نے چاند کی نسبت دریافت کیا؟ کریب نے کہا کہ ہم نے جمعہ کی رات میں دیکھا تھا، ابن عباسؓ نے پوچھا، تم نے خود بھی دیکھا تھا؟ کریب نے کہا: ہاں! میں نے اور دوسرے بہت سے

(۱) نووی: ۱/۳۴۸

لوگوں نے دیکھا، اور امیر معاویہؓ اور سارے لوگوں نے روزہ رکھا۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: مگر ہم نے شنبہ کی رات میں دیکھا اور ہم اسی حساب سے چلیں گے۔ کریب نے پوچھا کہ کیا آپ معاویہؓ کی رویت اور ان کے عمل کو کافی نہ قرار دیں گے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں! ہم کو آنحضرت ﷺ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔

اب غور کیجئے!

۱-کریب خود اپنی رویت کی شہادت دے رہے ہیں۔
۲-بہت سے لوگوں کا دیکھنا بیان کرتے ہیں۔
۳-امیر شام ووالی ملک کا حکم (یا عمل کہہ لیجئے) بیان کرتے ہیں۔
۴-یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں، سب نے ایسا ہی کیا ہے۔

مگر ابن عباسؓ اس میں سے کسی کو مدینہ والوں کے لیے حجت نہیں مانتے، کیوں نہیں مانتے؟ نووی کہتے ہیں کہ اس لیے کہ وہ اکیلے تھے اور اکیلے کی شہادت حجت نہیں ہے۔

اہل نظر موازنہ کریں گے تو ریڈیو کی خبر یا اس کا اعلان کریب کی خبر سے بہت ہی کمتر درجہ کی چیز ثابت ہوگی۔

۱-ریڈیو سے اعلان کرنے والا یہ نہیں کہتا کہ کسی دوسرے شہر کے قاضی یا عالم کے حضور میں یہ معلومات حاصل کیے ہیں۔
۲-وہ کریب سے گھٹیا درجہ کے شرائط شہادت کا حامل بھی نہیں ہے۔
۳-وہ یہ نہیں کہتا کہ میں نے خود اور میرے سامنے بہتوں نے دیکھا ہے۔
۴-وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ اس رویت پر خود حاکم شرع اور تمام مسلمانان ملک کو میں نے عمل کرتے دیکھا اور مشاہدہ کیا ہے۔
۵-وہ بحالت موجودہ یہ بھی نہیں کہتا کہ ہمارے پاس فلاں کمیٹی کے صدر یا ناظم نے

یا فلاں قاضی نے خبر بھیجی ہے کہ آج چاند ہوگیا، یا یہ کہ ہمارے سامنے بہت لوگوں نے گواہی دی اور ہم نے ان کی گواہی تسلیم کر کے شہر میں اعلان کرا دیا؛ لیکن اگر انتظام ہوجائے اور وہ یہ بھی کہنے لگے کہ کمیٹی یا فلاں قاضی نے میرے پاس یہ خبر بھیجی ہے، تب بھی ریڈیو سے بولنے والا محض ناقل اور حاکی ہے کہ وہ قاضی یا کمیٹی کی بات نقل کر رہا ہے، اس کی حکایت کر رہا ہے۔ تو جب کریب کی حکایت -جس کے ساتھ خود ان کی شہادت رویت بھی ہے، اور امیر معاویہؓ نیز مسلمانانِ شام کے عمل کے مشاہدہ کا اظہار بھی- حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، پھر ریڈیو کے اعلان کی اس کے مقابل میں کیا حقیقت ہے؟ اور وہ کیوں کر قابل قبول ہوجائے گا۔؟

آپ نے دیکھ لیا کہ اگر فقہاء احناف نے حکایت کو نامعتبر قرار دیا ہے، تو حضرت ابن عباسؓ اور نووی نے بھی اس کو نامعتبر ہی قرار دیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث سے مجلس تحقیقات شرعیہ کے اس تخیل کی غلطی بھی واضح ہوگئی، کہ ریڈیو کا اعلان توپ کی آواز یا ڈھنڈھورچی کے اعلان کے حکم میں ہے۔ اس لیے کہ اگر ریڈیو کا اعلان یہ حیثیت حاصل کرسکتا ہے، تو کریب کی خبر بطریق اولیٰ یہ حیثیت حاصل کرسکتی ہے، مگر حبر الامۃ نے اس کو یہ حیثیت نہیں دی۔

حدیث ابن عباسؓ کی ایک دوسری توجیہ بھی کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی جگہ کی رویت کا اعتبار صرف اس کے قرب وجوار میں ہوگا، جو جگہ قرب وجوار میں نہ ہو، وہاں کسی حال میں اس کا اعتبار نہیں۔ اس توجیہ کی رو سے بھی جو مقامات ریڈیو اسٹیشن کے قرب وجوار میں نہیں ہیں، وہاں ریڈیو کے اعلان سے چاند کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

نووی کی مذکورہ بالا تصریح اور ’’حبر الامۃ‘‘ کے فتویٰ کے بعد نووی کی ایک اور تصریح سنئے! فرماتے ہیں:

يكفي جميع الناس رؤية عدلين وكذا عدل على الأصح، هذا في الصوم، وأما في الفطر، فلا يجوز بشهادة عدل واحد على

هلال شوال عند جميع العلماء، إلا أبا ثور فجوَّزه بعدل[1]۔

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ رویتِ ہلالِ شوال کے باب میں تمام علماء اسلام -باستثنائے ابوثور- متفق ہیں کہ دو سے کم کی شہادت معتبر نہیں ہے، نہ اس کی بنا پر افطار جائز ہے۔

یہی بات حنبلی و مالکی مذہب کے علماء بھی لکھتے ہیں، ملاحظہ ہو المقنع ص ۳۵۴ اور غایۃ المنتہی ۱/۳۲۰، اور بدایۃ المجتہد، اور امام ترمذی نے تو اس پر اجماع نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

العمل على هذا الحديث عند أكثر أهل العلم، قالوا: تُقبل شهادة رجل واحد في الصيام، به يقول ابن المبارك والشافعي وأحمد، وقال إسحاق: لا يصام إلا بشهادة رجلين، ولم يختلف أهل العلم في الإفطار أنه لا يقبل فيه إلا شهادة رجلين[2].

ان عبارات کے نقل کرنے سے میرا مدعا یہ ہے:

۱- عامۂ علماء اسلام صوم و افطار میں فرق کرتے ہیں، صوم میں ایک کی شہادت یا خبر کو کافی کہتے ہیں، اور افطار میں دو عادلوں کی شہادت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

۲- امام ترمذی افطار میں دو کی شہادت کے ضروری ہونے پر اجماع نقل کرتے ہیں۔ یہ تو وہاں کا حکم ہوا جہاں رویت واقع ہوئی ہے۔

اب اس مقام کو لیجئے جہاں رویت واقع نہیں ہوئی، تو اس باب میں جس طرح ہمارے فقہا یہ لکھتے ہیں:

ثم إنما يلزم الصوم على متأخري الرؤية إذا ثبت عندهم رؤية أولئک بطريق موجب، حتى لو شهد جماعة أن أهل بلدة قد رأوا هلال رمضان قبلكم بيوم، فصاموا وهذا اليوم ثلثون

(۱) نووی: ۱/۳۴۷

(۲) سنن ترمذی: ۱/۳۵

بحسابهم ولم يرَ هولاء الهلالَ، لا يباحُ فِطرُ غدٍ ولا يُترَكُ التراويحُ في هذه الليلة، لأنهم لم يشهدوا بالرؤية، ولا على شهادة غيرهم وإنما حكوا رؤيةَ غيرهم[1].

اور درمختار میں ہے:

إذا ثبت عندهم رؤية أولئک بطريق موجب.

اس پر شامی و طحطاوی لکھتے ہیں:

كأنْ يتحمَّلَ اثنان الشهادةَ أو يشهدا على حكم القاضي أو يستفيضَ الخبرُ بخلاف ما إذا أَخبَرا أن أهل بلدة كذا رأوه لأنه حكاية[2].

اسی طرح علامہ قرطبی مالکی کہتے ہیں کہ ایک مقام کی قطعی رویت دوسری جگہ اسی وقت مقبول ہوگی جب دو شخصوں کی شہادت کے ذریعہ منقول ہو، فرماتے ہیں:

قد قال شيوخنا: إذا كانت رؤية الهلال ظاهرة قاطعة بموضع، ثم نقل إلى غيرهم بشهادة اثنين لزمهم الصوم[3].

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جہاں رویت نہیں ہوئی ہے، وہاں دوسرے شہر کی رویت کا اعتبار اسی وقت ہوگا، جب کہ اصل شاہدوں کا بیان سن کر دو عادل شہادت دیں۔ یہ نہیں کہ ایک غیر مسلم یا مسلم غیر عادل رویت کی خبر نشر کر دے، اور وہ بھی اصل شاہدوں کا بیان سن کر یا مجلس قضا میں حاضر ہو کر نہیں، بلکہ کسی کمیٹی یا قاضی کی محض اطلاع پر اعلان کر دے، تب بھی روزہ رکھ ڈالا جائے، یا عید منالی جائے۔ یہ بات نہ مذہب حنفی کی رو سے صحیح ہے، نہ باقی تین اماموں کے مذاہب کی رو سے!

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱) فتح القدیر، عالمگیری: ۱/۱۹۷

(۲) شامی: ۲/۹۹، طحطاوی: ۱/۷۱۹

(۳) فتح الباری و تحفۃ الاحوذی ۲/۳۶

۱- مذاہب ائمہ کی رو سے جہاں رویت ہوئی ہے، وہاں اس کا ثبوت دیکھنے والوں کی شہادت سے ہوگا؛ اور جہاں رویت نہیں ہوئی ہے، وہ جگہ اگر دور ہے اور مقام رویت کے توابع ولواحق میں نہیں ہے، تو اگر اصل شاہدوں کی شہادت سن کر دو عادل مسلمان شہادت دیتے ہوں، تو اس بعید جگہ میں بھی رویت کا ثبوت ہو جائے گا۔

۲- لیکن اگر شہادت سن کر شہادت نہ دیتے ہوں، تو اگر چہ وہ رویت کا عام چرچا سن کر آئے ہوں، ان کے یہ کہنے سے کہ فلاں شہر میں چاند ہوگیا ہے اور وہاں عام طور پر لوگ روزہ سے ہیں، رویت کا ثبوت نہ ہوگا۔

۳- خبر اور حکایت ثبوت رویت کے لیے کافی نہیں ہے۔

پھر حیرت ہے کہ جب ارکان مجلس بصراحت لکھتے ہیں کہ ریڈیو کا اعلان خبر ہے، شہادت نہیں ہے، تو اس تصریح کے بعد صوم وافطار کے باب میں اس کے معتبر ہونے کا فتویٰ کس طرح دیتے ہیں؟ بالخصوص افطار کے باب میں تو ان کا یہ فتویٰ اور بھی حیرت انگیز ہے، جب کہ اس کے باب میں صریح حدیث نبوی موجود ہے:

كان لا يُجيزُ شهادةَ الإفطار إلا بشهادة رجلين[۱].

آپ کہیں گے کہ مجلس نے ریڈیو کے اعلان کو توپ کی آواز اور ڈھنڈھورچی کے اعلان پر قیاس کیا ہے، تو میں عرض کروں گا کہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے، اسی لیے حضرت ابن عباسؓ نے اپنے غلام کریب کی خبر کو ثبوت رویت کے لیے کافی قرار نہیں دیا۔ قیاس صحیح نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ جس شہر میں رویت واقع ہوتی ہے، اس شہر کا ہر آدمی نہ اس بات کا مکلّف ہے کہ شاہدوں کی زبان سے چاند ہونے کی تصدیق کرائے، نہ عادۃً ایسا ہونا ممکن ہے۔ چاند دیکھنے والے حاکم، قاضی یا عالم کے پاس جاتے ہیں اور وہ شرعی طور پر مطمئن ہونے کے بعد توپ دغوا دیتے ہیں، یا ڈھنڈھورچی سے اعلان کرا دیتے ہیں، توپ کی آواز اس بات کی علامت ہے کہ چاند کا ثبوت ہوگیا، اور حاکم یا عالم نے روزہ شروع کرنے یا کل

(۱) دارقطنی وطبرانی

عید منانے کا حکم دے دیا، اور سب لوگوں کو اس کا یقینی علم ہوتا ہے کہ ایسے مواقع کے لیے حکومت یا محکمہ قضا نے یہ انتظام کر رکھا ہے، اور یہ انتظام قابل اطمینان ہے۔

اسی طرح ڈھنڈھورچی یہ ظاہر کرتا ہے کہ مجھے قاضی یا حاکم نے اس اعلان کے لیے مامور کیا ہے، اور لوگوں کو اس کا بھی علم ہے کہ اس موقع پر ایسا ہی ہوتا ہے، پھر یہ دونوں چیزیں ایک ایسے محدود حلقہ میں ہوتی ہیں کہ اگر کوئی براہ راست اطمینان کرنا چاہے، تو کر سکتا ہے؛ لیکن ریڈیو کا محکمہ ایک سرکاری محکمہ ہے، اور وہ محکمہ رویت ہلال کی شہادت لینے یا شرعی اطمینان حاصل کر کے رویت کا اعلان کرنے پر مامور نہیں ہے، وہ قاضی یا عالم کا مامور ومحکوم بھی نہیں ہے، ریڈیو آپ کو اپنی تو سب سنا دے گا، مگر آپ کی ایک نہیں سن سکتا، اپنے اطمینان کے لیے آپ اس سے کچھ پوچھنا چاہیں، یا جہاں سے خبر ملی ہے، اس سے پوچھنا چاہیں تو کچھ بھی نہیں پوچھ سکتے۔

پھر توپ یا ڈھنڈھورچی کو اعلان کا ذریعہ نہ بنایا جائے، تو ایک ہی شہر میں رویت کی خبر پہنچانا عادۃً ناممکن سا ہو جائے گا، اور پہنچانا ضروری ہے، اس لیے کہ ایک شہر کی رویت سارے شہریوں کے حق میں بلا اختلاف معتبر ہے، برخلاف دور دراز کی رویت کے، کہ اولاً تو اس کی اطلاع دور کے شہروں میں پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ ابھی تو اسی میں اختلاف ہے کہ وہ دور کے شہروں میں معتبر بھی ہے یا نہیں؟ پس ان فوارق کے ہوتے ہوئے ریڈیو کے اعلان کو توپ پر قیاس کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔؟

مجلس نے شاید اس بات پر اچھی طرح دھیان نہیں دیا کہ ریڈیو کا محکمہ جس طرح عام ملکی وسیاسی خبریں اپنے ذرائع سے حاصل کرتا ہے، اسی طرح چاند کی خبر بھی حاصل کرتا ہے، پھر جس طرح دوسری اہم اور غیر اہم خبریں نشر کرتا ہے، اسی طرح بلا امتیاز چاند کی خبر بھی نشر کر دیتا ہے؛ برخلاف توپ کے ذریعہ اطلاع دینے کے کہ اس کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا تھا، مثلاً اسلامی ملکوں میں روزانہ غروب آفتاب کے وقت رمضان میں اس طرح توپ دغتی تھی، کہ موقت روزانہ شام کے قریب دار الحکم جا کر توپ داغنے والے کو ٹھیک وقت بتاتا

تھا، اور وزیر وغیرہ [کو] اس معین وقت کی اطلاع دیتا تھا، اور وزیر کی موجودگی و نگرانی میں بتائے ہوئے وقت پر توپ داغی جاتی تھی، علامہ شامی لکھتے ہیں:

العادة أن الموقت يذهب إلى دار الحكم آخر النهار، فيعيّن له وقت ضربه، ويعيّنه أيضاً للوزير وغيره، وإذا ضربه يكون ذلك بمراقبة الوزير وأعوانه للوقت المعين[1].

اس اہتمام واحتیاط کے باوجود صرف علامہ شامی کی ذاتی رائے ہے کہ توپ کی آواز پر اعتماد کرنا چاہیئے، شامی کے خیال میں یہی ظاہر ہے (۹۴/۲)، لیکن شامی کے علاوہ دوسرے محققین غروب آفتاب اور افطار کا وقت ہوجانے کے باب میں توپ کی آواز پر اعتماد کرنے کو جائز نہیں مانتے۔ خود علامہ شامی ہی لکھتے ہیں:

ومقتضى قوله لا بأس بالفطر بقول عدلٍ صدَّقه أنه لا يجوز إذا لم يصدِّقْه ولا بقول المستور مطلقاً، وبالأولى سماعِ الطبل أو المِدفعِ الحادث في زماننا لاحتمال كونه لغيره، ولأنَّ الغالبَ كونُ الضارب غيرَ عدل، فلا بدَّ حينئذ من التحري فيجوز......فلو لم يتحرَّ لا يحلُّ له الفطر[2].

اسی کے ساتھ اس بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ شامی نے بھی اپنا یہ خیال ہر چھوٹے بڑے شہر اور آبادی کے حق میں ظاہر نہیں کیا، بلکہ ان گاؤں اور دیہاتوں کے حق میں ظاہر کیا ہے، جہاں نہ کوئی حاکم ہے، نہ قاضی، نہ والی، اور اس لیے وہاں چاند کی تحقیق اور شہادت لینے اور اس کے بموجب فیصلہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا بدرجہ مجبوری ایسے مقامات کے باشندوں کے لیے بقول صاحب درمختار اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ:

لو كانوا ببلدة لا حاكم (أي لا قاضي ولا والي كما في الفتح) فيها صاموا بقول ثقة وأفطروا بإخبار عدلين مع العلة للضرورة.

(۱) شامی: ۱۰۹/۲ (۲) ایضاً: ۱۰۹/۲

علامہ شامی نے اس قول کی شرح کرتے ہوئے لکھا:

قلت: والظاهر أنه يلزم أهل القرى الصوم بسماع المدافع أو رؤية القناديل من المصر أنه علامة ظاهرة الخ[1].

ارکان مجلس کا میرے دل میں پورا احترام ہے، مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان حضرات نے ایسی نظیر کو جس کا وجود نہ امہات کتب میں ہے، نہ متون میں، نہ متقدمین کے فتاویٰ میں، بلکہ صرف علامہ شامی کی ایک ذاتی رائے ہے، اور وہ بھی ایک مخصوص قسم کی آبادی کے لیے، محض مجبوری اور ضرورت کی بنا پر، ایسی نظیر کو ایک ایسی چیز کے لیے مقیس علیہ کیسے قرار دے لیا، جس کا تعلق بڑے بڑے شہروں سے بھی ہے، اور جہاں کوئی مجبوری نہیں ہے، اور لطف یہ ہے کہ مقیس و مقیس علیہ میں جیسی مماثلت چاہیئے، وہ مماثلت بھی موجود نہیں ہے!۔

☆......☆......☆

(۱) شامی: ۹۴/۲

اسلامی پرسنل لاء میں باب کفو

مسلم پرسنل لاء کی بنیادی کتابوں میں ہم کو ایک کفاءت کا باب (باب الاکفاء) بھی ملتا ہے، جس میں دین و مذہب کے علاوہ زوجین کا نسب اور پیشہ کی یکسانیت یا مماثلث کو بھی صحتِ نکاح کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، اور اس میں اس حد تک شدت اختیار کی گئی ہے کہ اگر کسی عورت نے غیر کفو سے نکاح کر لیا، تو بعض فقہاء اس نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں، چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"نکاح مذکور جو کہ غیر کفو سے ہوا موافق روایۃ مفتی بہا صحیح نہیں ہوا، بلکہ باطل اور ناجائز ہوا"(۱)۔

اس روایت کی نسبت گذارش ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کا قول نہیں ہے، بلکہ متاخر فقہاء کا قول ہے، جو دلائل کے خلاف ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول ہے۔

کون نہیں جانتا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت زینب -قرشیہ- کا نکاح حضرت زید ابن حارثہ -آزادشدہ غلام- سے کر دیا تھا، جو کفاءت کی فقہی تشریح کی رو سے حضرت زینبؓ کا کفو نہیں تھے۔

اب رہی یہ بات کہ اعتبار کفاءت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تو رسالہ برہان دہلی -بابت فروری ۱۹۷۳ء- میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، ہر طالب تحقیق کو اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کفاءت انعقاد نکاح یا بقائے نکاح کے لیے بنیادی شرط نہیں ہے، بلکہ اس کا اعتبار صرف جذبات کی رعایت کے لیے کیا گیا ہے۔

نفس کفاءت کے اعتبار و عدم اعتبار کے علاوہ اس کا جو معیار قرار دیا گیا ہے، وہ بھی

(۱) فتاوی دار العلوم: ۲۱۴/۸

بڑی حد تک غور طلب ہے، مثلاً نسب کے لحاظ سے کفاءت کے اعتبار کے باب میں فقہا کا یہ لکھنا کہ:

"اہل عجم میں کفاءت باعتبار نسب کے معتبر نہیں ہے، بلکہ پیشہ وغیرہ کے اعلیٰ ادنی ہونے پر مدار ہے"(۱)۔

"کفاءت میں نسب کا اعتبار عرب میں ہے، اور عجم میں پیشہ وغیرہ کا اعتبار ہے"(۲)۔

"جو قومیں عجمی ہیں ان میں کفاءت معتبر نہیں ہے"(۳)۔

اور عجمی کی تعریف یہ کی ہے کہ:

"جو کسی عربی قبیلہ کی طرف اپنی نسبت ظاہر نہ کرے"(۴)۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو ہندوستانی لوگ اپنے کو صدیقی، فاروقی، عثمانی یا ایوبی وغیرہ کہتے ہیں ان کو بے تامل عربی یا قریشی مان لیا جاتا ہے، اور ان لوگوں کو ان کا کفو قرار نہیں دیا جاتا، جو کسی عربی قبیلہ کی طرف اپنے کو منسوب نہیں کرتے۔

مثلاً ہندوستان میں ایک خاندان نعمانیوں کا ہے، جو اپنے کو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کرتا ہے، اور امام ابوحنیفہ عربی النسل نہیں ہیں، نہ ان کا نسب کسی عربی قبیلہ سے ملتا ہے، اس خاندان میں بڑے بڑے عالم اور ولی پیدا ہوئے ہیں، جیسے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی، اور ملا عبدالنبی، اور ردولی کے متعدد حضرات، مگر ان میں کوئی بھی صدیقی یا فاروقی کا کفو نہیں ہے۔

چنانچہ ایک سیدہ کا نکاح ایک نعمانی سے کیے جانے کے متعلق سوال کیا گیا، تو مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ:

(۱) فتاویٰ دار العلوم: ۲۳۳/۸
(۲) ایضاً: ۲۲۵/۸
(۳) ایضاً: ۲۸۸/۸
(۴) ایضاً: ۲۱۵/۸

''محض ابناء علماء ہونے کی وجہ سے عجمی کی کفاءت عربیہ قرشیہ کے ساتھ ثابت نہ ہوگی''(۱)۔

اسی طرح ہندوستان میں ایک برادری کمبوہ کہلاتی ہے، ان میں کے بعض لوگ اپنے کو زبیری لکھتے ہیں، اور اپنے کو شرفا میں شمار کرتے ہیں، ان میں بھی بڑے بڑے لوگ ہوئے ہیں، مفتی صاحب نے ان کو عجمی قرار دے کر پٹھان کا کفو قرار دیا ہے، حالانکہ سوال میں پٹھان کو ''شریف خاندان قوم افغان'' لکھا گیا ہے، اور کمبوہ کو لکھا گیا ہے کہ ''ان کو قوم شریف نہیں جانتے'' اور افغان کو فتاویٰ دارالعلوم میں قوم اہیر کا کفو قرار دیا گیا ہے(۲)۔ اسی طرح پٹھان اور راجپوت کو باہم کفو مانا گیا ہے، اور (ج ۸ ص ۲۱۵) میں لکھا گیا ہے کہ عجمی عربیہ کا کفو نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر کوئی بالغہ عورت جو نسباً صدیقی یا فاروقی وغیرہ ہو، کسی نعمانی، یا افغانی یا قدوائی، یا کمبوہ وغیرہ سے بلا اجازت ولی نکاح کرے، تو کفاءت نہ ہونے کی وجہ سے نکاح باطل ہوگا۔

حالانکہ یہ بات صحیح حدیثوں کے سراسر خلاف ہے، **لا فضلَ لعربيٍ على عجمي ولا لعجمي على عربي...... إلا بالتقوى**(۳)۔

دوسری بات یہ ہے کہ عربی ہونے کے لیے صرف انتساب کا جو ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو صدیقی یا فاروقی ہونے کا دعویٰ کردے، وہ صدیقی اور فاروقی ہے۔ یہ سراسر تحکم اور بے انصافی ہے۔

کوئی دعویٰ بلا دلیل کے قابل تسلیم نہیں ہے، اور ثبوت و دلیل کا حال یہ ہے کہ جو لوگ بھی اپنے کو صدیقی یا عربی النسل ہونے کے ثبوت میں شجرے پیش کرتے ہیں، عموماً ان کے شجرے جھوٹے ہیں، اور جب شجرے جھوٹے ہیں تو ان کا عربی النسل ہونا باطل ہے، لہٰذا وہ

(۱) فتاوی دارالعلوم: ۲۰۸/۸ (۲) ایضاً: ۲۲۸/۸
(۳) مسند احمد و طبرانی

بھی عجمی ہیں، اور ہر عجمی ان کا کفو ہے، بشرطیکہ دوسری کوئی دلیل وجہ کفاءت سے مانع نہ ہو۔

میں اس وقت تمام شجروں پر بحث کرکے بات کو طول دینا نہیں چاہتا، سردست صرف ایک شجرہ کا حال لکھتا ہوں:

دہلی کی صدیقی برادری کا جو شجرہ دوڑ دھوپ کر کے تیار کیا گیا ہے، اس میں بتایا گیا ہے، کہ یہ برادری حضرت ابوبکرؓ کے پوتے اور عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے بیٹے قاسم کی اولاد سے ہے۔ مشہور ہے کہ جھوٹ بولنے کے لیے بھی سلیقہ چاہئے۔ جن لوگوں نے یہ شجرہ بنایا ہے ان کو جھوٹ بولنے کا بھی سلیقہ نہیں تھا، سلیقہ ہوتا تو انساب اور تاریخ کی کتابیں سامنے رکھ کر اور یہ سوچ کر جھوٹ بولتے کہ ان کتابوں سے ہمارا جھوٹ ظاہر تو نہیں ہوتا۔

انساب کی کتابوں میں ایک کتاب ابن حزم کی ''**جمهرة أنساب العرب**'' ہے، اور ایک کتاب مصعب زبیری کی ''نسب قريش'' ہے، ان دونوں میں عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی تمام اولاد ذکور واناث کا نام بنام ذکر ہے، مگر ان میں قاسم نام کا کوئی شخص نہیں ہے، بس اسی ایک مثال سے ہندوستانی شرفا کے دعوائے شرافت، اور ان کے صدیقی و فاروقی اور عربی النسل ہونے کی حقیقت سمجھ لیجئے۔

اسی شجرہ میں دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ سفیان ثوری کو عیینہ کا بیٹا لکھا گیا ہے، حالانکہ سفیان ثوری کے باپ کا نام سعید تھا۔

اور تیسرا جھوٹ یہ ہے کہ سفیان ثوری کا نسب حضرت ابوبکرؓ سے ملایا گیا ہے، حالانکہ سفیان کے نام کے ساتھ ثوری کی نسبت موجود ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ قبیلہ ثور سے تھے جو ہمدان کی ایک شاخ ہے، یا عبد مناۃ کی اولاد سے ہے، بہرحال وہ صدیقی تو در کنار قریشی بھی نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں چوتھا جھوٹ یہ لکھنا ہے کہ اس نسب نامہ کو میں نے تاریخ ''تنویر الاخبار و ملوک الاخیار'' سے لکھا ہے، حالانکہ اس نام کی کوئی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو اس کو سچ مانتا ہو بتائے کہ یہ کتاب کس زبان میں ہے؟ کس کی تصنیف ہے؟ مصنف

معروف ہے یا غیر معروف؟ اور کتاب کس شہر کے کس کتب خانہ میں ہے؟

حیرت ہے کہ ایک آدمی جھوٹ بول کر اپنے کو صدیقی کہلائے تو وہ شریف ہوگیا، اور دوسرا جھوٹ سے پرہیز کر کے یہ کہے کہ میں پشتہا پشت سے مسلمان ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ میرے باپ دادا عرب سے آئے تھے یا یہیں مسلمان ہوئے، تو وہ شرافت سے گر گیا، وہ صدیقیت کا باطل دعویٰ کرنے والے کا کفو نہیں ہوسکتا۔

یہ خیال نہ کیجئے گا کہ شرافت کے بے بنیاد دعویٰ کی بس یہی ایک مثال ہے، جی نہیں! ایسی ایسی بیسیوں مثالیں ہیں، چنانچہ گوپامئو میں فاروقیوں کا ایک خاندان تھا، جو اپنا نسب ابراہیم بن ادہم مشہور ولی کے واسطے سے حضرت عمر تک پہنچاتا تھا، مولانا عبدالحی -علی میاں کے والد- نے اس باب میں لکھا ہے کہ اس میں کئی وجہ سے قدح ہے، منجملہ ان وجہوں کے ایک وجہ یہ ہے کہ ابراہیم فاروقی تو درکنار وہ قریشی بھی نہ تھے، وہ یا تو بکر بن وائل کے قبیلہ سے تھے، یا قبیلۂ عجل سے تھے۔

مولانا نے دو اور خاندانوں کی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ ابراہیم بن ادہم کے واسطہ سے اپنے کو عمری لکھتے ہیں، مگر علمائے انساب کے نزدیک یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے (دیکھو نزہۃ الخواطر: ۶۸/۳ و ۱۲۷/۳)

لہٰذا مسلم پرسنل لا کا جائزہ لینے والے محقق علماء مسئلہ کفاءت پر قرآن وحدیث وفقہ کی روشنی میں از سر نو غور کریں، اور ان غلطیوں کی اصلاح کریں، جو ہمارے ہندوستانی مفتیوں نے پھیلا رکھی ہے۔

۱:- مثلاً کفاءت کا اعتبار اس لیے کیا جاتا ہے کہ:

إنَّ انتظامَ المَصالِحِ إنما يكون بين المُتَكافِئِين عادة[1]. یعنی گھریلو مصالح کا منظّم ہونا برابری کے جوڑوں میں عادۃً ممکن ہے۔

تو عورت کی جانب سے بھی کفاءت کا اعتبار ہونا چاہئے کہ تکافُؤ -یعنی دونوں

(۱) ہدایہ: ۲۹۹/۳

جانب سے برابری- کا تحقق اسی وقت ہوگا، نیز جب یہ بات ایک حقیقت تسلیم کرلی جائے گی کہ شوہر شریف اور عورت رذیل ہے، تو عورت ہمیشہ اس رنج وکوفت میں مبتلا رہے گی کہ شوہر مجھ کو رذیل اور کمین تصور کرتا ہے، اور وہ میری عزت نہیں کرتا، اور بیوی کی حیثیت سے میں جس احترام کی مستحق ہوں اس میں کوتاہی کرتا ہے، تو ایسی حالت میں مصالح کا انتظام کیوں کر ممکن ہے۔

۲:- جب یہ حقیقت ہے کہ دین وتقویٰ کے علاوہ شرافت ورذالت کا ہر معیار خیالی اور عرفی ہے، تو جس صورت میں مرد وعورت دونوں اس خیالی معیار کو غلط سمجھتے ہوں، اور اس کو نظر انداز کر کے نکاح پر آمادہ ہوں، اور نکاح کرلیں، تو اس کو صحیح ومنعقد قرار دیا جائے، ولی کی رضامندی کی شرط نہ لگانی چاہئے، بلکہ ولی کو حکم دینا چاہئے کہ وہ عورت کی خواہش کی موافقت کرے، کیونکہ وہ ایک غلط ذہنیت کو عملاً مٹانے کے لیے آمادہ ہوئی ہے۔

۳:- جب یہ واقعہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا اصل مذہب یہ ہے کہ غیر کفو میں نکاح صحیح ومنعقد ہوجاتا ہے، لیکن ولی کو فسخ کرانے کا اختیار باقی رہتا ہے، اور یہی روح شریعت کے مطابق بھی ہے (**وَلا فَضلَ لِعَرَبيٍّ عَلَى عَجَميٍّ ولا لِعَجَميٍّ عَلَى عَرَبيٍّ إلا بِالتَّقْوَى**) تو متاخرین کی رائے پر فتویٰ دینا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ وہ رائے اسی خیالی اونچ نیچ کے تصور پر مبنی ہے جو روح شریعت کے منافی ہے۔

۴:- جب فقہائے محققین نے بہت شد ومد کے ساتھ لکھا ہے کہ شرفِ علم شرفِ نسب پر فوقیت رکھتا ہے، اور ایک عالم دین سیدہ کا کفو ہوسکتا ہے، تو اس پر فتویٰ دینے میں پس وپیش کیوں ہے؟ حالانکہ اس پس وپیش سے سنت مطہرہ کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سید اولاد آدم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید سے کردیا تھا، حالانکہ سماج میں اونچ نیچ کا جو تصور پایا جاتا تھا، اس کی بنا پر حضرت زینب ابتداءً آمادہ نہ تھیں، مگر آنحضرت ﷺ کو یہ عرفی تفریق مٹانی تھی، اور اس غلط خیال کو دماغوں سے نکالنا تھا، اس لیے زینب کو جو عرفی شرافت

کے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں، حضرت زیدؓ کے نکاح میں دے دیا، جو جاہلی اور عرفی نقطۂ نظر سے بہت ہی پست اور ادنیٰ درجہ کے تھے۔

اسی طرح حضرت مقدادؓ بن اسود جو اصلاً بہرانی یا کندی تھے، قریش سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا (اور کندہ کے لوگ بافندگی کا پیشہ کرتے تھے) ان کا نکاح آنحضرت ﷺ نے اپنی چچا زاد بہن ضباعہ سے کر دیا تھا۔ قصہ یہ پیش آیا تھا کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف - جو قریشی اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے - اور مقدادؓ کہیں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے باتوں باتوں میں مقداد سے کہا کہ تم نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ مقدادؓ نے کہا کہ پھر آپ اپنی لڑکی سے میرا نکاح کر دیجئے، اس پر عبدالرحمٰنؓ برہم ہو گئے اور ان کو بہت سخت وسست کہہ ڈالا، حضرت مقدادؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی، سرکارؐ نے فرمایا کہ اچھا میں تمہارا نکاح کیے دیتا ہوں، چنانچہ آپؐ نے اپنی چچا زاد بہن سے ان کا نکاح کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کی اسی سنت پر عمل پیرا ہو کر قرن اول کے مسلمانوں نے حضرت بلال حبشی - غیر عربی - اور حضرت سلمانؓ فارسی کا نکاح عربی عورتوں سے یکے بعد دیگرے پڑھوایا، اور اس اصول کو تسلیم نہیں کیا کہ عربی عورت کا کفو عجمی مرد نہیں ہو سکتا۔

۵:- پیشہ کو بنیاد کفاءت قرار دینے کی صورت میں اس بات کو صاف کرنا ضروری ہے کہ جو آدمی مثلاً خود حجامی کرتا ہے وہی حجام ہے؟، یا جس کا باپ یا دادا یا پردادا حجامی کرتا تھا مگر یہ مثلاً اسکول کی ماسٹری کرتا ہے تو یہ بھی حجام کہلائے گا؟ یا ایک آدمی کی پانچ پشت اوپر کے لوگ کپڑا بنتے تھے، مگر چار پشت سے اس کے خاندان کے لوگ بافندگی چھوڑ کر کاشتکاری بزازی، مدرسی، ماسٹری، کلرکی، وکالت، یا منصفی اور ججی کرتے ہیں، تو کیا یہ سب بافندہ شمار ہوں گے۔؟

اگر جواب اثبات میں ہے، اور پیشے کی دناءت ایسا متعدی مرض ہے کہ پشتہا پشت تک اس کا اثر نہیں جاتا، اور چھوڑنے کے بعد بھی رذالت کا داغ نہیں مٹتا، تو پھر ان ہزاروں سیدوں، صدیقیوں، فاروقیوں، اور پٹھانوں کو بھی رذیل شمار کرنا چاہئے، جو خود یہ پیشہ

کرتے ہیں، اور ان کو ان کی ہی برادری کے ان اشخاص کا کفو نہ ہونا چاہئے جو یہ پیشہ نہیں کرتے، اور ان کا آپس میں نکاح صحیح نہ ہونا چاہئے۔ اگر کہا جائے کہ صدیقی، فاروقی، وغیرہ چوں کہ صاحب نسب ہیں، اس لیے وہ ذلیل سے ذلیل پیشہ بھی کریں تو پیشہ کی وجہ سے ان میں رذالت پیدا نہ ہوگی، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر کوئی پیشہ نہ ذلیل ہے نہ اس سے رذالت پیدا ہوتی ہے، اصل چیز نسب ہے، نسب ہو تو کوئی پیشہ ذلیل نہیں، نسب نہ ہو تو بہت سے پیشے رذالت کا سبب بنتے ہیں۔

کیا یہ منطق صحیح ہے؟ کیا یہ کوئی شرعی نظریہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا اس پر کسی اسلامی قانون کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شامی وغیرہ میں مصرح ہے کہ پیشہ کے لحاظ سے کفاءت جس طرح عجمیوں میں معتبر ہے، اسی طرح عربیوں میں بھی معتبر ہے: **وحينئذ فتكون معتبرة بين العرب والعجم**[1].

۶:- اسی طرح یہ جو مشہور ہے کہ عجمی اگر عالم بھی ہو تو عربیہ کا کفو نہیں ہوگا، یہی ظاہر الروایۃ ہے، تو یہ بالکل غلط ہے، اور ظاہر الروایۃ ہونے کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے اور محیط و بزازیہ وفیض و جامع الفتاویٰ وغیرہ میں جزم و یقین کے ساتھ مذکور ہے کہ شرف علم شرف نسب سے بڑھ کر ہے، ایسا ہی صاحب نہر فائق نے بھی لکھا ہے، اور اسی کو کمال ابن الہمام نے پسند کیا ہے۔ لہٰذا کوئی عجمی عالم خواہ وہ خیاط ہو، یا بزاز یا تاجر یا بافندہ، ایک سیدانی کا بلا شبہ کفو ہے، اور سید اولاد آدم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا عمل اس کی دلیل ہے۔

☆......☆......☆

(۱) شامی: ۲/۳۳۱

مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مطالبہ

اسلام کے ساتھ دوستی یا دشمنی

مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی ضرورت کن لوگوں کو محسوس ہو رہی ہے؟ اور کیوں ہو رہی ہے؟ ان دونوں باتوں کو سمجھنے کے لیے وہ دو مراسلے کافی ہیں، جو قومی آواز میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مراسلوں میں سے ایک میں بڑی برہمی کے ساتھ کہا گیا ہے کہ: ''یہ بات سرے سے غلط ہے کہ مسلم پرسنل لا کا ہر قانون اللہ اور رسول کا بنایا ہوا ہے''۔ اس کو لکھنے کا اس کے سوا اور کیا منشا ہو سکتا ہے کہ اگر ہر قانون اللہ اور رسول کا بنایا ہوا ہوتا تو اس میں ترمیم کا مطالبہ درست نہ ہوتا۔

اس پر گذارش یہ ہے کہ اگر ہر قانون اللہ اور رسول کا بنایا ہوا نہیں ہے تو نہ ہو، کچھ قانون تو اللہ اور رسول کے بنائے ہوئے یقیناً ہیں، مثلاً جوازِ تعددِ ازدواج، پھر اس کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیوں ہو رہا ہے، اور اس کے خلاف عورتوں کو کیوں بھڑکایا جا رہا ہے، اور ایک دوسرے مراسلہ نگار صاحب اس بارے میں عورتوں کی غیرت وحمیت کو کیوں چیلنج کر رہے ہیں؟ فرماتے ہیں عورتوں کو خصوصیت کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ وہ سوکن گوارا کر سکتی ہیں، اپنے شوہر کو دوسری عورت سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی بخوشی اجازت دے سکتی ہیں؟

ان فقروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے نزدیک قانون شریعت یا قرآن کوئی چیز نہیں ہے، اور مسلمان اپنی خواہش اور پسند کے مکلّف ہیں، کسی الٰہی قانون کے پابند نہیں ہیں، اور یہیں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ترمیم کا مطالبہ کس قسم کے ذہنوں کی

پیداوار ہے۔ اگر اسلامی ذہن وفکر ہو تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ تعدد ازدواج لازمی نہیں اختیاری قانون ہے، اور بعض وقت قومی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت ضروری اور بعض حالات میں خود عورتوں کے حق میں نہایت مفید، اور ان کی صحت اور شوہر سے تعلق قائم رہنے کے لیے لازم ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں میں آج عملاً وہ نہیں کے برابر ہے۔

ایسے قانون کو لے کر جذباتی تقریریں کرنا، اور اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو برانگیختہ کرنا، کیا نیک نیتی پر اور اسلام دوستی پر مبنی ہے؟ اگر اسلام دشمنی کا جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو تعدد ازدواج کی وجہ سے عورتوں کی مزعومہ مظلومیت پر آنسو بہانے والے سوچتے کہ شریعت کا کوئی قانون عورتوں کو سوکن کی موجودگی میں نکاح پر مجبور نہیں کرتا، نیز عورت یا ولی کی رضامندی کے بغیر کوئی عقد نکاح وجود پذیر نہیں ہو سکتا، اس کے باوجود بھی کسی عورت نے منکوحہ کی موجودگی میں کسی شخص سے نکاح کر لیا، تو یہ قانون کا قصور ہے یا خود عورت کا؟

ایمان نہیں تو عقل وانصاف کی بات یہ ہے کہ اگر تعدُّد سے کوئی مصیبت پیدا ہوئی ہے، تو یہ مصیبت خود عورت نے مول لی ہے، اس لیے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ قانون کو ممنوع قرار دینے کے بجائے اگر واقعی تعدد کی وجہ سے عورتوں کی حق تلفی ہو رہی ہے، تو اناث وذکور کی اصلاحی انجمنیں عورتوں کو اپنا حق استعمال کرنے کی تلقین کریں؛ اور اگر اس کے بعد بھی وہ ایک منکوحہ کی موجودگی میں کسی سے نکاح کر لیں، تو آپ کیوں مدعی سست گواہ چست کے مصداق بن رہے ہیں؟۔

اس مثال سے یہ بات بہت کھل کر سامنے آ گئی کہ ترمیم کا مطالبہ کرنے والے کچھ لوگ ایسے ہیں جو قرآنی احکام وقوانین کو انسانی قوانین سے مطلقاً بالاتر نہیں سمجھتے، اور وہ ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں، جو انسانوں کے طبع زاد قوانین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اور اظہر من الشّمس ہے کہ یہ دعوت اسلام کے منافی ہے۔

یہ تو ایک بات ہوئی، ایک دوسری بات بھی بہت قابل توجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ترمیم کا مطالبہ کرنے والوں کا مطالعہ نہایت ناقص اور ان کے معلومات بہت ہی محدود ہیں، اس

لیے ان کا مطالبہ ناواقفیت کا نتیجہ ہے، مثلاً یہی صاحب جو مسلم خواتین کو تعداد ازدواج کے خلاف بھڑکا رہے ہیں، ان کی واقفیت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مضمون میں نہایت دیدہ دلیری سے فرماتے ہیں: ’’عام مسلمانوں کا قانون از روئے دین یہ ہے کہ بیٹے کو دس آنہ بیٹی کو چھ آنہ ہے‘‘۔

حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور عام مسلمانوں کا ہرگز یہ قانون نہیں ہے، مسلمانوں کا قانون بالکل واضح لفظوں میں قرآن پاک میں بتایا گیا ہے: ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (یعنی بیٹے کا حق دو بیٹیوں کے حصے کے برابر ہے) پس اگر صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو، تو بیٹے کو ۱۰ ۲/۳ اور بیٹی کو ۵ ۱/۳ ملے گا، اور اگر ایک بیٹا دو بیٹیاں ہوں تو بیٹے کو ۸، اور بیٹیوں کو چار چار آنے ملیں گے اور اگر دو کے بجائے تین بیٹیاں ہوں تو بیٹیوں کو ۲۰-۲۰ نئے پیسے (تین آنے سے کچھ زائد) اور بیٹے کو ۴۰ پیسے ملیں گے (یعنی چھ آنے سے اڑھائی نئے پیسے زائد)۔

یہ تین صورتیں مثال کے طور پر آپ کے سامنے ہیں، ان میں سے کسی ایک میں بھی بیٹے کو دس آنہ اور بیٹی کو چھ آنہ نہیں ملتا، اس کے علاوہ کوئی بھی مثال آپ لے لیجئے مراسلہ نگار کی بات صحیح نہیں ہوسکتی۔

اب ذرا سوچئے کہ جو لوگ اسلامی پرسنل لا سے اتنے نابلد ہوں، ان کو ترمیم کے مسئلہ پر قلم اٹھانے کا کیا حق ہے، اور ان کا کوئی مطالبہ اس باب میں کہاں تک علم و تحقیق پر مبنی ہوسکتا ہے۔

اسی طرح مراسلہ نگار کی زبردست ناواقفیت کا ایک ثبوت ان کا یہ لکھنا بھی ہے: ’’خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے نبی کی وراثت کو تسلیم کرلیا‘‘۔

حالانکہ اس دعویٰ میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے، وہ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کوئی مستند حوالہ پیش نہیں کرسکتے، انھوں نے شیعوں کی کسی مناظرانہ کتاب میں کسی شیعہ عالم کا یہ دعویٰ پڑھ لیا ہوگا اور اس عالم کے اصلی ماخذ کی نہ ان کو خبر ہوگی، اور نہ اصلی ماخذ کو پڑھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہوگی، بہرحال یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ صحیح

بات یہ ہے کہ باغ فدک کی آمدنی کو منشائے نبوی کے مطابق تقسیم کرنے کا اختیار پہلے حضرت عباسؓ و علیؓ کو ملا تھا، اس کے بعد تنہا حضرت علی متولی ہوئے، پھر حضرت حسن اور ان کے بعد حضرت حسینؓ، پھر علیؓ بن حسینؓ، پھر ان کے بعد حسن بن حسن، پھر زید بن حسن، پھر عبداللہ بن حسن، اور ان کے بعد عباسی خلفاء کے قبضہ میں آگیا، عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں ان کو باغ فدک کا وارث و مالک ہرگز قرار نہیں دیا تھا۔

اسی طرح یہ کہنا بھی نہایت گمراہ کن بیان اور مغالطہ ہے، یا سخت ناواقفیت کہ ’’جو خاندانی قوانین مغلوں کے دور حکومت میں رائج تھے، ان کو تھوڑے فرق کے ساتھ انگریزوں نے مسلمانوں کے لیے قانون کا درجہ دے دیا، اسی کو مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے‘‘۔

کیونکہ اگر یہی مسلم پرسنل لا ہے تو تعداد ازدواج کو مسلم پرسنل لا میں شامل کرکے اس میں ترمیم کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اور قرآنی قانون وراثت میں ترمیم کرکے لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر حق دلوانے کی بات کیوں کی جاتی ہے؟ اور اس کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مطالبہ کیوں قرار دیا جاتا ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ مراسلہ نگار نے مسلم پرسنل لا کی صحیح تعریف نہیں کی ہے، جس چیز کو وہ مسلم پرسنل لا کہہ رہے ہیں وہ مسلمانوں کے لیے انگریزی دور حکومت کے قوانین ہیں، ان قوانین میں جو جو قانون قرآن و حدیث یا خصوصی ماہرین کی تصریحات کے خلاف ہوں، ان میں ترمیم کرکے قرآن و حدیث یا اسلامی قانون کے مطابق بنانے کا ضرور مطالبہ کیجئے، مگر اس کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے نام سے یاد نہ کیجئے، اس لیے کہ یہ تعبیر فی حد نفسہ غلط ہونے کے ساتھ گمراہ کن ہے۔

مراسلہ نگار کا فیضی کے کتابچہ کو ایک اچھا کتابچہ کہنا بھی نہایت سطحی قسم کی اور شاید عقیدت مندانہ بات ہے، ورنہ جس کتاب کا مصنف اجتہادی مسلک اور شریعت میں فرق نہ کرسکتا ہو اور حنفی شریعت و فاطمی شریعت کا لفظ استعمال کرتا ہو، اور جو یہ بھی نہ جانتا ہو کہ حنفی فقہ ہی نہیں بلکہ ہر اجتہادی مسلک کے رو سے ایک بیوہ عورت اپنے شوہر کے املاک میں حصہ پانے کی مستحق ہے، اس کی کتاب کو کسی طرح اچھا کتابچہ نہیں کہا جاسکتا۔ ☆......☆

سید الشہدا کی تحقیق

ہندوستان میں سید الشہدا کا لفظ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ بولا اور لکھا جاتا ہے، اور یہ استعمال ناواقفوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں گرفتار ہیں۔ چوں کہ کسی صحابی کے نام کے ساتھ اس قسم کے الفاظ کا استعمال عموماً مذہبی روایات پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ لوگ سید الشہداء کے لقب کو بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں مذہبی روایات اور نصوص نبویہ سے ثابت سمجھتے ہوں۔ بنابریں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، کہ روایات میں سید الشہداء کا لفظ آں جناب کے لیے وارد ہے یا نہیں۔ نیز جس طرح شہید کے شرعی مفہوم کے تعین میں ماوشما کی رائے کو مطلق دخل نہیں ہے، بلکہ قرآن کریم اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے اس کا مفہوم متعین ہوگا، یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ ہم یا آپ شہید کا کوئی معنی تجویز کر کے جس پر وہ معنی صادق آئے اس کو شہید قرار دینے لگیں، بلکہ شہید کے جو معنی قرآن کریم یا احادیث طیبہ میں مذکور ہیں صرف اسی کے لحاظ سے کسی کو عنداللہ شہید کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کسی شہید کی نسبت یہ فیصلہ کرنا کہ وہ تمام شہیدوں کا سردار ہے، ماوشما کی رائے وقیاس کی دسترس سے باہر ہے۔ جس بے نیاز کی راہ میں سر کٹانے کا نام شہادت ہے، وہی اور تنہا وہی اس بات کو جانتا ہے کہ کس جاں باز کا خون سب سے زیادہ قیمتی اور کس سرباز کا سر سیادت شہداء کے تاج کا مستحق ہے، اور وہی اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ کون سی سعید روح اس کی بارگاہِ مقبولیت میں تمام شہیدوں کی سرداری کے اعزاز سے سرفراز ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ خدائے بے نیاز کے اس فیصلے کا علم امت محمدیہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِعلام واِخبار کے بدون ناممکن ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اخبار نبویہ میں اس فیصلہ کی جستجو

کی جائے، نظر بریں ناچیز نے کتب احادیث وسیر کی ورق گردانی کی اور فرصت حاضرہ میں جن کتابوں کا مطالعہ ہو سکا، کیا۔ اس طویل مطالعہ کے بعد میں جن نتائج پر پہنچا ہوں، ان کو اہل علم کے سامنے اس غرض سے پیش کرتا ہوں، کہ وہ بھی اس طرف توجہ فرمائیں۔

۱:- احادیث نبویہ میں صرف دو صحابیوں کے لیے سید الشہداء کا لفظ وارد ہوا ہے: ایک حمزہ رضی اللہ عنہ، دوسرے حضرت بلال رضی اللہ عنہ۔ چنانچہ مستدرک حاکم سوم (ص۱۹۹) میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سيد الشهداء عند الله تعالى يوم القيامة حمزة.

قیامت کے دن خدا کے پاس تمام شہیدوں کے سردار حمزہ ہیں۔

اس حدیث کی نسبت حاکم نے لکھا ہے:

هذا حديث صحيح الإسناد.

یعنی یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔

اور ذہبی نے بھی اس کو صحیح لکھا ہے۔

اور اسی مستدرک جلد دوم کے (ص۱۹۲) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ:

إن أفضل الخلق يوم يجمعهم الله الرسلُ، وأفضل الناس بعد الرسل الشهداء، وإن أفضل الشهداء حمزة بن عبدالمطلب.

بے شک جس دن اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو یکجا کرے گا، اس دن سب سے افضل رسول ہوں گے، اور رسولوں کے بعد شہداء، اور شہیدوں میں سب سے برتر حمزہ ہوں گے۔

اور کنز الاعمال جلد ششم (ص۱۷۱) میں شیرازی کی کتاب الألقاب کے حوالہ سے بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ منقول ہے:

حمزة سيد الشهداء يوم القيامة.

اور اسی میں بحوالہ معجم کبیر للطبرانی بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ منقول ہے:

سيد الشهداء عند الله يوم القيامة حمزة بن عبد المطلب.

اور امام زیلعی کی نصب الرایہ (۲/۲۵۰) میں ہے:

والمعروف في قوله عليه السلام سيد الشهداء أنه حمزة (الى قوله) ورد نحو ذلك في بلال، رواه البزار في مسنده من حديث زيد بن أرقم.

(یعنی معروف یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہ ؓ کو سید الشہداء فرمایا ہے...... اور اسی کے مثل حضرت بلال کے باب میں بھی وارد ہوا ہے، جس کو بزار نے اپنے مسند میں حضرت زید بن ارقم سے روایت کیا ہے۔

اور ایسا ہی حافظ ابن حجر کی درایہ میں بھی ہے۔

امام زیلعی نے مسند بزار کی وہ حدیث، جس میں حضرت بلال کو سید الشہداء فرمایا گیا ہے، نقل کر کے لکھا ہے:

وينظر بقية السند والمتن. یعنی باقی سند اور متن دیکھ لی جائے۔

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ حضرت حمزہؓ کے حق میں سید الشہداء کا لفظ متعدد روایات میں –جن کی ماہرین فن نے تصحیح کی ہے– وارد ہوا ہے، اور حضرت بلالؓ کے حق میں ایک روایت سے اس کا ثبوت ہوتا ہے، لیکن وہ اس پایہ کی نہیں ہے۔

۲:– ان دو صحابیوں کے علاوہ اور کسی کے باب میں یہ لفظ میری نگاہ سے کسی روایت میں نہیں گزرا، اور اگر ''نصب الرایہ'' و ''درایہ'' کے ان مقامات کو غور سے پڑھیے جن کا میں نے حوالہ دیا ہے، تو ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں وسیع النظر محدثوں کی نگاہ سے بھی کوئی صحیح یا ضعیف روایت نہیں گزری ہے، جس میں حضرت حمزہ و بلال رضی اللہ عنہما کے علاوہ کسی تیسرے صحابی کے نام کے ساتھ سید الشہداء کا لقب وارد ہوا ہو، ورنہ یہ حضرات اس روایت کا ذکر ضرور کرتے اس لیے کہ محل اس کا مقتضی تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ریحانۃ الرسول جگر گوشۂ بتول حضرت حسین ؓ کے نام نامی کے ساتھ سید الشہداء کا استعمال کسی مذہبی روایت یا نص نبوی پر مبنی نہیں ہے۔ تحقیقی طور پر تو

معلوم نہیں کہ کب اور کس بنیاد پر اس کی ابتدا ہوئی، لیکن بظاہر اس کی ابتداء ان لوگوں نے کی ہے، جن کے نزدیک حب اہل بیت کے معنی یہ ہیں کہ بے سروپا اور بے بنیاد فضائل ومناقب ان کے لیے ثابت کیے جائیں، اور دوسرے تمام صحابہ کے مدائح ومفاخر کا انکار کر کے ان سب کو زبردستی اہل بیت پر چسپاں کیا جائے؛ حالانکہ محبت وتعظیم کا یہ عنوان حد درجہ معیوب اور اظہار عظمت کا یہ طریقہ اہل خرد کے نزدیک بے حد مذموم ہے۔ سچی محبت اور حقیقی تعظیم یہ ہے کہ جتنی باتیں ثابت ہیں، صرف وہی ثابت کی جائیں، اور اظہار عقیدت میں دائرۂ شریعت اور نصوص نبویہ کے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے، پھر ہوتا یہ ہے کہ غالی لوگ ایک بات پیدا کرتے ہیں، اور دوسرے حضرات جو جادۂ صواب پر ہیں، چونکہ جملہ واجب التعظیم بزرگوں سے عقیدت رکھتے ہیں، اس لیے اس کو بے تأمل قبول کر لیتے ہیں اور سادگی کی وجہ سے یا انتہائی رواداری پسند ہونے کی بنا پر اس طرف ان کی توجہ بھی نہیں ہوتی کہ اس ایجاد نو کی تہہ میں کس قسم کے جذبات کام کر رہے ہیں، اور اس سے کیا کیا شرعی مفاسد لازم آتے ہیں یا لازم آنے کا امکان ہے۔

مثال کے طور پر ''امام'' کے لفظ کو لے لیجئے کہ بہتیرے سنی حضرات اس لفظ کو حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے ناموں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ یہ بے شبہہ شیعوں کی ایجاد ہے، اور وہ اپنے مزعومہ مسئلہ امامت کی بنیاد پر ان حضرات کو ''امام'' لکھتے ہیں، جس کے رو سے یہ حضرات شیعوں کے نزدیک معصوم ومفترض الطاعۃ ہیں اور اس معنی کے لحاظ سے کسی سنی کے لیے کسی غیر نبی پر ''امام'' کا اطلاق جائز نہیں ہے۔

مگر سنی حضرات نے صرف اسی بنا پر کہ حضرات حسنینؓ بھی مثل دیگر صحابہ کے ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں، امام کے معنی مطلق پیشوا ومقتدا کے لے کر ان حضرات کو امام لکھنا شروع کر دیا؛ حالانکہ اگر رواداری کے مظاہرہ کا جذبہ غالب نہ ہوتا تو یہ بات غور طلب تھی کہ حضرات حسنینؓ کے متعلق پیشوا اور مقتدا ہونے میں تو بے شبہہ کوئی کلام نہیں ہے اور اس معنی کے لحاظ سے یقیناً وہ امام ہیں، لیکن چونکہ حضرات شیعہ اس لفظ کو حضرات حسنینؓ کے

حق میں ایک ایسے معنی کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں، جس کی شریعت مطہرہ قطعاً اجازت نہیں دیتی، اس لیے ان کے حق میں اس لفظ کو استعمال کرنے سے سخت التباس واشتباہ کا اندیشہ ہے، اور مخالفین اس التباس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ناواقفوں کو مغالطہ دے سکتے ہیں۔ ہاں اگر کسی ایسے شخص کے حق میں یہ لفظ بولا جائے جس کو مخالفین معصوم ومفترض الطاعۃ نہیں سمجھتے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ یہاں اصلاً کسی التباس ومغالطہ کا امکان نہیں ہے۔

اسی قبیل سے ان حضرات کے حق میں ''علیہ السلام'' کا استعمال بھی ہے، جو بہتیرے سنیوں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، حالانکہ یہ حضرات شیعہ کا مخصوص شعار ہے کہ وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی طرح اپنے مزعومہ ائمہ معصومین کے لیے بھی ''علیہ السلام'' کا استعمال کرتے ہیں۔

میری غرض یہ ہے کہ مخالفین کے بہت سے من گھڑت افسانے، ان کے مخترع فضائل ومناقب اور خانہ ساز القاب ہماری سادگی اور رواداری کی وجہ سے ہم میں رواج پاجاتے ہیں، انھیں میں سے ''سید الشہداء'' کا لقب بھی ہے، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ لکھا اور بولا جاتا ہے، حالانکہ نصوص نبویہ میں اس کا کوئی نشان نہیں ہے۔

اور جس بزرگی کا ثبوت کسی بزرگ کے لیے اس دلیل سے نہ ہو، جس سے وہ بزرگی ثابت ہونی چاہیے، اس کو اس بزرگ کے لیے زبردستی ثابت کرنا اس کی تعظیم نہیں ہے، بلکہ منافی تعظیم ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صحیح وثابت فضائل ومناقب کیا کم ہیں کہ کوئی بے سروپا فضیلت ان کے لیے ثابت کی جاتی ہے۔ کیا:

هما ريحانتاي من الدنيا (حسن وحسین رضی اللہ عنہما دنیا میں میرے دو پھول ہیں)۔

اور **الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة** (حسن وحسین جوانان اہل بہشت کے سردار ہیں)

اور **أللّٰهُمَّ إني أُحبُّهما فأحبَّهما** (اے اللہ! میں حسن وحسین کو محبوب رکھتا ہوں، پس تو بھی ان کو محبوب بنالے) ان کے اظہار شرف وفضل اور ان کی عظمت وبزرگی کے اعلان کے لیے ناکافی ہیں کہ سید الشہداء کا لقب بھی خواہ مخواہ ان کے لیے بے دلیل ثابت کیا جائے، خصوصاً جب کہ سیادت شہداء ان امور میں ہے جس پر اطلاع پانا بلا اِعلام نبوی اور وحی الٰہی کے ناممکن ہے۔

☆......☆......☆

حضرت معاویہ - رضی اللہ عنہ - کی شان میں

سوءادبی اور اس کا جواب

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين، وعلى آله وأصحابه وسلم.

مجھے ایک دوست کی معرفت خواجہ حسن نظامی کی کتاب "طمانچہ بر رخسار یزید" کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، میری طرح ہر شخص کتاب کے نام سے یہی خیال کرے گا کہ یہ کتاب یزید علیہ مایستحقہ کے مظالم اور اس کے عیوب ومثالب کا آئینہ ہوگی، مگر کتاب کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوجائے گا کہ خواجہ صاحب نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہانت، بے حرمتی، تنقیص شان اور ان کو طرح طرح سے مورد الزام قرار دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، جس طرح یزید وامثالہ کے خونی مظالم، ان کی زیادتیاں اور جبر وتعدی کے زہرہ گداز واقعات سن کر مسلمانوں کے دل خون ہوجاتے ہیں[(۱)]، اسی طرح امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت گستاخانہ کلمات سننے کی بھی تاب نہیں لا سکتے، اور

(۱) یہ تحریر ۱۳۴۹ھ = ۱۹۳۰ء کی ہے، بعد میں یزید کے بارے میں حضرت محدث الاعظمیؒ کی تحقیق اور آپ کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہوگیا تھا، چنانچہ یزید پر ایک مضمون مقالات کی اسی جلد میں شامل اشاعت ہے، جس سے آپ کے بعد کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے؛ علاوہ بریں "تبصرہ بر شہید کربلا و یزید" کے عنوان سے آپ کا ایک مستقل رسالہ بھی ہے، جو تقریباً ۱۹۶۰ء کا تصنیف کردہ ہے، جس کا تعارف وخلاصہ "حیات ابوالمآثر" جلد دوم میں (از صفحہ ۳۵۷ تا ۳۸۲) پیش کیا گیا ہے، اس سے بھی آپ کی بعد کی تحقیق بآسانی سمجھی جا سکتی ہے، اس رسالہ کے آخر حضرت محدث الاعظمیؒ نے جو خلاصۂ مباحث ارقام فرمایا ہے، وہ مندرجۂ ذیل ہے:

"۱:- سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ باغی نہیں تھے، نہ ہمارے علم واعتقاد میں ان کا خروج معصیت تھا، بلکہ =

سنی العقیدہ مسلمان کے رنج والم، غم وغصہ کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ خواجہ صاحب کی جسارت نہ صرف بہ نگاہ تعجب بلکہ سخت نفرت کی نظر سے دیکھی جائے گی کہ انھوں نے انتہائی بے باکی اور بے شرمی کو کام میں لاکر حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو بدعتی، عیش پرست، بے رحم وسنگدل، حسن بن علی رضی اللہ عنہ اور بکثرت سرداران عرب کا قاتل، نام کا مسلمان وغیرہ لکھ ڈالا، اور اس کی کچھ پروانہ کی کہ اس شرم ناک حرکت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت بیزار ہیں، اور ان الزامات کی تاریخ

= وہ اپنے اجتہاد کی رُو سے اپنے کو حقدارِ خلافت سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی، اور موقع کا انتظار کرتے رہے کہ صحیح خلافت قائم ہونے کے امکانات پیدا ہوجائیں، اس وقت اپنے لیے بیعت لیں؛ چنانچہ جب کوفیوں نے اپنے قاصدوں کی زبانی اور لاتعداد خطوط سے آپ کو مطمئن کر دیا کہ ہم نے یزید کی بیعت کی نہیں ہے، اور ہم آپ کے انتظار میں ہیں، اس کے بعد مسلم بن عقیل نے بھی کوفہ جا کر اور حالات کا جائزہ لے کر آپ کو اطمینان دلایا، تب آپ کوفہ کے لیے روانہ ہوئے، مگر راستہ ہی میں آپ کو مسلم کی شہادت اور کوفیوں کی غداری کا علم ہوگیا، تو آپ نے پہلا ارادہ فسخ کر دیا، مگر پہلے ساتھیوں نے اور بعد میں ابن زیاد کے آدمیوں نے آپ کو نہ واپس ہونے دیا اور نہ یزید کے پاس جانے دیا، مجبوراً آپ نے ابن زیاد کی فوج کا مقابلہ کیا، اور مردانہ وار لڑ کر آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے جامِ شہادت نوش کیا، آپ ظلماً شہید کیے گئے، اور یہ واقعہ تمام تر ابن زیاد کی شقاوت وقساوت کا نتیجہ تھا۔

۲:- اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یزید نے حضرت حسینؓ کو قتل کیا، یا اس کا حکم دیا، یا وہ اس کے ساتھ راضی تھا۔

۳:- یزید کافر و مرتد نہیں تھا، بلکہ اس کے فسق کا بھی کوئی لائق اعتماد ثبوت نہیں ہے، علماء اعلام نے اس کے مسلمان ہونے کی تصریح کی ہے، اور کسی مسلمان کو بلا ثبوت ودلیل فاسق کہنا جائز نہیں ہے، کوئی شہرت جو عینی شاہدوں کی شہادت پر مبنی نہ ہو، لائقِ اعتماد وحجت نہیں ہے۔

۴:- یزید نہ تو ائمہ علم میں سے تھا، نہ ائمہ تقویٰ میں سے، وہ اپنے جیسے دوسرے مسلمان بادشاہوں کی طرح ایک بادشاہ تھا، وہ خلیفہ بھی تھا مگر خلیفۂ راشد نہ تھا؛ اسی لیے سیوطی وغیرہ نے اس کا ذکر بضمنِ خلفاء کیا ہے، اور ابن تیمیہ وغیرہ نے اس پر لفظ خلیفہ کا اطلاق کیا ہے۔

۵:- عقیدۂ فسق یزید کا تعلق سنیت سے نہیں ہے، نہ اثباتاً نہ نفیاً؛ بلکہ اس کی حیثیت محض ایک علمی تحقیق کی ہے، اگر کسی عالم کے نزدیک شرعی قواعد کے ماتحت اس کا فسق ثابت ہو، اور وہ اس کو فاسق مانتا ہو، تو وہ بھی سُنی ہے؛ اور کسی عالم کے نزدیک ان قواعد کی رو سے اس کا فسق ثابت نہ ہوتا ہو، اس لیے وہ اس کو فاسق نہ مانتا ہو، تو وہ بھی سُنی ہے۔

تکذیب کرتی ہے۔

خواجہ صاحب سے ہم کو چنداں شکایت نہ ہوتی اگر وہ تقیہ چھوڑ کر کھلے بندوں شیعہ ہو کر تبرا کرتے، لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی قسمیں کھا کھا کر اپنے شیعہ ہونے کی نفی بھی کرتے جاتے ہیں، اور اہل سنت - **کثّرھم اللہ** - کے اتنے بڑے اہم اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی نہایت دیدہ دلیری سے یہ کہتے ہیں کہ ''اہل سنت کے تمام اصول کو برحق مانتا ہوں'' ص:۴۔ اور سچ پوچھیے تو خواجہ صاحب کو اپنے مقصد کی اشاعت کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی ہے، اس لیے کہ اگر وہ اپنے کو زبردستی سنی ظاہر نہ کریں تو سنی ان کی ایک بات بھی باور کرنے کو تیار نہ ہوں گے، اور اہل سنت وجماعت کی صاف وسیدھی شاہراہ جس سے وہ سنیوں کو ڈگانا چاہتے ہیں اس کو وہ کسی طرح نہ چھوڑیں گے اور وہ شیعیت کا جال پھیلانے میں ناکام رہ جائیں گے۔

تعلیمات اسلام سے مسلمانوں کی بے خبری کا یہ منظر بھی کس قدر روح فرسا ہے کہ ان کے سامنے جو کوئی بھی اہل علم کا بھیس بدل کر آجائے اور تعلیمات اسلام کو وہ جتنا بھی بدنما بنا کر مسخ شدہ صورت میں چاہے پیش کرے، ان کو خبر نہیں ہوسکتی۔ مقام حیرت ہے کہ ''تعظیم صحابہ'' اور ''مشاجرات صحابہ میں سکوت'' اہل سنت کے وہ اجماعی عقیدے ہیں جن پر وہ ہزاروں برس سے قائم ہیں، اس کی اہانت آمیز مخالفت کیے جانے پر بھی ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی، حالانکہ وہ کتابیں جن میں ان عقیدوں کی بیخ کنی کی گئی ہے بارہا چھاپی گئیں اور بہت سے مقامات میں بچے اور بچیوں کے درس میں داخل کردی گئی ہیں۔

اور سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس گمراہ کن پروپگنڈہ کو اسلام کی خدمت قرار دیتے ہیں۔ ہر مسلمان بجائے خود غور کرے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا دیدہ دلیری ہوسکتی ہے اور ناواقف مسلمانوں میں غلط اور ناپاک عقائد کی اشاعت کے لیے اس سے بڑا اور کون سا کید کیا جاسکتا ہے، چونکہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے جاہل طبقہ میں ایک بہت بڑی گمراہی پھیل جانے کا اندیشہ تھا، اس لیے قرآن

کریم اور حدیث رسول پاک ﷺ اور عقائد اہل سنت کی روشنی میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت صحیح خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ سطریں ناواقف مسلمانوں کی سچی رہنمائی کریں گی، اور مسلمان بد اعتقادی کے اس دلدل سے جس میں انھیں خواجہ صاحب نے پھنسانا چاہا ہے، نکلنے کی کوشش کریں گے، اور اسی سلسلہ میں دفاع عن الصحابہ کی جلیل ترین خدمت بھی انجام پذیر ہوجائے گی، جس کو میں اپنے لیے ذریعۂ بخشش تصور کروں گا۔

صحابۂ کرام کی عظمت شان سے عوام کو آگاہ کرنے کے لیے سب سے پہلے وہ احادیث ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جن میں حضرات صحابہؓ کی تعظیم کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے اور ان کے حق میں بدگوئی وگستاخی کرنے کو سختی سے روکا گیا ہے، اور اس کو بہت برا قرار دیا گیا ہے۔

(حدیث اول): میرے اصحاب کو گالی نہ دو، برا نہ کہو، اس لیے کہ اگر تم میں سے کوئی کوہ اُحد کے برابر سونا بھی خدا کی راہ میں دے ڈالے تو ان کے ایک یا آدھے مد گیہوں یا جو کے مرتبہ کو جو انھوں نے خرچ کیا ہے نہیں پہنچ سکتا[۱]۔

(حدیث دوم): میرے صحابیوں کا اکرام ولحاظ کرو کہ وہ تم میں کے بہترین افراد ہیں[۲]۔

(حدیث سوم): آنحضور ﷺ نے فرمایا: اس مسلمان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوسکتی جس نے مجھے دیکھا، یا اس نے میرے دیکھنے والے کو دیکھا[۳]۔

حسن نظامی صاحب کی یہ حرکت حد درجہ قابل نفرین وملامت ہے کہ انھوں نے شیعوں کے خوش کرنے کے لیے ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی توہین وتحقیر کرکے کئی کروڑ سنیوں کے جذبات کو ٹھیس لگائی اور ان کی ناقابل تلافی دل آزاری کی۔

(حدیث چہارم): آنحضورؐ نے بہ تکرار فرمایا: میرے صحابیوں کے بارے میں اللہ

---

(۱) أخرجه الشيخان عن أبي سعيد الخدري مرفوعًا.

(۲) أخرجه النسائي عن عمر مرفوعًا.

(۳) أخرجه الترمذي عن جابر.

سے ڈرو، انھیں میرے بعد نشانہ نہ بناؤ، جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ایسا کیا، اور جس نے ان کی دشمنی پر کمر باندھی اس نے میری دشمنی کے سبب سے ایسا کیا، (یعنی اس کے دل میں میری طرف سے کینہ ہوگا، اس لیے میرے اصحاب سے دشمنی کررہا ہے) جس نے ان کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی، اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے خدا کو ایذا دی، اور جو خدا کو ایذا دے گا اسے خدا جلد گرفتار عذاب کرے گا[۱]۔

(حدیث پنجم): سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کو پاؤ جو میرے صحابیوں کو گالی دیتے ہوں تو کہو تم پر تمھاری برائی کی وجہ سے لعنت[۲]۔

(حدیث ششم): حضور ﷺ نے فرمایا خدا نے اپنی مخلوق سے مجھے انتخاب کیا، پھر میرے ساتھی چنے، جن میں سے کسی کو میرا وزیر، چند ایک کو انصار مقرر فرمایا؛ اور کسی کو خسر، کسی کو داماد، کسی کو سالا بنایا۔ پس جو انھیں گالی دے، برا بھلا کہے، اس پر اللہ کی اور ملائکہ اور سارے لوگوں کی لعنت۔ قیامت کے دن خدا اس کا نہ عذر قبول کرے گا نہ فدیہ[۳]۔

(حدیث ہفتم): فرمایا: خدا نے مجھے انتخاب کیا، اور مخلوق میں سے چن کر میرے لیے ساتھی مقرر کیے۔ ان میں کچھ لوگوں کو اصہار (سالے، سسر، داماد وغیرہ) اور انصار بنایا، جو ان کے بارے میں میرا لحاظ کرے گا خدا اس کی حفاظت فرمائے گا، اور جو مجھے ان کے بارے میں ستائے گا اس کو خدا ستائے گا[۴]۔

(حدیث ہشتم): فرمایا: خدا نے (منصب نبوت کے لیے) میرا انتخاب فرمایا، اور (میری رفاقت وصحبت کے لیے) صحابی چنے، اور (میرے رشتہ کی خاطر) سالے، سسر، داماد منتخب فرمائے، اور بہت جلد کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو انھیں گالی دیں گے، ان کی بے حرمتی کریں گے، پس تم ان کی

(۱) أخرجه الترمذي عن عبد الله بن مغفل رضي الله عنه.
(۲) رواه الترمذي عن ابن عمر رضي الله عنهما.
(۳) أخرجه المحاملي والطبراني والحاكم عن عويمر بن ساعدة رضي الله عنه.
(۴) أخرجه الخطيب عن أنس رضي الله عنه.

ہم نشینی سے پرہیز کرو، ان کے ساتھ کھانا پینا ترک کرو، ان سے بیاہ شادی بند کرو[۱]۔

(حدیث نہم): فرمایا: لوگو! میرے اصحاب واصہار وانصار کے بارے میں میرا لحاظ کرو (یعنی ان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا خیال رہے کہ وہ میری صحبت ورفاقت سے مشرف ہیں) جو ایسا کرے گا خدا اس کی دنیا وآخرت میں حفاظت فرمائے گا، اور اگر کسی نے میرا لحاظ نہ کیا (اور میرے صحابی کو برا بھلا کہہ بیٹھا) تو خدا اس کی حفاظت سے بری ہوجائے گا، اور جس سے خدا بری ہوا سے عنقریب گرفتار بلا کرے گا[۲]۔

(حدیث دہم): جو میرے کسی صحابی کو گالی دے (برا بھلا کہے) اس پر اللہ کی اور ملائکہ اور سارے لوگوں کی لعنت[۳]۔

(حدیث یازدہم): سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جو میرے اصحاب کے ساتھ گستاخی کرنے میں سب سے زیادہ جری ہوں[۴]۔

(حدیث دوازدہم): اس کے الفاظ نویں حدیث کے قریب قریب ہیں، مگر نویں حضرت عیاض سے مروی ہے اور یہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے: ولفظه: **احفظوني في أصحابي فمن حفظني فيهم كان عليهم من الله حافظ ومن لم يحفظني فيهم تخلّى الله منه ومن تخلى الله منه يوشك ان يأخذه**[۵]۔

(حدیث سیزدہم): دوسرے لوگ زیادہ ہوں گے اور میرے صحابہ کم ہوتے جائیں گے، تو میرے صحابیوں کو گالی نہ دو جو انھیں گالی دے اس پر خدا کی لعنت[۶]۔

(۱) أخرجه العقيلي في الضعفاء عن أنس وأورده ابن حجر المكي في الزواجر وزاد: ولا تصلوا معهم ولا تصلوا خلفهم.
(۲) أخرجه البغوي والطبراني وأبو نعيم في المعرفة وابن عساكر عن عياض الأنصاري رضي الله عنه.
(۳) أخرجه الطبراني عن ابن عباس وأخرجه الدار قطني عن فاطمة من طرق وعن أم سلمة نحوه، وقال: لهذا الحديث عندنا طرق كثيرة.
(۴) أخرجه ابن عدي عن عائشة رضي الله تعالى عنها.
(۵) أخرجه الشيرازي في الألقاب عن أبي سعيدؓ.
(۶) أخرجه الخطيب عن جابر والدار قطني في الأفراد.

(حدیث چہار دہم): فرمایا: تم کو میرے اصحاب (کی بدگوئی) سے کیا مطلب، میرے اصحاب کو میرے لیے چھوڑ دو۔ خدا کی قسم تم اگر احد کے برابر سونا بھی خدا کی راہ میں دے ڈالو تو ان کے ایک دن کے عمل کے برابر نہیں ہو سکتا[1]۔

(حدیث پانز دہم): فرمایا: جو لوگ میری رسالت کے مقر ہیں ان کو میں اپنے اصحاب کے حق میں بدگوئی کرنے سے منع کرتا ہوں، میرے صحابیوں سے خدا راضی ہو چکا ہے اور قرآن پاک میں ان کا ذکر خیر کیا ہے الخ[2]۔

(حدیث شانز دہم): جو کوئی میرے صحابہ کے بارے میں میرا لحاظ کرے گا وہ حوض کوثر پر مجھ سے ملے گا، اور جو اس معاملہ میں لحاظ نہ کرے گا اس کو حوض کوثر پر وارد ہونا نصیب نہ ہوگا[3]۔

(حدیث ہفدہم): حضرت براء نے فرمایا: اصحاب رسول اللہ ﷺ کو گالیاں نہ دو، خدا کی قسم ان کا ایک دن رسول اللہ کے ساتھ رہنا تمھاری عمر بھر کے عمل سے اچھا اور افضل ہے[4]۔

ان چند احادیث سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ صحابہ کی کیا شان وعظمت ہے، اور ان کے حق میں گستاخی کرنا کتاب بڑا بدترین جرم ہے۔ اس بنا پر علامہ ابن حجر مکی نے بدگوئی صحابہ کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے[5]۔

تعجب ہے کہ لوگ باوجود ادعائے علم وفضل ان کثیر التعداد احادیث کی نہایت بے باکی سے مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان میں کی ہر ایک حدیث بجائے خود علم حدیث کی اصطلاح میں صحیح ہے، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ان میں جو ضعیف ہیں متعدد طریق سے مروی ہونے کی وجہ سے ان کا ضعف جاتا رہا اور قابل عمل

(۱) أخرجه ابن عساكر عن الحسن مرسلاً.
(۲) كنز العمال عن علي.
(۳) دار قطني (۴) ابن عساكر
(۵) زواجر: ۲۰۱

ہو گئیں، علاوہ بریں فضائل میں ضعیف احادیث بھی مقبول ہیں۔

(حدیث ہشتدہم): جب میرے صحابہ کا ذکر آجائے تو ان کے حق میں بدگوئی سے زبان روک لو[1]۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مخصوص فضائل

حضرت معاویہؓ کے صحابی ہونے کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، اور رسول پاک کی صحبت تنہا اتنا بڑا اشرف، اتنی عظیم الشان فضیلت ہے، جس کی برابری اور کوئی فضیلت نہیں کرسکتی، اہل سنت -**كثرهم الله**- کا مشہور مسئلہ ہے کہ کوئی کیسا ہی بڑا ولی ہو ایک ادنیٰ صحابی کے مرتبہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا، پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری فضیلت کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا دامن اور فضائل وکمالات سے بھی پر ہے۔ ان کے کثیر التعداد مناقب میں چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں:

ا:- حضرت معاویہؓ کا جنتی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے، خدائے پاک نے سورۂ حدید میں ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے فتح مکہ سے پیشتر اسلام کی جانی ومالی خدمتیں انجام دیں وہ اور جن لوگوں نے فتح مکہ کے بعد مالی وجانی جہاد کیا، دونوں کے لیے خدا نے جنت کا وعدہ کیا، فرمایا: ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ حضرت معاویہؓ دوسرے گروہ میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ وہ فتح مکہ کے سال یا تقریباً ایک سال اس سے پہلے مشرف باسلام ہوئے ہیں، اور فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں شریک ہوئے ہیں، تقریب میں ہے: **صحابي أسلم قبل الفتح**[2] اور تاریخ الخلفا میں ہے: **وشهد حنينا**[3]. ص:۱۳۱

۲:- رسول اللہ ﷺ کی دعا:- حضرت معاویہؓ کے لیے آنحضرت ﷺ نے ہادی ومہدی ہونے کی دعا فرمائی ہے۔ ترمذی نے بسند حسن ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

(۱) تطہیر ابن حجر
(۲) صحابی ہیں فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے۔
(۳) غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔

حضرت معاویہؓ کے لیےان الفاظ میں دعا کی: اللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ ھَادِیاً مَّھْدِیًّا (اے اللہ معاویہ کوسیدھی راہ پر چلنے والا اور دوسروں کوسیدھی راہ بتانے والا بنا) یہ بھی بھولنا نہ چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعائیں جوامت کے حق میں فرمائی ہیں، خصوصاً اصحاب کے بارے میں مقبول ہیں[۱]۔

امام احمد نے حضرت عرباضؓ بن ساریہ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہؓ کے لئے یہ دعا بھی فرمائی ہے:

اللّٰھُمَّ عَلِّمْ مُعاويةَ الكِتابَ والحِسابَ وقِهِ العَذابَ[۲].

یعنی اے اللہ! معاویہ کو کتاب اور حساب کا علم دے اور عذاب سے محفوظ رکھ۔

۳:- حضرت معاویہؓ کی سرورکائنات ﷺ نے مدح بھی فرمائی ہے فرمایا:

معاوية أحلم أمتي وأجودها[۳]. یعنی میری امت میں بڑا بردبار، اور صاحب کرم معاویہ ہے

دوسری حدیث میں بایں الفاظ عزت افزائی فرمائی گئی:

وصاحب سري معاوية بن أبي سفيان فمن أحبَّهم فقد نجا ومن أبغضَهُم فقد هلك[۴]. یعنی میرا محرم راز معاویہ ہے، پس جو معاویہ اور دیگر صحابہ سے محبت رکھے گا وہ نجات پائے گا اور جو دشمنی رکھے گا ہلاک ہوگا۔

یہ ظاہر ہے کہ آدمی اسی کو اپنا راز دار بناتا ہے جس پر اس کو کامل اعتماد ووثوق ہوتا ہے، اور جس کے خلوص پر پورا اطمینان ہوتا ہے، اس سے اس منزلت ورفعت کا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو حضرت معاویہ کو بارگاہ رسالت میں حاصل تھی۔

تیسری حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر وعمر سے کسی بات

(۱) تطہیر: ۲۳
(۲) مسند
(۳) أخرجه الحارث بن أبي أسامة
(۴) أخرجه الملأ ونقله عنه المحب الطبري

میں دوبار مشورہ لیا، دونوں بار ان لوگوں نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے آدمی بھیج کر حضرت معاویہؓ کو بلوایا اور حضرت ابوبکر وعمر سے کہا کہ ان کو اس معاملہ میں شریک کرلو اور ان سے بھی رائے لو، اس لیے کہ یہ بہت مستعد اور امانت دار آدمی ہیں[۱]۔

۴:- حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت جبریل نے آنحضرت ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آپ معاویہ کا بہت خیال رکھئے اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کا امانت دار ہے اور نہایت اچھا امین ہے[۲]۔

اللہ اکبر! جس کو روح الامین بہترین امین قرار دیں اسکی امانت داری کا کیا کہنا۔

۵:- سرورکائنات، ام المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ ہمشیر حضرت معاویہؓ کے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ معاویہ کا سر حضرت ام حبیبہؓ کی گود میں ہے اور بھائی کو پیار کررہی ہیں، حضور ﷺ نے پوچھا ام حبیبہؓ! کیا تم کو معاویہ سے محبت ہے؟ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بولیں، حضرت! بھلا بھائی کی بھی محبت نہ ہوگی، حضور نے فرمایا کہ معاویہ کو اللہ ورسول بھی پیار کرتے ہیں[۳]۔

۶:- حضرت معاویہؓ کی ایک قابل ذکر منقبت وہ رشتہ داری کا تعلق بھی ہے، جو ان کو حضرت ام حبیبہؓ کی وساطت سے سرورکائنات ﷺ کے ساتھ حاصل ہے۔ یہ رشتہ داری کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ بہت سی نعمتوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ جس گھر میں میری کوئی لڑکی بیاہی جائے گی اور جس گھر کی لڑکی کو میری بی بی ہونے کا شرف حاصل ہوگا، وہ سب جنت میں میرے ساتھ ہوں گے[۴]۔

اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے خدا سے اس کی درخواست کی تو خدا نے میری

(۱) ذكره ابن حجر وقال: رجاله ثقات مع اختلاف في البعض.
(۲) ذكره ابن حجر وقال: رجاله رجال الصحيح إلا واحداً ففيه لين وآخر لم يعرفها الهيثمي.
(۳) ذكره ابن حجر وفيه من لم يعرفه الهيثمي.
(۴) رواه الحارث بن أبي أسامة

درخواست قبول فرمائی۔

آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی میرے اصحاب اور میرے سسرالی رشتہ داروں کے بارے میں میرا خیال رکھے گا، اس کے لیے خدا کی جانب سے ایک نگہبان مقرر ہوگا، جو اس کی حفاظت کرے گا، اور جو کوئی ان کے بارے میں میرا لحاظ نہ کرے گا، اس سے خدا بیزار ہو جائے گا، اور جس سے خدا بیزار ہو جائے گا اس کو پکڑ لے گا[1]۔

۷:- **کتابت وحی:** کتب سیر واحادیث میں مذکور ہے کہ حضرت معاویہؓ رسول اللہ ﷺ کے کاتب تھے، وحی ربانی اور دیگر اشیاء کی کتابت ان کے سپرد تھی، ایک حدیث میں بسند حسن مذکور بھی ہے کہ حضرت معاویہ آنحضرت ﷺ کے سامنے کتابت کیا کرتے تھے۔ ابونعیم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ بہت خوشنویس، اور فصیح، زبان آور، نہایت بردبار وسنجیدہ مزاج تھے[2]۔

کتابت وحی کا منصب کوئی معمولی منصب نہیں ہے، یہ خدمت اسی شخص کے سپرد ہوسکتی ہے جس کی ثقاہت میں کسی قسم کا شبہہ نہ ہو۔

۸:- **رسول اللہ ﷺ وسلم کی خدمت:** حضرت معاویہ نے رسول اللہ ﷺ کی مختلف طور سے خدمتیں کی ہیں، جن سے ان کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پرخلوص محبت وشغف اور عقیدت مندی کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ حضرت معاویہؓ لوٹے میں پانی بھر کر لے گئے اور آپ کو وضو کرایا ہے[3]۔

اور عمرۃ القضاء میں سرور کائنات ﷺ کے سر کے بال تراشے ہیں[4] اور غالباً اسی وقت کے بال اور ناخن رکھے ہوئے تھے جو بعد وفات ان کی وصیت کے موافق ان کی آنکھوں میں رکھے گئے تھے، اور یہ حضرت معاویہؓ کی محبت رسول اور عقیدت مندی کا

(۱) أخرجه الحافظ أحمد بن منيع
(۲) تطہیر: ۱۹
(۳) رواه أحمد بسند حسن
(۴) رواه البخاري وأحمد وليس فيهما ذكر عمرة القضاء.

زبردست ثبوت ہے۔ حضرت معاویہؓ کو رسول اللہ ﷺ کے آثار شریفہ کے ساتھ جو شغف اور عقیدت مندی بلکہ عشق تھا، اس کے جلیل ترین مظاہر میں سے چادر مبارک کے خریدنے کا واقعہ ہے، حضرت کعبؓ بن زہیر کو قصیدہ بانت سعاد کے صلہ میں بارگاہ رسالت سے ایک چادر عنایت ہوئی تھی، یہ مشہور واقعہ ہے، حضرت معاویہؓ جب مالک تخت وتاج ہوئے تو انھوں نے چاہا کہ یہ دولت بھی انھیں کے ہاتھ آجائے، کعبؓ کو لکھا کہ چادر مبارک مجھ کو عنایت کیجئے اس کے معاوضہ میں دس ہزار درہم تقریباً اڑھائی ہزار روپے[1] حاضر ہیں، کعب بھی ویسے ہی قدرداں تھے، حضرت معاویہ کو انکار لکھ دیا، معاویہ مجبور ہوگئے، لیکن چادر کے ساتھ ان کو سچا عشق تھا، اس کی یاد دل سے کبھی محو نہ ہوئی، چنانچہ جب کعب کا انتقال ہوگیا تو ان کے ورثاء سے بیس ہزار درہم پر چادر خریدی[2]۔

۹:- **حضرت معاویہ مجتہد وفقیہ تھے:** صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں نکتہ چینی کے طور پر ذکر کیا کہ حضرت معاویہؓ نے صرف ایک رکعت وتر کی نماز پڑھی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا معاویہ فقیہ ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ ان کو صحبت رسول کا شرف حاصل ہے۔ ابن عباس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شرف صحبت کے ساتھ فقیہ ومجتہد بھی ہیں، اس لیے ان کے فعل پر اعتراض زیبا نہیں ہے۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ صحابہ اور سلف صالح کے عرف میں فقیہ سے مجتہد مراد ہوا کرتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کے مجتہد ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ معاویہ کی اور میری جنگ میں طرفین کے مقتول جنتی ہیں[3]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لڑائیوں میں اپنے کو حق بجانب سمجھتے ہوئے جانب مخالف کے مقتولین کو مستحق جنت کیسے قرار دے سکتے ہیں، جب تک کہ ان مقتولین کو اپنے فعل میں ایک

(۱) یہ آج سے تقریباً ۸۴ سال پہلے کا اندازہ ہے آج کے حساب سے مقدار بہت زیادہ ہوگی۔
(۲) أخرجه السِّلَفي في الطيوريات
(۳) أخرجه الطبراني بسند رجاله ثقات مع اختلاف في بعضهم.

مجتہد کا مقلد قرار نہ دیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مجتہد تسلیم فرماتے تھے اور ان کی مخالفت کو خطاء اجتہادی پر محمول فرماتے تھے، اور اسی بنا پر ان کے طرفدار مقتولین کو مستحق جنت سمجھتے تھے کہ وہ ایک مجتہد کے پیرو تھے، گو خطا پر تھے۔

۱۰:- **بارہ خلفاء میں حضرت معاویہ بھی ہیں:** ایک حدیث میں بسند حسن مذکور ہے کہ امت میں بارہ خلفاء نقباء بنی اسرائیل کی تعداد کے موافق ہوں گے(۱)۔

اور ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ وہ بارہوں راہ راست پر ہوں گے اور دین حق کے مطابق عمل درآمد کریں گے(۲)۔

علماء نے ان بارہ خلفاء میں خلفاء راشدین و حضرت حسن کے ساتھ حضرت معاویہؓ اور عمر بن عبدالعزیز کے بھی نام لیے ہیں(۳)۔

ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان بارہ خلفاء میں عمر بن عبدالعزیز کو علماء باتفاق داخل مانتے ہیں اور حضرت معاویہؓ، عمر بن عبدالعزیز سے بدرجہا افضل ہیں، تو وہ ان میں بطریق اولیٰ داخل ہیں(۴)۔

بارہ خلفاء میں حضرت معاویہؓ کے داخل ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو خلافت کی بشارت دی تھی، اور حکمرانی کا طریقہ تعلیم فرمایا تھا، حضرت معاویہ خود راوی ہیں کہ آنحضرت نے مجھ سے فرمایا:

إذا ملكتَ فأحسِنْ(۵). یعنی معاویہ! جب تم حکمراں ہونا تو احسان کرنا۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ اگر تم کو ولایتِ امر -یعنی خلافت- ملے، تو اللہ سے

(۱) أخرجه أحمد والبزار (وأصل الحديث في الصحاح)
(۲) أخرجه مسدد في مسنده
(۳) تاريخ الخلفاء: ۸
(۴) تطهير: ۳۰
(۵) أخرجه ابن أبي شيبة

ڈرنا اور عدل کرنا(۱)۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ جو اچھا کام کرے اس سے قبول کرنا اور جو برا کرے اس سے درگزر کرنا(۲)۔

حضرت معاویہ فرماتے ہیں کہ جب سے حضور کی زبان سے یہ مبارک کلمات نکلے تھے، مجھے برابر خیال تھا کہ میں ایک دن ضرور خلیفہ ہوں گا، اس لیے کہ حضور ﷺ کے دہن مبارک سے یہ کلمات بلاوجہ نہیں نکل سکتے، اور حضور کا یہ کلام بے اثر نہیں ہوسکتا؛ یعنی اگرچہ خلافت کا ذکر بطریق تعلیق ہے، مگر وہ محقق ہوکر رہے گی۔ **سبحان الله ما أعقله وأحسن فهمه وأبلغ ...... تلك عشرة كاملة.**

حضرت معاویہؓ کی نسبت صحابہ وتابعین کے خیالات واقوال

۱:- اہل سنت کے نقطۂ خیال سے حضرت معاویہؓ کی دیانت وامانت، تدین وعدالت کی کافی ضمانت حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ راشد کا معاویہ کو شام کے صوبہ کا حاکم مقرر کرنا ہے، کوئی سنی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ حضرت ابوبکر نے ان کو بلا استحقاق واہلیت کے حاکم بنادیا تھا، یہ بات بھی بھولنی نہ چاہئے کہ وہ خلافت راشدہ کا مبارک دور تھا، اس وقت حاکم میں صرف ملکی انتظام کی قابلیت ہی نہیں دیکھی جاتی تھی؛ بلکہ اس کے ساتھ علم وفضل، تدوین وعدالت کی موجودگی بھی ضروری تھی، بلکہ ان امور کا لحاظ مقدم ہوتا تھا۔

۲و۳:- حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی ان کو برقرار رکھا اور وہ حضرت عمرؓ کے پورے زمانۂ خلافت میں بلکہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے وقت بھی بدستور شام کے حاکم رہے۔ حضرت عمرؓ جیسے محتاط اور بیدار مغز شخص نے بھی ان کی اہلیت میں قدح نہ کیا، اگر حضرت عمرؓ کو کوئی ایسی بات معلوم ہوجاتی جو ان کی اہلیت حکومت میں قادح ہوتی تو ایک منٹ کے لیے بھی وہ شام کے حاکم نہ رہ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی سیرت پڑھنے والے بخوبی

(۱) أخرجه أبو يعلى وأحمد
(۲) أخرجه الطبراني في الأوسط

واقف ہیں کہ ان کے پاس جب کسی صوبہ کے حاکم کی شکایت پہنچی تو انھوں نے فوراً اس کے نام پروانۂ معزولی بھیج دیا، بشرطیکہ وہ شکایت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے۔ ان امور سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے علم میں حضرت معاویہؓ کا علم و فضل، تدین وعدالت، امانت وحسن انتظامی قابل اطمینان تھا؛ بلکہ حضرت عمر نے ایک موقع پر صاف ارشاد فرمایا کہ ما رأيتُ منه إلا خيراً یعنی میں نے اس شخص میں بھلائی کے سوا اور کوئی بات نہیں دیکھی، اُس مجلس میں دیگر صحابہ نے بھی ان کے فضل وتقدم کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

ما في قومک مثله[1]. آپ کی جماعت میں اس شخص کی نظیر نہیں ملتی۔

ایک اور موقعہ پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو ہدایت کی: جب کوئی تفرقہ اور مسلمانوں کی جماعت میں پھوٹ پڑ جائے تو شام میں معاویہؓ کے پاس کوچ کر جانا، اس لیے کہ اگر تم کو اپنے ناخنِ عقل سے اس عقدہ کی گرہ کشائی کرنی ہوگی تو بڑی دشواری پیش آئے گی، اور معاویہؓ اس گتھی کو بآسانی سلجھا دیں گے اور فتنہ کی آگ بہت خوبی وخوبصورتی سے بجھا دیں گے[2]۔

۴:- ان حضرات کے علاوہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی حضرت معاویہؓ اور ان کی حکومت کو مسلمانوں کے لیے باعث خیر وبرکت سمجھتے تھے۔ تاریخ الخلفاء میں مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم معاویہؓ کی حکومت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، لیکن سمجھ لو کہ جس دن معاویہ نہ ہوں گے، اس دن سر دھڑ سے جدا ہو کر اُڑتے نظر آئیں گے[3]۔

حضرت علیؓ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ معاویہ اپنے حسن انتظام وخوبی تدبیر وبلند حوصلگی سے مسلمانوں کا سکہ بٹھا چکے ہیں، اور ان کے رعب وداب سے مخالفین اسلام لرزہ بر اندام ہیں، معاویہؓ کی موجودگی نے ان کی ہمتیں پست کر دی ہیں، اس لیے فرمایا کہ معاویہؓ کا

(۱) أخرجه ابن سعد، تطهير: ۳۷

(۲) أخرجه ابن أبي الدنيا، تطهير: ۳۸

(۳) تاریخ الخلفاء: ۱۳۲

وجود بھی بسا غنیمت ہے، اگر وہ نہ ہوتے تو مسلمانوں [کو] یہ امن اور چین نصیب نہیں ہوسکتا۔

۵:- حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معاویہ کی نماز جس قدر رسول اللہ کی نماز کے مشابہ تھی، اتنی اور کسی کی میں نے نہیں دیکھی[1]۔

حضرت ابودرداء کی شہادت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے حضرت معاویہ کو رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا کس قدر خیال تھا اور وہ اس میں کس حد تک کوشاں تھے[2]۔

۶:- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت معاویہؓ کی لیاقت سرداری وقابلیت حکومت کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے کہ اس زمانے میں رئیس وحاکم میں علم ودیانت وسیاست تینوں عناصر کی موجودگی ضروری تھی۔

۷:- اکابر وفقہائے صحابہ نے حضرت معاویہؓ کی شاگردی کی ہے، اگر ان حضرات کو معاویہؓ کے علم ودیانت میں کلام ہوتا تو ان کی احادیث پر اعتماد نہ کرتے۔ یہ اس بات کی زبردست شہادت ہے کہ حضرت معاویہؓ سے جن حضرات کو اختلاف تھا وہ ملکی معاملات میں تھا، ورنہ ان کے علم وفضل ودیانت کا کوئی منکر نہ تھا، جن بزرگوں نے حضرت معاویہ سے روایت کی ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ ابن زبیر، جریر بن عبداللہ بجلی، معاویہ بن حُدیج، سائب بن یزید، نعمان بن بشیر، ابوسعید خدری، ابواسامہ بن سہل[3]۔

۸:- حضرت ابوسعید خدریؓ کے سامنے ایک بدوی نے حضرت معاویہؓ کی شان میں گستاخی کی، حضرت ابوسعید اس کی تاب نہ لا سکے اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اس کے بعد بدوی کو ایک واقعہ سنایا جس میں یہ مذکور تھا کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کا کوئی جرم صرف اس کے صحابی ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا تھا[4]۔

(۱) ذکرہ ابن حجر　(۲) تطہیر: ۵۶

(۳) ایضاً: ۵۳　(۴) صواعق: ۱۲۶

حضرت ابوسعیدؓ کی غرض اس حکایت سے یہ تھی کہ صحابہ کی شان بہت اجل وارفع ہے، اگر بالفرض ان سے کوئی لغزش بھی سرزد ہوجائے تو اس کی وجہ سے ان کو برا بھلا کہنا زیبا نہیں ہے۔

۹:- پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت مذکور ہے کہ انھوں نے ایک آدمی کو جس نے حضرت معاویہ کی شان میں گستاخی کی تھی تین کوڑے لگوائے، حالانکہ وہ اپنے زمانۂ خلافت میں کسی کو جلدی مارنے کا حکم نہیں دیتے تھے[۱]۔ اگر کوئی شخص حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اس تعزیر کو خاندانی عصبیت اور بنوامیہ کی پاسداری پر محمول کرے تو یہ ابن عبدالعزیز کے مسلمہ دیانت وتقویٰ پر حملہ ہوگا، اس کے علاوہ یہ اس لیے بھی غلط ہے کہ حضرت ابن عبدالعزیز نے ایک دوسرے شخص کو جس نے یزید کو امیر المؤمنین کے لقب سے یاد کیا تھا، بیس کوڑے لگانے کا حکم دیا[۲]۔ اگر عمر بن عبدالعزیز میں خاندانی حمیت کا جذبہ کارفرما ہوتا تو اس دوسرے شخص کو بیس کوڑے لگانے کا حکم کیوں دیتے۔ عمر بن عبدالعزیز کا دامن ان تعصّبات کے دھبہ سے بالکل پاک تھا، وہ اہل بیت رسول کا غایت درجہ احترام کرتے تھے، فاطمہ بنت علی کسی ضرورت سے عمر بن عبدالعزیز کے پاس تشریف لے گئیں، تو عمر نے ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی اور فرمایا کہ خدا کی قسم روئے زمین پر تمھارے اہل بیت سے زیادہ مجھ کو کوئی محبوب نہیں، حتی کہ تمہارے اہل بیت میرے نزدیک خود میرے گھر والوں سے بھی زیادہ محبوب ہیں[۳]۔ چنانچہ یہی حضرت فاطمہ عمر کی بڑی تعریف کیا کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ اگر عمر باقی ہوتے تو ہم پھر اور کسی کے محتاج نہ ہوتے[۴]۔

۱۰:- امام اعمش نے فرمایا کہ اگر تم حضرت معاویہ کو دیکھتے، تو بے ساختہ بول اٹھتے

(۱) تاریخ الخلفاء:۱۶۱، صواعق محرقہ:۱۳۲
(۲) تاریخ الخلفاء، صواعق:۱۳۲-۱۳۴
(۳) صواعق:۱۴۲
(۴) تاریخ الخلفاء ص۱۶۰

کہ یہ مہدی ہیں[۱]۔

امام اعمش جس پایہ کے حافظ حدیث تھے اہل علم کو معلوم ہے۔

۱۱:- مُعافٰی بن عمران سے کسی نے پوچھا کہ حضرت معاویہؓ کی نسبت سے عمر بن عبدالعزیز کا کیا رتبہ ہے، معافی آگ بگولا ہوگئے اور فرمایا کہ رسول اللہ کے صحابی سے کسی کو کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی، حضرت معاویہؓ رسول اللہ ﷺ کے صحابی اور آپ کے سالے اور دربار رسالت کے کاتب اور وحی ربانی کے امانت دار محافظ ہیں (اور یہ مناقب حضرت ابن عبدالعزیز کو کہاں نصیب ہوسکتے ہیں)[۲]۔

۱۲:- حضرت عبداللہ بن المبارک سے کسی نے دریافت کیا کہ عمر بن عبدالعزیز افضل ہیں یا حضرت معاویہ؟ حضرت عبداللہ کا جواب سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں کہ معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک کا وہ غبار بھی جو رسول اللہ کی معیت میں اڑ کر آیا ہو، عمر بن عبدالعزیز سے ہزار درجہ افضل ہے، تابمعاویہ چہ رسد، معاویہ نے آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی ہے حضور نے فرمایا: ''**سمع اللہ لمن حمدہ**'' معاویہ نے کہا: **ربنا لک الحمد**، اب اس سے بڑھ کر اور کون سا شرف ہوسکتا ہے[۳]۔

۱۳:- امام مالک نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص حضرت معاویہ یا عمرو بن العاص یا اور کسی صحابی کو گمراہ یا معاذ اللہ کافر کہے تو اس کو قتل کردینا چاہئے؛ اور اگر کوئی دوسری گالی دے، برا بھلا کہے تو اس کو سخت سے سخت سزا دینی چاہئے[۴]۔

۱۴:- قبیصہ بن جابر فرماتے ہیں کہ میں حضرت معاویہؓ کی صحبت میں مدتوں رہا ہوں، میں نے ان سے بڑھ کر متحمل مزاج، دیر غضب اور پروقار آدمی نہیں دیکھا[۵]۔

(۱) تطہیر:۵۶
(۲و۳) تطہیر:۲۰-۲۱
(۴) صواعق:۱۵۴، وتنبیہ الولاۃ والحکام:۳۵۸
(۵) تاریخ الخلفاء:۱۳۲

ائمہ اسلام اور احترام صحابہ

اس بارے میں ائمہ اسلام کے اقوال کا استیعاب قریباً ناممکن ہے، چند اکابر علماء کے اقوال ذکر کیے جاتے ہیں، جن سے اندازہ لگایا جا سکے گا کہ ان ائمہ کے نزدیک صحابہ کی کیا شان تھی، اور ان کا کیا رتبہ تھا۔

۱:- امام مالک اس شخص کو کافر قرار دیتے ہیں جو صحابہ سے دشمنی رکھے، اور اس کی امام شافعی اور ائمہ کی ایک جماعت نے موافقت کی ہے[۱]۔

توہین صحابہ کرنے والے کے متعلق امام مالک کا فتویٰ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

۲:- امام ابوزرعہ رازی نے فرمایا کہ جب کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ کسی صحابی کی تنقیص کر رہا ہے، تو سمجھ لو کہ وہ بے دین ہے[۲]۔

۳:- ابن حزم نے کہا کہ صحابہ کل جنتی ہیں اور اِس مدعا پر اُسی آیت سے استدلال کیا ہے، جس سے حضرت معاویہؓ کے جنتی ہونے پر گزشتہ مباحث میں استدلال کیا جا چکا ہے۔

۴:- سہل تستری نے فرمایا کہ جس نے صحابہ کی توقیر نہیں کی وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان ہی نہیں لایا[۳]۔

۵:- امام سحنون مالکی فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص خلفاء اربعہ کو گمراہ کہے تو قتل کر دینا چاہئے؛ اور اگر کسی دوسرے صحابی کو گالی دے، برا بھلا کہے، تو اس کو سخت سزا دینی چاہئے[۴]۔

۶:- حضرت امام احمد نے فرمایا کہ جو اصحاب رسول اللہ کو برا بھلا کہے اس کو ایسی مار مارو کہ پھر اس کی جرأت نہ کر سکے[۵]۔

۷:- قاضی ابویعلی نے فرمایا کہ صحابی کی شان میں بدزبانی کرنے والے کے باب

(۱) صواعق: ۱۳۶ (۲) ایضاً: ۱۲۶ (۳) ایضاً: ۱۲۹

(۴) رسائل ابن عابدین: ۱/۳۵۸، صواعق محرقہ: ۱۵۴

(۵) رسائل شامی: ۱/۳۵۸، صواعق محرقہ: ۱۵۴

میں فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ وہ اس کو حلال سمجھتا ہے تو کافر ہے؛ اور اگر حلال نہیں سمجھتا تو فاسق ہے۔ اگر کوئی شخص کسی صحابیؓ کو مسلمان مانتے ہوئے اس کی دیانت وتقویٰ میں قدح کرے، تو اس کا بھی یہی حکم ہے[۱]۔

۸:- حضرت امام شافعی اور ان کے متبعین کے نزدیک بھی صحابہ کرام کو برا کہنے والا فاسق ہے، عام ازیں کہ وہ کوئی صحابی ہو[۲]۔ مذہب شافعی کی کتاب الانوار میں بتصریح مذکور ہے:

ولا يجوز الطعن في معاوية لأنه من كبار الصحابة[۳].

یعنی معاویہؓ کے بارے میں قدح کرنا جائز نہیں، ان کا شمار اکابر صحابہ میں ہے۔

ابن الصلاح اور نووی نے فرمایا کہ تمام صحابہ دیانت وتقویٰ سے موصوف ہیں، قرآن وحدیث میں ان کی عدالت وجلالت شان مذکور ہے[۴]۔

علامہ ابن حجر مکی فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ ہر مسلمان پر صحابہ کی مدح سرائی اور ان کے عادل ودیانت دار ہونے کا اعتقاد رکھنا واجب ہے، مسلمانوں پر یہ بھی واجب ہے کہ کسی صحابہ پر زبان طعن دراز نہ کریں[۵]۔

ابن حجر نے جلال بلقینی سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کو برا کہنا بلا اختلاف گناہ کبیرہ ہے[۶]۔

امام طحاوی حنفی اپنے عقیدہ میں فرماتے ہیں: ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھتے ہیں، لیکن کسی کی محبت میں حد شرع سے تجاوز نہیں کرتے، ہم کسی صحابی سے بیزار نہیں ہیں، ہم اس کو دشمن رکھتے ہیں جو صحابیوں سے دشمنی رکھے یا جو برائی سے ان کو یاد کرے، ہم صحابہ کا ذکر جب کرتے ہیں اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں، ان کی محبت دین وایمان واحسان ہے، ان کی دشمنی کفر ونفاق وسرکشی ہے[۷]۔

(۱) رسائل: ۱/۳۵۸، صواعق: ۱۵۴

(۲) صواعق محرقہ: ۱۵۴-۱۵۵ (۳) صواعق: ۱۳۳ (۴) صواعق: ۱۳۳

(۵) صواعق: ۱۲۴ (۶) زواجر: ۲/۲۰۱ (۷) عقیدہ: ۷

چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب وازواج وذریات کے باب میں بھلی بات کہی وہ نفاق سے بری ہے؛ اور جس نے ان کا برائی سے ذکر کیا، وہ اہل سنت وجماعت کی صاف وسیدھی شاہراہ سے دور جا پڑا[۱]۔

ملاعلی قاری حنفی فرماتے ہیں کہ جس نے کسی صحابی کو برا کہا وہ فاسق اور بدعتی ہے، اِس پر اجماع قائم ہو چکا ہے؛ اور اگر کوئی مباح اور باعث ثواب سمجھ کر صحابہ کی بدگوئی کرے، تو وہ بالاجماع کافر ہے[۲]۔

اسی مقام پر علامہ تفتازانی سے بھی اسی کے مثل نقل کیا ہے۔

حنفی فقہ کی تمام متون وشروح میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ جو شخص کھل کر سلف (صحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین) کو برا کہتا ہے اس کی شہادت معتبر نہیں ہے، وہ فاسق مردود الشہادۃ ہے۔ سید علامہ شامی فرماتے ہیں:

''ہر مسلمان مرد وعورت کی گردن صحابہ کی زیر بار منت ہے، اس لیے اصحاب کی تعظیم ان کا احترام ہم سب پر واجب ہے اور ان کو برا کہنا، ان کے حق میں زبان درازی کرنا حرام ہے، ہم کو ان لڑائیوں کا ذکر بھی نہ کرنا چاہئے جو مابین صحابہ ہوئی ہیں اور اس میں رائے زنی کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے، یہی تمام اہل حق کا مسلک ہے، اور یہی اہل سنت وجماعت اور صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کی روش ہے، جو شخص یہ روش ترک کردے وہ یا تو گمراہ اور بدعتی ہے یا کافر ہے[۳]۔

نسیم الریاض شرح شفا میں ہے:

ومن یکُ یطعنُ في معاویة فذاک کلبٌ من کلاب الهاویة.

یعنی جو حضرت معاویہ کے باب طعن وزبان درازی کرے وہ جہنم کے کتوں میں ایک کتا ہے۔

(۱) عقیدہ:۸ (۲) رسائل ابن عابدین: ۱/۳۶۷ (۳) رسائل: ۱/۳۵۶

حضرت معاویہؓ اور اہل بیت کا احترام

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ حضرت معاویہؓ- باوجود ان اختلافات ومشاجرات کے جو ان کے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مابین تھے- اہل بیت کی قدر ومنزلت، ان کے حقوق کی نگہداشت اور ان کی خبرگیری کا بے حد خیال رکھتے تھے، ان کی بزرگی وبرتری کا علی الاعلان اعتراف کرتے تھے، میرے اس دعوے پر متعدد تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔

۱:- حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہؓ کے پاس جب تشریف لے جاتے تو حضرت معاویہؓ ان کی بڑی قدر ومنزلت فرماتے تھے، اور ان کو اپنے پاس تخت پر بٹھاتے اور بے حد اظہار مسرت فرماتے[۱]۔

حضرت حسنؓ کے سامنے اگر کوئی حضرت معاویہؓ سے کہتا کہ آپ اپنے مفاخر بیان کیجئے، تو وہ صاف لفظوں میں فرماتے کہ میری جرأت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے نواسے اور اگلوں پچھلوں کے سردار، اور حضرت فاطمہ زہراء کے لال کے سامنے زبان ہلاسکوں[۲]۔

۲:- ایک مجلس میں بڑے بڑے اشراف قریش موجود تھے، حضرت معاویہؓ نے پوچھا کہ کون آدمی ہے جس کے ماں باپ، چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ، نانا، نانی سب شرافت میں بے مثل ہوں؟ ایک شخص نے کھڑے ہو کر حضرت حسن کی طرف اشارہ کیا اور حضرت معاویہ سے پوچھا کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں؟ حضرت معاویہ نے فرمایا بے شک[۳]۔

۳:- کوئی شخص اگر حضرت حسن کے منھ لگتا تو اس کو بہت ڈانٹتے، اور فرماتے کہ رسول اللہ ﷺ کے نواسے کو منھ نہ لگو، ان کے سامنے تمھاری ایک بھی پیش نہ جائے گی، اگر تم پہاڑ کا مقابلہ کرو تو پہاڑ تمھیں کچل ڈالے گا[۴]۔

۴:- حضرت معاویہؓ پچیس ہزار روپئے سالانہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو وظیفہ دیا کرتے

(۱) محاسن: ۱۴۱ (۲) المحاسن والاضداد: ۱۳۴
(۳) محاسن واضداد: ۱۳۹ (۴) ایضاً: ۱۴۴

تھے، ایک بار بھیجنے میں ذرا دیر ہوگئی تو اس کی یوں مکافات کردی کہ اس دفعہ پونے چار لاکھ روپئے ایک سال کے لیے یک مشت روانہ کیا[۱]۔

۵:- حضرت عقیلؓ نے شام میں پہنچ کر تنگ حالی کی شکایت کی، حضرت معاویہؓ نے ان کو یک مشت پچیس ہزار روپئے دیے[۲]۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ وغیرہ حضرت معاویہؓ کے پاس جایا کرتے تھے اور وہاں سے ان حضرات کو گرانقدر عطیات ملا کرتے تھے۔

ان واقعات کو سامنے رکھ کر بڑی آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دل میں اہل بیت رسول کی کتنی سچی محبت تھی، اور وہ ان حضرات کو کس عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ہاں زمانہ جنگ اور ملکی معاملات کی اور بات ہے۔

حضرت معاویہؓ پر بے بنیاد الزامات اور ان کا دفعیہ

”طمانچہ برخسار یزید“ اگرچہ افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس لحاظ سے اس کے واقعات کی نسبت تاریخی ثبوت کا مطالبہ فضول ہے، اور نہ کوئی عقل مند انسان اس کو تاریخ کی حیثیت سے پڑھے گا، اس لیے اس کے واقعات کی تغلیط وتکذیب بظاہر ایک مہمل بات ہے، لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ملک میں ایسے بے تمیزوں اور سبک سروں کی بھی کمی نہیں ہے، جو افسانہ اور تاریخ کا فرق ہی نہیں جانتے۔ علاوہ بریں یہ کتاب بعض مقامات میں بچے بچیوں کے درس میں داخل کردی گئی ہے اور وہ غریب افسانہ اور تاریخ کا فرق کیا جانیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو بچے اس خطرناک کتاب کو پڑھیں گے، وہ بچپن ہی سے اس محترم وجود (حضرت معاویہؓ) کی نسبت غلط اور بے بنیاد اعتقاد قائم کریں گے۔

پھر یہ کس قدر شرمناک اور ایمان سوز حرکت ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ کی نسبت

(۱) تاریخ الخلفا: ۱۳۱
(۲) تاریخ الخلفا: ۱۳۹

غلط اور بیہودہ اتہامات تصنیف کرکے ایک افسانہ مرتب کیا جائے، اور سیدھے سادے مسلمانوں کو اس بزرگوار ہستی کی شان میں گستاخیاں کرنے کا موقع دیا جاوے۔ ننگ اسلام ہے وہ وجود جو اپنے اغراض نفسانی کی تکمیل کے لیے ایسی ہلاکت خیز تصانیف کو آلۂ کار برآری بنائے، اور قابل نفرین ہیں وہ مسلمان جو بجائے اظہار نفرت وحقارت کے ایسی زہریلی کتابیں اپنے بچوں کے ہاتھوں میں دیں۔ ان حالات میں میرے نزدیک بسا ضروری ہے کہ جو بے بنیاد الزامات اس کتاب میں حضرت معاویہؓ پر عائد کیے ہیں، ان کی صاف صاف تردید کرکے عوام مسلمین کو آگاہ کردیا جائے۔

۱:- اس کتاب میں سب سے بڑی تہمت جو حضرت معاویہؓ پر رکھی گئی ہے، وہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے کی تہمت ہے، اس تہمت کا ذکر بار بار دہرایا گیا ہے؛ لیکن یہ بالکل غلط اور دروغ بے فروغ ہے، اور کچھ بعید نہیں جو کسی شیعی کی زبانی سن کر مصنف نے درج کتاب کردی ہو۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے خون سے جس ناپاک اور خبیث وجود کا ہاتھ رنگین ہے، اسی نے حضرت امام حسن کو بھی زہر دلوایا تھا، چنانچہ مسلم الثبوت ومستند مورخ ومحدث علامہ سیوطی نے اس دردناک داستان غم کو لکھتے ہوئے اس کی صاف تصریح کی ہے کہ: جس ننگ انسانیت نے حضرت امام حسنؓ کے ساتھ یہ ستم روا رکھا تھا وہ یزید علیہ ما یستحقہ ہے[۱]۔

۲:- دوسرا الزام یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بے شمار بدعتیں دین میں داخل کردیں (ص۱و۳۷)۔

یہ الزام بھی مصنف کی کم علمی اور علوم شرعیہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، علوم شرعیہ سے جس شخص کو دور کا بھی لگاؤ ہوگا، وہ اس سے بے خبر نہ ہوگا کہ ان امور پر بدعت کا اطلاق نہیں کیا جاتا جو عہد صحابہ میں جاری ہوئے ہوں، اور نہ وہ نئی باتیں جو صحابہ کرام نے کی ہیں یا کرنے کا حکم دیا ہے بدعت کی طرح مذموم ہیں، بلکہ علمائے تابعین اور تبع تابعین کی

(۱) تاریخ الخلفا: ۱۳۰

ایجادات تک کو بھی بہت سے علماء بدعت نہیں کہتے، کم از کم صحابہ کی ایجادات کو تو کوئی بھی بدعت نہیں قرار دیتا۔ اور اس کی کون جرأت کر سکتا ہے جب کہ سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے صحابیوں کی مثال ستاروں کی ہے جس کے پیچھے لگ جاؤ گے ہدایت پا جاؤ گے۔ چنانچہ طریقۂ محمدیہ اور اس کی شرح بریقۂ محمودیہ میں ہے:

هو الزيادة في الدين أو النقصان منه الحادثان بعد الصحابة أي زمانهم وأيضاً زمان التابعين وتابعيهم بغير إذن من الشارع.

ج ۱ ص ۱۲۱

اور وسیلہ احمدیہ میں شرح مقاصد سے منقول ہے:

البدعة المذمومة هو المُحدَث في الدين من غير أن يكون في عهد الصحابة ولا التابعين ولا دلَّ عليه دليل شرعي. (ج ۱ ص ۹۴)

سب کا خلاصہ یہ ہے کہ بدعت مذمومہ دین میں وہ نئی بات پیدا کرنا ہے جس پر کوئی شرعی دلیل کسی طرح بھی دلالت نہ کرے اور وہ بات زمانۂ صحابہ و تابعین کے بعد حادث ہوئی ہے۔

ان تصریحات کے بعد اچھی طرح واضح ہو گیا کہ حضرت معاویہؓ نے اگر کوئی نئی بات دین میں داخل کی بھی ہو تو وہ نہ بدعت ہے نہ مذموم، اس لیے حضرت معاویہؓ پر ایک بے سروپا الزام و اتہام ہے کہ انھوں نے بے شمار بدعتیں جاری کیں، اور جس شخص کو علوم شرعیہ میں مداخلت ہوگی اور وہ بدعت شرعیہ کے مفہوم سے واقف ہوگا، اس کے منھ سے یہ بات نہیں نکل سکتی۔

۳:- لطف یہ ہے کہ ایک مقام پر مصنف نے ''بعض بدعات'' کا نام لیا ہے اور نہایت بے باکی سے ان کی بالکل غلط نسبت حضرت معاویہ کی طرف کر دی ہے، جس سے مصنف کی دیانت کے ساتھ آپ کی وسعت معلومات کا راز بھی فاش ہوا جاتا ہے۔ مصنف نے حضرت معاویہؓ کی بے شمار بدعتوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے: ۱- بنائے مقصورہ اور

۲- خطبہ قبل الجمعہ۔ بنائے مقصورہ کے متعلق مصنف کے الفاظ یہ ہیں:

''یہاں تک کہ مسجد میں بھی ایک احاطہ بنوالیا ہے اور خود اس لیے اندر نماز پڑھتے ہیں یہ معاویہ کی بڑی بدعت ہے''۔ (ص۷۳)

حالانکہ جس نے کبھی تاریخ کی ورق گردانی کی زحمت گوارا کی ہوگی وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ اول اول حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ خلیفہ ثالث نے مقصورہ کی تعمیر کرائی تھی، اور ان کے بعد حضرت علیؓ بھی برابر مقصورہ ہی میں پڑھتے رہے۔ اور ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ صحابہ کے افعال بدعت نہیں ہیں، بلکہ حضرت عثمانؓ تو خلیفہ راشد ہیں، اس لیے بنائے مقصورہ سنت ہے **عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وسُنَّةِ الخُلفاءِ الرَّاشِدين**. علامہ سیوطی نے بنائے مقصورہ کو حضرت عثمان کی اولیات میں شمار کیا ہے[1]۔ اور بنائے مقصورہ سے مقصود کچھ خدانخواستہ اپنے لیے ایک امتیازی شان قائم کرنا نہ تھا، بلکہ اس قسم کے ناگہانی حادثہ سے محفوظ رہنا منظور تھا، جو حضرت عمر کی شہادت کی صورت میں رونما ہوا تھا۔

۴:- بنائے مقصورہ کے الزام سے کہیں زیادہ بے سروپا تقدیم خطبہ کا الزام ہے، اور یہ مصنف کی ایسی شرمناک غلطی اور ان کے مبلغ علم کی وہ شاندار رسوائی ہے جس کو پڑھ کر ہر اہل علم انگشت بدنداں رہ جائے گا۔ اس الزام کی تقریر مصنف نے یوں کی ہے: ''پہلے جمعہ میں خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا اب وہ نماز سے پہلے خطبہ پڑھتے ہیں، کیونکہ نماز کے بعد کوئی نمازی ان کا خطبہ سننے کو ٹھہرتا نہ تھا، نماز سے پہلے خطبہ ہونے لگا تھا تو نماز کی خاطر ہر مسلمان کو مجبوراً ٹھہرنا اور خطبہ سننا پڑتا ہے'' (ص۷۳)

حضرت معاویہؓ کی نسبت یہ محض بہتان ہے کہ انھیں نے پہلے نماز سے قبل خطبہ پڑھا اور یہ کہ انھوں نے اپنا خطبہ زبردستی سنانے کی غرض سے ایسا کیا، بلکہ حضرت علیؓ اور ان سے پہلے حضرت عثمانؓ اور ان سے پہلے حضرت عمرؓ اور ان سے قبل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی مدۃ العمر نماز سے پیشتر ہی خطبہ پڑھا ہے، اور خود سرور کائنات ﷺ کا بھی یہی معمول تھا، صحیح

(۱) تاریخ الخلفاء: ۱۱۲

بخاری میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے عہد میمنت مہد میں اور اسی طرح حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانۂ خلافت میں بھی جمعہ کی اذان جب خطیب منبر پر بیٹھ لیتا تھا جب ہوتی تھی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ خطبہ نماز سے پہلے ہوتا تھا، ورنہ کہنا پڑے گا کہ اذان بھی بعد نماز ہوتی تھی اور اس کا کوئی عقل مند قائل نہیں ہوسکتا، نماز کے بعد اذان کا کیا فائدہ! اس حدیث کے علاوہ اور احادیث میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ہاں مراسیل ابی داؤد کی ایک روایت بالکل صریح ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی خود سرور کائنات ﷺ نماز کے بعد خطبہ پڑھا کرتے تھے، لیکن ایک بار بہت سے لوگ یہ خیال کر کے کہ خطبہ سننا کچھ ضروری نہیں ہے اپنی اپنی نمازیں پوری کر کے چلے گئے اور خطبہ میں شریک نہیں ہوئے، اس کے بعد سے حضور نے خطبہ نماز جمعہ سے پیشتر پڑھنے کا معمول کر لیا۔

۵:-ص ۳۴ کی ایک عبارت سے کم علموں کو یہ دھوکا ہوگا کہ معاذ اللہ حضرت معاویہؓ شطرنج بھی کھیلا کرتے تھے، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے، حضرت معاویہؓ کیا کسی صحابی کی طرف شطرنج بازی کی نسبت کرنا افترا ہے، امام بیہقی نے شطرنج کی ممانعت پر صحابہ کرام کا اجماع نقل کیا ہے اور جو صحابہ کی طرف اس کی نسبت کرے اس کا نہایت شد و مد سے رد کیا ہے اور فرمایا کہ جو کوئی کسی صحابی کی طرف اس کی نسبت کرے وہ غلط گو ہے:

ومَن نَقَل عن واحدٍ مِنَ الصحابةِ أنه رَخَّصَ فيه فهو غالطٌ[1]۔

۶:-اس مقام سے ایک ناواقف یہ نتیجہ بھی نکالے گا کہ معاذ اللہ حضرت معاویہؓ کی کوئی کنیز بانسری سے آپ کا جی بہلایا کرتی تھی، حالانکہ ایک واقف کار شخص کو بخوبی معلوم ہے کہ سلف کا دامن ان معاصی کے داغوں سے یکسر پاک ہے، چنانچہ امام ابوالعباس قرطبی کا مقولہ علامہ ابن حجر مکی نے نقل کیا ہے کہ بانسری وغیرہ کا سننا اجماعی طور پر حرام ہے، اس کی حرمت میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، سلف اور خلف کے ائمہ میں کسی کا قول اس کی اباحت کی نسبت میں نے نہیں سنا[2]۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ مقولہ ہمارے مذہب کے بڑے

(۱) کف الرعاع: ۷۵ الابن حجر

(۲) کف الرعاع: ۱۱۱، زواجر: ۱/۱۷۶

بڑے اماموں نے نقل کیا ہے اور کچھ کلام نہیں کیا ہے (جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان تمام ائمہ کے نزدیک یہ مقولہ حرف بحرف درست ہے)، اسی طرح امام ابوالفتح رازی نے ان اشیا کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے[1]۔ پس اگر خدانخواستہ حضرت معاویہ نے ایسا کیا ہوتا تو یہ ائمہ اس کی حرمت پر اجماع نقل نہ کرتے اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ان ائمہ کو نہ معلوم ہوتا اور مصنف کو معلوم ہو جاتا، حقیقت یہ ہے کہ سراسر بہتان ہے اور اس کا منشا عصبیت جاہلیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۷:-مصنف کی عصبیت جاہلیہ اور کم نگاہی کا یہ ایک بدترین مظاہرہ ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو یہ مغالطہ دینے سے بھی باز نہیں رہے کہ حضرت معاویہ کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق جو بال اور ناخن ان کی منہ اور آنکھ میں رکھے گئے تھے، وہ حضور سرور عالم ﷺ کے موئے مبارک اور پاک ناخن نہ تھے، بلکہ ایک دوسرے عامی شخص کے تھے (ص ۹۱)۔

یہ تعصب اور کینہ پروری کی ایک بدترین مثال ہے، لیکن جس طرح آفتاب پر خاک ڈالنا ایک مجنونانہ حرکت ہے، اسی طرح کسی تاریخی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا ایک احمقانہ فعل ہے۔ اس تاریخی واقعہ کو دو مستند فاضلوں نے ذکر کیا ہے، جو فن حدیث میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ دونوں بزرگ حافظ سیوطی اور علامہ ابن حجر مکی ہیں، ابن حجر نے تطہیر میں ذکر کیا ہے کہ حضرت معاویہ نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں وصیت کی کہ بعد وفات ان کو آنحضور سرور کائنات ﷺ کا وہ کرتہ جو حضور نے ان کو بذات خود پہنایا تھا، اس طرح پہنایا جائے کہ کفن کے اور کپڑوں سے نیچے بدن سے ملا ہوا رہے؛ اور حضور کے ناخن مبارک جو رکھے ہوئے ہیں ان کو پیس کر آنکھ اور منہ میں ڈال دیا جائے (ص ۵۷) امام سیوطی نے موئے مبارک رکھنے کی وصیت کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔

☆......☆......☆

(۱) کف الرعاع: ۱۲۱

(۲) تاریخ الخلفا: ۱۳۵

فتوحات حضرت معاویہؓ

تاریخ کی روشنی میں

اسلامی تاریخ کا یہ نہایت مشہور واقعہ ہے کہ سرکار رسالت پناہ ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے متعدد قبیلے مرتد ہوگئے تھے، اس فتنہ کے استیصال اور مرتدین کی سرکوبی میں سرکار رسالت (ﷺ) کے خلیفہ اولین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جس بے مثال عزم وحزم، اور جس بے نظیر استقلال اور پامردی کا ظہور ہوا، وہ تاریخ کے نوادر میں محفوظ ہے، مجھے اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد اسلامی فتوحات کی راہ میں یہ فتنہ سنگِ گراں بن کر اس طرح حائل ہوگیا تھا، کہ جب تک اس کو راستہ سے ہٹا نہ لیا جاتا، اسلامی فتوحات کے آگے بڑھنے کی کوئی صورت ہی ممکن نہ تھی۔

جب صدیق اکبرؓ اس عظیم الشان مہم کو سر کر چکے اور اس فتنہ کی طرف سے ان کو کلی اطمینان ہوگیا، تو انھوں نے ۱۳ھ میں شام پر کئی طرف سے لشکر کشی شروع کی، فتح دمشق کے لیے جو لشکر یزید بن ابی سفیانؓ کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا تھا، اس لشکر کے علم بردار حضرت معاویہؓ تھے[1]۔

یزید بن ابی سفیانؓ مدینہ سے چل کر اذرعات پہنچے اور اس کو صلح سے فتح کیا، اس کے بعد عمان کی طرف بڑھے، عمان والوں نے بھی صلح کرلی، اس سے فارغ ہوکر بلقاء پر قبضہ کیا[2]۔ اتنے میں جمادی الاخریٰ ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ کا سانحۂ وفات پیش آگیا۔

جب حضرت فاروق اعظمؓ مسند آرائے خلافت ہوئے، تو انھوں نے حضرت

(۱) فتوح البلدان: ۱۱۵ (۲) ایضاً: ۱۳۳

ابوعبیدہؓ کو شام کا امیر الامراء مقرر کر کے روانہ کیا، حضرت ابوعبیدہؓ نے شام پہنچ کر حضرت عمروؓ بن العاص کو ایک جمعیت کے ساتھ سواحل اردن کی طرف روانہ کیا، وہاں رومیوں کی بہت بڑی تعداد مقابلہ کے لیے اکٹھی ہوگئی تھی، اور ہرقل نے بھی قسطنطنیہ سے ایک بڑی جماعت مدد کے لیے بھیجی تھی، حضرت عمروؓ نے اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے حضرت ابوعبیدہؓ سے مدد طلب کی، حضرت ابوعبیدہؓ نے یزید بن ابی سفیانؓ کی سرکردگی میں ایک فوج ان کی مدد کے لیے روانہ کی، اس فوج کے ہراول کے افسر حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ مدد پہنچنے پر عمروؓ اور یزیدؓ نے رومیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور سواحلِ اردن فتح کر لیے، اس جنگ میں حضرت امیر معاویہؓ نے بڑا کام کیا اور سواحل اردن کی فتح میں ان کا بڑا نمایاں حصہ تھا۔

بلاذری لکھتا ہے:

وكان لمعاويةؓ في ذلك بلاء حسن وأثر جميل[1].

بیروت وغیرہ پر یلغار:

ان فتوحات کے بعد دمشق کا معرکہ پیش آیا اور دوسرے امراءِ لشکر کی طرح یزید بن ابی سفیانؓ بھی اپنی ماتحت فوج کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہوگئے۔

۱۴ھ میں حضرت ابوعبیدہؓ کے زیر قیادت دمشق فتح ہو چکا تو یزید بن ابی سفیانؓ نے بحیرۂ روم کے ساحلی شہروں کی طرف کوچ کیا، اور صیداء، عرقہ، جبیل اور بیروت کو نہایت آسانی سے فتح کرلیا۔ اس دفعہ بھی ہراول کے افسر حضرت معاویہؓ ہی تھے، بلکہ عرقہ کو تو حضرت نے بنفس نفیس فتح کیا۔

حضرت عمرؓ کے آخری زمانہ اور حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور میں رومیوں نے ان شہروں میں سے بعض بعض پر قبضہ کرلیا، تو حضرت معاویہؓ نے دوبارہ از سرنو ان کو فتح کر کے قلعوں اور شہروں کی مرمت کرائی، اور ان میں فوجوں کو لا کر بھر دیا[2]۔

(۱) فتوح البلدان: ۱۲۳ (۲) ایضاً: ۱۳۳-۱۳۴

فتح یافہ اور قیساریہ:

یافہ فلسطین کی مشہور بندرگاہ ہے، بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ اس کو بھی حضرت معاویہؓ ہی نے فتح کیا۔ ۱۸ھ میں حضرت ابوعبیدہؓ عمواس کے طاعون میں انتقال فرماگئے، اور ان کے انتقال کی خبر دربار خلافت میں پہنچی، تو فاروقِ اعظمؓ نے ان کی جگہ صوبۂ شام کی حکومت اور گورنری کے لیے یزید بن ابی سفیانؓ کو نامزد کیا، اور ساتھ ہی یہ فرمان بھی بھیجا کہ قیساریہ پر فوج کشی کریں، قیساریہ بحرروم کے ساحل پر بڑا عظیم الشان شہر تھا، اس کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کے شہر پناہ پر ایک لاکھ آدمی ہر رات پہرہ دیا کرتے تھے، اور اس میں تین سو بازار تھے۔

قیساریہ کو فتح کرنے کی فکر میں مسلمان بہت دنوں سے لگے ہوئے تھے، اول اول ۱۳ھ میں حضرت عمروؓ بن العاص نے اس کے محاصرے کی ابتدا کی، لیکن ان کے محاصرے کی شکل یہ تھی کہ اثناء محاصرہ میں جب ان کی یا ان کی فوج کی کسی دوسرے محاذ پر ضرورت پیش آتی تو وہاں سے روانہ ہوجاتے، چنانچہ وہ اسی طرح اجنادین، فحل، دمشق، اور یرموک کی لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ ان لڑائیوں سے فارغ ہوکر انھوں نے قیساریہ کا پھر محاصرہ کیا، لیکن چند دنوں کے بعد اس کو چھوڑ کر مصر چلے گئے، جب وہ مصر چلے گئے اور یزیدؓ شام کے حاکم مقرر ہوئے، تو انھوں نے اپنے بھائی حضرت معاویہؓ کو اس کے محاصرے کا حکم دیا، اور دوسری روایت میں ہے کہ خود یزیدؓ ۱۷/ہزار کی جمعیت لے کر گئے، ایک مختصر سی جنگ کے بعد جب اہل قیساریہ قلعہ بند ہوگئے تو محاصرہ کیا، اثناء محاصرہ میں یزیدؓ بیمار ہوگئے اور حضرت معاویہؓ کو اپنا قائم مقام کر کے دمشق چلے آئے، اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو فتح کیا۔

مولانا شبلی کا بیان:

فتح قیساریہ کی کیفیت ''الفاروق'' کے مصنف کے الفاظ میں یہ ہے:

''امیر معاویہؓ نے بڑے سروسامان سے محاصرہ کیا، شہر والے کئی دفعہ

قلعہ سے نکل کر لڑے، لیکن ہر دفعہ شکست اٹھائی، تاہم شہر پر قبضہ نہ ہوسکا، ایک دن ایک یہودی نے جس کا نام یوسف تھا امیر معاویہؓ کے پاس آ کر ایک سرنگ کا نشان دیا، جو شہر کے اندر اندر قلعہ کے دروازہ پر گئی تھی، چنانچہ چند بہادروں کے ساتھ اس کی راہ قلعہ کے اندر پہنچ کر دروازہ کھول دیا، ساتھ میں تمام فوج ٹوٹ پڑی، اور کشتوں کے پشتے لگادیئے، مؤرخین کا بیان ہے، کم از کم عیسائیوں کی ۸۰ ہزار فوج تھی جس میں زندہ بہت کم بچے، چونکہ ایک مشہور مقام تھا، اس کی فتح سے گویا شام کا مطلع صاف ہوگیا''(۱)۔

فتح عسقلان وقبرس:

۱۸ھ کے اخیر میں یزید بن ابی سفیانؓ نے دمشق میں وفات پائی، تو ان کی جگہ پر حضرت معاویہؓ کو حضرت عمرؓ نے حاکم شام مقرر فرمایا، اور ان کو فرمان بھیجا کہ فلسطین کے جو مقامات رہ گئے ہیں، ان کو بھی فتح کرلیں، چنانچہ حضرت معاویہؓ نے عسقلان پر چڑھائی کی، معمولی لڑائی کے بعد دشمن نے صلح کی درخواست کی اور عسقلان مصالحت سے فتح ہوا۔ اس کے بعد حضرت معاویہؓ بار بار رومیوں سے نبرد آزما ہوئے۔ چنانچہ ۲۵ھ میں رومیوں کو پسپا کرتے ہوئے عمّوریہ تک پہنچ گئے (۲)۔

حضرت معاویہؓ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے کشتیوں کے ذریعہ سمندر کو عبور کر کے سمندر پار اسلامی جھنڈا لہرایا، ان سے پہلے مسلمانوں نے سمندر میں لشکر کشی نہیں کی تھی۔ حضرت معاویہؓ خلافتِ فاروقی ہی میں اس کے لیے مصر تھے، مگر حضرت عمرؓ نے اس کی اجازت نہیں دی، جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا اور حضرت معاویہؓ نے دریا کے سفر کی آسانیاں ان کے سامنے پیش کیں، یہ بھی بتایا کہ قبرس یہاں سے (حمص سے) بہت نزدیک ہے تو ۲۷ھ میں حضرت عثمانؓ نے ان کو لکھا کہ:

''اگر تم اپنی بی بی کو لے کر دریا کا سفر کرنے کو آمادہ ہو تو اجازت ہے، ورنہ نہیں''۔

(۱) الفاروق: ۸۲ (۲) تاریخ کامل: ۲۴

نیز یہ بھی تاکید کی کہ اس جنگ میں شرکت کے لیے تم خود آدمیوں کا انتخاب نہ کرو، نہ قرعہ اندازی کرو، بلکہ اپنی خوشی سے جو جائے اس کو جہاز پر سوار کرلو اور اس کی اعانت بھی کرو۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے اپنی بی بی فاختہ کو اپنے ساتھ لیا اور عکا سے کشتی پر سوار ہوئے، کشتیاں بہت زیادہ تعداد میں تھیں، صحابۂ کرام میں عبادہ بن الصامت ان کی بی بی ام حرام، ابوایوب انصاری، ابوالدرداء، ابوذر غفاری، فضالہ بن عبید، عمیر بن سعد، واثلہ بن الاسقع، عبداللہ بن کثیر مازنی، شداد بن اوس، اور حضرت مقداد، اور تابعین میں سے کعب احبار، اور جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہم جیسے لوگ ہم رکاب تھے۔

۲۸ھ یا ۲۹ھ میں یہ لشکر روانہ ہوا۔ جب یہ لشکر قبرس پہنچا تو وہاں کے حاکم نے صلح کی درخواست کی۔ حضرت معاویہؓ نے حسب ذیل شرائط پر اس کی درخواست منظور کی:

۱:- اہل قبرس سات ہزار دوسو دینار سالانہ خراج ادا کریں۔

۲:- رومیوں کی نقل وحرکت کی اطلاع مسلمانوں کو دیتے رہیں۔

۳:- اہل قبرس پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں پر اہل قبرس کی امداد ضروری نہیں ہے۔

۴:- مسلمانوں کو حق ہوگا کہ اپنے دشمنوں پر فوج کشی کے لیے قبرس کی راہ سے گذریں۔

یہ فتح نہایت عظیم الشان تھی، اور اس میں بہت سارا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، اسی جنگ میں حضرت ام حرامؓ کی شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا۔

فتح شِمْشَاط:

حضرت عثمانؓ کے عہد میں امیر معاویہؓ نے آرمینیہ کے شہر شمشاط پر حبیب بن مسلمہ اور صفوان بن معطل کو لے کر حملہ کیا اور لڑ کر فتح کیا[1]۔

(۱) فتوح البلدان: ۱۷۲

فتح مَلَطْیَہ:

اس شہر کو پہلے حبیب نے عیاض بن غنم کے حکم سے فتح کیا تھا، لیکن پھر مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا، جب حضرت معاویہؓ شام وجزیرے کے حاکم مقرر ہوگئے تو انھوں نے دوبارہ حبیب کو مامور کیا۔

چنانچہ انھوں نے دوبارہ پھر فتح کیا، حضرت معاویہؓ نے وہاں اپنا ایک عامل مقرر کیا اور اس کے ساتھ ایک فوج بھی وہاں تعینات کردی[1]۔

فتح افریقیہ:

افریقیہ کو سب سے پہلے عبداللہ بن سعد نے فتح کیا تھا، لیکن جب ہرقل نے دیکھا کہ افریقیہ کا خراج - جو مسلمانوں کے تسلط سے پیشتر دربار قسطنطنیہ میں آیا کرتا تھا - بند ہوگیا، تو اس نے ایک بطریق کو مامور کیا کہ وہ افریقیہ جائے، اور جس قدر سالانہ رقم مسلمانوں کو دی جاتی ہو اتنی ہی وہ بھی وصول کرے۔

بطریق گیا اور قرطاجنہ میں اہل افریقیہ کو جمع کر کے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

اہل افریقیہ نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، نتیجہ لڑائی اور فتنہ کی صورت میں ظاہر ہوا، بطریق اس میں غالب رہا، اور اس نے وہاں کے حاکم کو نکال دیا، جو فوراً ہی شام چلا آیا۔

اس وقت شام میں حضرت معاویہؓ کی مستقل حکومت تھی، حضرت معاویہؓ سے اس نے سارا قصہ بیان کیا، حضرت معاویہؓ نے معاویہؓ بن حدیج کو افریقیہ کی مہم پر مامور کیا، اسکندریہ پہنچ کر حاکم افریقیہ مرگیا، معاویہؓ بن حدیج کو اس کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی، اور وہ افریقیہ پہنچ گئے، اور ایک جرار لشکر کے ساتھ قمونیہ میں پڑاؤ ڈالا، بطریق نے ان کے مقابلہ پر ۳۰ ہزار جنگی بہادر بھیجے۔

حضرت معاویہؓ کو خبر ملی تو انھوں نے ایک لشکر مدد کے لیے روانہ کیا، اور ایک سخت

(۱) فتوح البلدان: ۱۹۳

معرکہ کے بعد رومیوں کو شکست ہوئی۔

اس کے بعد قلعہ جلولاء کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا، کسی طرح قلعہ کی فصیل منہدم ہوگئی، مسلمان قلعہ میں داخل ہوکر اس پر قابض ہوگئے، اس کے بعد تمام اطراف میں مسلمانوں کی فوجیں پھیل گئیں، اور سب نے اطاعت قبول کرلی۔ جب یہ مہم سر ہوگئی تو حضرت معاویہؓ بن حدیج مصر واپس آگئے۔

یہ ۴۷ھ اور ۵۰ھ کے درمیان کا واقعہ ہے، ۵۰ھ میں حضرت معاویہؓ نے معاویہؓ بن حدیج کو افریقیہ کی حکومت سے معزول کرکے ان کی جگہ پر عقبہؓ بن نافع کو مقرر فرمایا، عقبہ دس ہزار سواروں کی جمعیت لے کر افریقیہ روانہ ہوئے، جب وہاں پہنچے تو بربر قوم کے بہت سے لوگ بھی ساتھ ہولیے، جس کی وجہ سے ان کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ اہل افریقیہ کی عادت تھی کہ جب کوئی مسلمان امیر آتا تو اس کی اطاعت کرلیتے، بلکہ بہت سے دائرۂ اسلام میں بھی داخل ہوجاتے، لیکن جہاں وہ امیر واپس ہوتا بدعہدی شروع کردیتے، اور مرتد ہوجاتے، اس لیے عقبہؓ نے اچھی طرح سرکوبی کی، اور ساتھ ہی یہ مناسب سمجھا کہ یہاں ایک شہر آباد کرکے فوجی کیمپ قائم کیا جائے اور اس میں کافی تعداد میں مسلمان آباد کیے جائیں، وہاں ان کے اہل وعیال بھی ہوں اور ان کو جائدادیں بھی دی جائیں، تاکہ آئندہ اہل افریقیہ کو شورش پیدا کرنے اور بغاوت پھیلانے کا موقع نہ ملے۔ اس خیال کو عملی جامہ دینے کے لیے انھوں نے ایک زمین کا انتخاب کیا، وہ نہایت گھنا جنگل تھا، سانپ، بچھو، اور ہر قسم کے درندوں کی وہاں نہایت کثرت تھی، عقبہ بہت نیک اور مستجاب الدعوۃ بزرگ تھے، انھوں نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی، اس کے بعد جنگل میں کھڑے ہوکر ایک دفعہ پکار دیا کہ:

> اے جنگل کے سانپو اور درندو! ہم رسول اللہ ﷺ کے رفیق اور ساتھی ہیں اور اب ہم یہاں قیام کریں گے لہذا تم یہاں سے رخصت ہوجاؤ، اس کے بعد اگر ہم نے تم میں سے کسی کو یہاں پایا تو جیتا نہ چھوڑیں گے۔

اس اعلان کے بعد لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چوپائے اور درندے اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے چلے جارہے ہیں، اس واقعہ کا بربر قوم کے بھی بہتیرے افراد نے مشاہدہ کیا، ان پر اس کا ایسا اچھا اثر پڑا کہ وہ مسلمان ہوگئے، حضرت عقبہؓ نے جانوروں کے نکل جانے کے بعد جنگل کے درخت کٹوا کر شہر پناہ کی بنیاد ڈلوائی، شہر پناہ کا دَور ساڑھے چودہ ہزار ہاتھ تھا، اس کی تیاری کے بعد جامع مسجد بنوائی، اور وہاں آباد ہونے والوں نے اپنے اپنے مکانات اور مختلف مسجدیں بنوائیں، تقریباً پانچ برس کی مدت میں یہ ساری چیزیں بن کر تیار ہوگئیں اور شہر آباد ہوگیا، یہ شہر سارے عالم میں قیروان کے نام سے مشہور ہے۔

اس پانچ برس میں حضرت عقبہؓ اطراف میں برابر فوجیں بھی بھیجتے رہے، چنانچہ نہایت کثرت سے بربری لوگ اس مدت میں مسلمان ہوئے، اور ان کی وجہ سے قیروان میں آباد ہونے والے مسلمانوں کے دل بھی بہت مضبوط ہوگئے، اور اسلام کا قدم خوب اچھی طرح جم گیا[1]۔

رُوڈِس:

۵۰ھ کے بعد ایک طرف تو افریقیہ میں یہ ہورہا تھا، دوسری طرف حضرت معاویہؓ نے جنادہؓ بن ابی امیہ کو روڈس کی طرف روانہ کیا، یہ جزیرہ نہایت شاداب وزرخیز تھا اور تقریباً ساٹھ میل میں پھیلا ہوا تھا۔ زیتون، انگور، اور دوسرے میوے بکثرت پیدا ہوتے تھے، پانی نہایت شیریں تھا۔ جنادہؓ نے ۵۲ھ میں لڑکر اس جزیرہ کو فتح کیا، اور حضرت معاویہؓ کے حکم سے اس میں بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی آباد کی، حضرت معاویہؓ نے یہ انتظام بھی کیا تھا، کہ سال بسال باری باری سے مسلمانوں کو وہاں رہنے کے لیے بھیجا کرتے، مشہور تابعی امام حضرت مجاہد بھی وہاں مقیم تھے[2]۔ کامل میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو مسلمان روڈس میں رہتے تھے، ان کے لیے حضرت معاویہؓ نے وظیفہ جاری کر رکھا تھا (ص

(۱) کامل ابن اثیر: ۱۸۴/۳ (۲) فتوح البلدان: ۲۴۴

۱۹۵)۔ روڈس کی فتح نے رومیوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا، روڈس کو فتح کرنے کے بعد جنادہ نے جزیرۂ ارواڈ کو فتح کیا، وہاں بھی حضرت معاویہؓ نے مسلمانوں کو آباد کیا، ارواڈ کی فتح میں حضرت مجاہد بھی شریک تھے، تبیع کو مجاہد نے اسی جزیرہ میں قرآن پاک پڑھایا تھا، ارواڈ قسطنطنیہ کے قریب ہے[1]۔ جنادہ نے جزیرہ کریٹ پر بھی حملہ کیا تھا، مگر فتح نہیں ہو سکا، ولید کے زمانے میں اس کا کچھ حصہ فتح ہوا۔

صقلیہ:

جزیرۂ سسلی پر -جس کو عرب صِقِلِّیَہ کہتے ہیں- حضرت معاویہؓ کے عہد میں سب سے پہلی دفعہ حملہ ہوا، حضرت معاویہؓ نے معاویہ بن حدیج کو اس مہم پر مامور فرمایا تھا، اگرچہ اس وقت فتح نہیں ہوا، لیکن معرکہ پیش آیا، اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا، سونے چاندی کے بہت سے بت مال غنیمت میں ہاتھ لگے، حضرت معاویہؓ نے ان کو فروخت کرنے کے لیے ہندوستان بھیجنے کا حکم دیا۔

صقلیہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں فتح نہیں ہوا، لیکن اس کی داغ بیل حضرت معاویہؓ ہی نے ڈالی تھی، اس لیے مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا کے اصول سے اس فتح میں ان کا بھی حصہ ہے۔

الغرض اسلامی فتوحات میں حضرت معاویہؓ کا بہت وافر حصہ ہے۔ ان کے کارناموں پر مشتمل ایک مستقل کتاب "مغازی معاویہ" کا حوالہ فتوح البلدان (ص۱۷۲) میں موجود ہے۔

☆......☆......☆

(۱) فتوح البلدان: ۲۴۴

مکتوب گرامی حضرت محدث الاعظمی

بہ سلسلہ

یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ

علامہ ابن عابدین -شامی- کے بھائی کے پوتے مفتی دمشق شیخ محمد ابوالیسر ابن عابدین نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام "اغالیط المورخین" رکھا ہے، وہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو ترجمہ بار بار شائع کیا جائے۔

اس کتاب کے ایک مضمون کا عنوان ہے "یزید بن معاویہ رحمہ اللہ"۔ اس میں سب سے پہلے یہ لکھتے ہیں کہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں یزید کے بہت سے معائب ذکر کیے ہیں، بلکہ اس پر لعنت بھی بھیجی ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مضمون ان کا نہیں ہے، بلکہ کسی نے ان کی کتاب میں تحریف کی ہے، اور یہ عبارتیں داخل کر دی ہیں، یا پھر سیوطی نے بے تحقیق کیے ہوئے دوسرے مؤرخین کی اندھی تقلید میں یہ باتیں لکھ دی ہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: مؤرخین اہل بیت پر یزید کے مظالم کی جو داستان بیان کرتے ہیں، وہ سب بے سر و پا افسانے ہیں، اس باب میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ یزید کی بیعت پر مسلمانوں کا اجماع ہو چکا تھا، اور اس کی امارت شرعی طریق پر منعقد ہو چکی تھی، اس لیے اس کی حفاظت میں اس نے تفریق بین المسلمین کے مرتکبین کی سرکوبی کی، اس کی بیعت بیعتِ شرعیہ تھی، اور اس پر خروج بغی تھا، باقی رہے وہ حضرات جن کو اس کی بیعت سے استنکاف واعراض تھا، وہ صرف اس لیے تھا کہ وہ اپنے کو زیادہ حق دارِ خلافت سمجھتے

تھے، اور وہ بلاشبہہ یزید سے بہت زیادہ متقی و پرہیز گار تھے، اس لیے ان کا اجتہاد یہ تھا کہ ان کو امام و خلیفہ ہونا چاہئے، لیکن ان کا یہ اقدام انعقاد بیعت اور شرعی طور پر یزید کے امیر منتخب ہو جانے اور امارت کے تحقق کے بعد تھا، اس لیے اس نے اپنی بیعت سے اسی طرح مدافعت کی جس طرح حضرت علیؓ نے، لیکن اس نے اپنے امراء و عمال کو اہل بیت کی بے حرمتی، اور ان پر ظلم و تعدی کا کبھی حکم نہیں دیا تھا۔

پھر دمیری شافعی کی حیاۃ الحیوان (ص۵۱) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب شمر حضرت حسینؓ کا سر مبارک یزید کے پاس لایا اور اس حادثۂ فاجعہ کی تفصیل سنائی، تو یزید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور ان ظالموں سے کہا کہ میں قتل حسین کے بغیر بھی تمھاری اطاعت کا قائل ہوسکتا تھا، خدائے تعالیٰ ابن مرجانہ پر لعنت کرے، اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو حضرت حسین سے درگذر کرتا۔

اس کے بعد تاریخ ابن جریر سے اہل بیت نبوی کے ساتھ اس کے حسن سلوک کے واقعات نقل کیے ہیں پھر صحیح بخاری کی حدیث أَوَّلُ جَيْشٍ يَرْكَبُونَ الْبَحْرَ، اور حدیث أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُوْنَ مَدِينَةَ قَيْصَرَ نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ دونوں وصف یزید کے لیے ثابت ہیں، لہٰذا پہلی حدیث کی بنا پر قَدْ أَوْجَبُوْا کے مصادیق میں اور دوسری حدیث کی بنا پر مَغْفُورٌ لَّهُم میں یزید داخل ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اور جو یہ کہتا ہے کہ ''وہ امیر کا بیٹا تھا کرسی پر بیٹھا رہا ہوگا'' اس کے منھ میں خاک۔ اس کے منھ سے یہ کیوں نہیں نکلا کہ وہ ایک جلیل القدر فقیہ صحابی، اور بارگاہ نبوی کے امین کاتب کا لڑکا تھا۔ اس کی تعبیر سے حضرت معاویہؓ کے حق میں سوء ادب، بدعقیدگی، اور اہانت مترشح ہوتی ہے۔ یہ فقرہ قائل کی ناواقفیت کی غمازی کرتا ہے، اگر اس کی نظر اصابہ پر بھی ہوتی تو یہ بات منھ سے نہ نکالتا۔ حافظ ابن حجر ناقل ہیں کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ جب جنگ قسطنطنیہ میں مریض ہوئے تو ان کی وفات سے کچھ پہلے یزید ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا خواہش ہے؟ انھوں نے

فرمایا میری خواہش یہ ہے کہ جب میں مروں تو مجھ کو کسی سواری پر سوار کر کے دشمن کی سرزمین میں لے چلو اور جہاں تک گھس سکو گھستے چلے جاؤ، جہاں سے آگے بڑھنا ناممکن ہو جائے وہاں مجھ کو دفن کر کے واپس چلے آؤ، یزید نے حضرت ابوایوبؓ کی یہ وصیت پوری کی۔ کیا کرسی پر بیٹھنے والا یہ کرسکتا ہے؟

پھر معترضین کو کیا معلوم نہیں کہ راہ جہاد میں کرسی پر بیٹھے رہنے کا بھی اجر ہے، کیا ان کو معلوم نہیں کہ ﴿وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِياً إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ﴾ **الآية**۔ اور کیا ان کی نظر سے **أبو الها و أرواثها** والی حدیث نہیں گذری ہے؟

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، مفتی دمشق آگے لکھتے ہیں کہ شیخ سنان الدین اماسی نے تبیین المحارم میں -جو حنفی مذہب کی جلیل القدر کتاب ہے- یزید کا ایک فرمان اہل بصرہ کے نام حدیث نبوی کے حوالہ سے مال غنیمت میں خیانت نہ کرنے کے باب میں بھیجا ہے، تو ایسا شخص جو ایسی روایت بیان کرے، اور لکھ کر بھیجے، وہ ان خبیث حرکات کا مرتکب ہوسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اور کیا ایسی خبیث حرکتوں کے مرتکب کی روایت اور فرمان کا کسی فقہی مسئلہ کی دلیل کے طور پر پیش کرنا جائز ہے؟

اس کے بعد مناوی کا رد کیا ہے، جنھوں نے یزید کے **مغفور له** ہونے میں شک وشبہہ کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح تفتازانی کے کلام کو مردود قرار دیا ہے۔

پھر روح البیان سے حافظ ابن الصلاح کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ جو گروہ یزید پر لعنت نہیں کرتا اور نہ اس کی دوستی کا دم بھرتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بادشاہان اسلام کا سا برتاؤ کرتا ہے، وہی حق پر ہے، یہی صحیح تاریخ اور قواعد شریعت کے مطابق ہے۔

اس کے بعد شہاب رملی کے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ یزید پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے، ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے، ان میں سے صاحب خلاصہ وغیرہ ہیں اور انوار -کتاب کا نام- میں ہے:

لا يجوز لعنُ يزيدَ ولا تكفيرُه فإنَّه من جملة المؤمنين إنْ

شاء رحِمَه وإن شاءَ عذَّبَه.

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اہل سنت و جماعت کا مذہب وہی ہے، جو بدء الامالی میں مذکور ہے، پھر بدء الامالی کا یہ شعر نقل کیا ہے:

ولم يلعَنْ يـزيداً بعد موتٍ　　سوى المكثار في الإغراء غال

پھر علامہ علی قاری کے حوالہ سے تفتازانی کا رد نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ تفتازانی کا رد محقق ابن الہمام کے شاگرد کمال ابن ابی شریف نے کیا ہے، آخر میں لکھا ہے کہ تفتازانی کا قول انتہائی غیر منصفانہ اور جادۂ صواب سے منحرف ہے۔

آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ صحاح کی چار حدیثوں سے یزید کے حسن حال کی شہادت ملتی ہے، وہ چاروں حدیثیں ایسی ہیں کہ یزید کی منقصت کی کوئی دلیل ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اور جو کچھ یزید کے بارے میں ان حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے اس کو حق وانصاف وایمانداری کے ساتھ رد نہیں کیا جاسکتا، الا یہ کہ بے انصافی، تعصب اور غلط روی اختیار کی جائے۔

ان میں سے پہلی حدیث صحیح بخاری کی ہے، جس میں مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے صاحبزادوں اور خدم وحشم کو جمع کر کے کہا کہ ارشاد نبوی ہے، بدعہدی کرنے والے کے لیے ایک جھنڈا قیامت کے دن نصب کیا جائے گا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے اس شخص (یزید) سے اللہ اور رسول کے نام پر بیعت کی ہے، لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس کی بیعت توڑے گا اور کسی دوسرے ہاتھ پر بیعت کرے گا، اس سے میرا تعلق باقی نہ رہے گا۔

یہ ہے اغالیط المورخین کے (ص ۱۱۷ سے ص ۱۳۲) کا خلاصہ، **وفيه كفاية لمن له أدنى دينٍ وديانة،**

(مولانا) حبيب الرحمن الأعظمی

بقلم رشید احمد الاعظمی ۳؍ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

بشکریہ: مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب

خیرآبادی مدظلہ (دارالعلوم دیوبند)

سیرت ابراہیم بن ادہم

اوران کے مدفن کی تحقیق

حضرت ابراہیم بن ادہم تعارف سے مستغنیٰ ہیں، وہ باتفاق امت سرحلقہ اصفیائے کرام وسرخیل مشائخ طریقت، زہد وتقویٰ میں منفرد اور تورع وعبادت میں یگانۂ روزگار تھے۔ متقدمین میں یعقوب بن سفیان فسوی [۱]، ابن حبان [۲]، ابونعیم اصبہانی [۳]، اور پیر ہرات شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری [۴] وغیرہ نے بہت بلند الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے، فسوی کہتے ہیں: **هو من خيار الأفاضل** [۵] اور ابن حبان کہتے ہیں: **كان صابراً على الجهاد والفقه والورع الدائم والسخاء الوافر** [۶] اور ابونعیم نے پچاسی صفحہ میں ان کا ذکر خیر کیا ہے، حافظ ذہبی نے ابراہیم کو صرف زاہد کہہ کر ذکر کیا تو امام یافعی نے سخت برہمی کا اظہار فرمایا، اور لکھا کہ یہ ان کی توہین اور ان کے مرتبہ کو گھٹانا، اور ان کی عظمت ورفعت کو کم کر کے دکھانا ہے [۷]۔

ابراہیم بن ادہم قدس سرہ بلخ میں پیدا ہوئے تھے، اور وہیں رہتے سہتے تھے، لیکن جب امیری چھوڑ کر فقیری اختیار کی اور رزق حلال کی فکر دامن گیر ہوئی، تو انھوں نے شام کے علاقہ میں بودوباش کو ترجیح دی، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے بعض مشائخ سے رزق حلال کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: کہ **إذا أردت الحلال فعليك**

(۱) التوفی ۲۷۷ھ　(۲) التوفی ۳۵۴ھ　(۳) التوفی ۴۳۰ھ

(۴) التوفی ۴۸۱ھ　(۵) تہذیب التہذیب: ۱/۱۰۳

(۶) تہذیب　(۷) مرآۃ الجنان: ۳۴۹

ببلاد الشام تم کو حلال کی تلاش ہو تو ملک شام جاؤ[(۱)]۔

اور فرماتے تھے کہ مجھے سکون کی زندگی اور اطمینان تو شام کے شہروں ہی میں نصیب ہوا، اِس پہاڑ سے اُس پہاڑ پر اور اِس چوٹی سے اُس چوٹی پر منتقل ہوتا رہتا ہوں، مجھ کو دیکھ کر کوئی کہتا ہے کہ نیم پاگل ہے، اور کوئی کہتا ہے کہ حمّال (قلی) ہے۔ پھر (شقیق بلخی سے) فرماتے تھے کہ شقیق! ہماری نگاہ میں کوئی شخص حج اور جہاد کے ذریعہ باعظمت نہیں ہوا، ہمارے نزدیک تو جس نے اس پر دھیان رکھا کہ اس کے پیٹ میں جو دو روٹیاں جا رہی ہیں، وہ حلال کمائی کی ہیں، بس وہی باعظمت ہوا ہے[(۲)]۔

کسی نے پوچھا کہ آپ شام میں کب سے ہیں؟ فرمایا چوبیس سال سے، میں جہاد کے لیے آیا، نہ رباط کے لیے، پوچھا پھر کس لیے آئے؟ فرمایا حلال روٹی سے شکم سیر ہونے کے لیے[(۳)]۔

حضرت ابراہیم نے جس حلال روزی کی تلاش میں شام کا رخ کیا تھا اس کے ذرائع کیا تھے؟ شیخ الاسلام انصاری فرماتے ہیں:

بشام رفت وآنجا کسب می کرد و درطلب قوت حلال ناطور بانی می کرد۔	یعنی شام میں باغوں کی رکھوالی کر کے روزی کماتے تھے۔

باغبانی کے علاوہ صور، غزہ، اور عسقلان میں کھیت کاٹنے کا کام بھی کرتے رہے اور فلسطین میں ڈول سے آب پاشی بھی کی ہے۔

ایک بار ابراہیم اور ان کے ایک رفیق روزے سے تھے، اس دن افطار کا کوئی سامان نہ تھا، رفیق نے مشورہ دیا کہ چلئے باب الرستن میں کھیت کاٹنے والوں کے ساتھ ہم بھی کھیت کاٹ کر افطار کے لیے کچھ حاصل کریں، انھوں نے اس مشورہ کو قبول کیا، اور باب الرستن گئے، ان کے رفیق کو تو کھیت والوں نے ایک درہم پر رکھ لیا، مگر ابراہیم کو نہیں لیا، یہ کہا

(۱) اس دور کے خاص حالات میں علاقۂ شام کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہوگا (الفرقان)

(۲) حلیۃ الاولیاء: ۷/۳۶۹ (۳) حلیہ: ۷/۳۷۳

کہ وہ بہت کمزور ہیں، پھر بہت کہنے سننے کے بعد ان کو صرف چار دانق پر رکھ لیا، شام کو مزدوری وصول کر کے ان کے رفیق نے بازار سے بقدر ضرورت کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جو باقی بچا اس کو خیرات کر دیا، جب سامان لے کر ابراہیم کے پاس آئے تو ابراہیم نے کہا کہ ہم نے مزدوری تو پوری وصول کر لی، لیکن معلوم نہیں کام بھی پورا کیا یا نہیں۔ یہ سن کر رفیق کو بہت غصہ آیا، جب ابراہیم نے ان کا غصہ دیکھا تو فرمایا کہ اچھا کوئی مضائقہ نہیں چلو تم ضامن بن جاؤ کہ ہم نے پورا پورا کام کر دیا ہے، ان کے رفیق کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو کھانا اٹھایا اور لے جا کر اس کو بھی خیرات کر دیا۔

میں نے ابراہیم کے کسب معاش کے ان حالات کا ذکر اس لیے کیا کہ اس میں ہمارے لیے بہت بڑا درس عبرت ہے، آج ہم جن بزرگوں کے سلسلہ میں داخل ہو کر اور جن کی روحانیت سے مستفید ہو کر اپنی بزرگی کا سکہ جمائے ہوئے ہیں، ان کی زندگی کا نقشہ یہ تھا، ان کے یہاں کسب حلال کا یہ اہتمام تھا، اور ہمارے یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہم کسب معاش کے لیے بہت معقول ماہانہ پر کسی کام کی ذمہ داری لے لیتے ہیں، مگر پورے طور پر کام کر کے اس کسب کو حلال طیب بنانے کا بالکل اہتمام نہیں کرتے، بلکہ میں تو یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بہت سے مشائخ کسب معاش کا کوئی ذریعہ اختیار نہیں کرتے، ان کی گذر اوقات صرف مریدوں کے عطایا اور نذرانوں پر موقوف ہے، جس کے لیے سال میں ایک دو بار وہ دورہ کر لیتے ہیں، اگر کوئی بزرگ متوکلانہ زندگی بسر کرنے کے خیال سے ترک اسباب کا ارادہ کر لیں، تو یہ قابل اعتراض بات نہیں ہے؛ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ کسی شرعی ضرورت کے سوا گھر سے نہ نکلیں، مریدوں کے یہاں دورہ نہ کریں، بلکہ ہر اس صورت حال سے کنارہ کشی اختیار کریں جس سے تعرُّض للسوال یا حسن طلب کی صورت پیدا ہو۔

بعض حضرات کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ – مسترشدین کی درخواست پر سہی – کسی مقام پر رمضان گزارنے کے لیے چلے جاتے ہیں، اس صورت میں ہر چند کہ ان کی اور مریدین

کی نیت صالح ہو، پھر بھی حضرت ابراہیم بن ادہم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ضروری ہے، اس لیے کہ صحیح معنوں میں جو حضرات رتبۂ مشیخت کو پہنچے ہوئے ہیں، ان کی دیکھا دیکھی دوسرے نااہل اور غیر عالم پیرزادے رمضان کے علاوہ بھی مہینہ دو مہینہ بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک مریدوں کی بستیوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں؛ حالانکہ ان کے لیے تو سرے سے مرید کرنا اور مسند ارشاد پر بیٹھنا ہی جائز نہیں ہے، نہ بیعت ہونے والوں کو ایسے پیروں سے بیعت ہونا جائز ہے۔

جون پور کے ربانی عالم، اور سید احمد شہیدؒ کے خلیفۂ برحق مولانا کرامت علی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''القول الثابت'' میں فرماتے ہیں:

''جس کو دونوں علم نہیں ہے (یعنی احکام شرعیہ اور علم اسرار یعنی تصوف) وہ عالم نہیں ہے اور جب عالم نہیں ہے تو مرشدی کا رتبہ بھی اس کو نہیں ہے۔''

یہ بات مولانا جون پوری نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (سرحلقۂ سہروردیہ) کی کتاب ''عوارف المعارف'' کے حوالہ سے لکھی ہے، پھر حضرت نظام الدین اولیاء کے علم حاصل کرنے پھر مرید ہونے اور خلافت پانے کا واقعہ ''اخبار الاخیار'' شیخ عبدالحق دہلوی سے نقل کر کے فرماتے ہیں کہ:

''اس سب مضمون سے ثابت ہوا کہ جو شخص دونوں علم کا عالم نہیں، اس سے بیعت کرنا اور اس کو خلافت نامہ دینا درست نہیں ہے...... بلکہ جس شخص نے ایسے جاہل سے بیعت کیا ہے، اس پر واجب ہے کہ اس کی بیعت سے توبہ کرے، اور اس شخص سے کنارہ کرے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ (اور کنارہ کر جاہلوں سے)۔

الغرض مسلمانوں پر واجب ہے کہ جو شخص کہ مرشدی کا دعویٰ کرتا ہو یا کسی مرشد کی گدی پر بیٹھا ہو، اس کے عقیدے اور علم اور مذہب کو خوب تحقیق کرلیں، اور یہ بات بھی دریافت کرلیں کہ رتبۂ مشیخت کا اس کو حاصل ہے یا

نہیں، یہ بات دریافت نہ کر کے مرید ہونے سے بڑی بڑی خرابی ہوتی ہے۔ اور اگر کسی مرشد سے وعدہ کر چکا ہے کہ ہم آپ سے بیعت کریں گے اور اس شخص میں علم احکام اور علم اسرار اور رتبۂ مشیخت نہ پایا تو اس سے بیعت نہ کرے، کیونکہ خلاف شرع کام کا وعدہ کیا، تو اس کا وفا کرنا درست نہیں [۱]۔

اور مولانا کرامت علی کے پردادا پیر اور تمام دیوبندی وغیر دیوبندی اکابر علماء کے شیخ الکل اور بالخصوص سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کے تمام مشائخ کے شیخ المشائخ اور استاذ الکل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی القول الجمیل میں فرماتے ہیں: (ہم القول الجمیل کی عربی عبارت کے بجائے اس کا ترجمہ شفاء العلیل (جو مولانا خرم علی کی تالیف ہے) سے نقل کرتے ہیں، اصل عبارت القول الجمیل مترجم ص ۱۳-۱۵ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''بیعت لینے والے میں یعنی پیر اور مرشد میں چند امور شرط ہیں: شرط اول، علم قرآن اور حدیث کا، اور میری یہ مراد نہیں کہ پلے سرے کا مرتبہ علم کا مشروط ہے، بلکہ قرآن میں اتنا علم ہونا کافی ہے کہ تفسیر مدارک یا جلالین کو یا سوا ان کے مانند تفسیر وسیط یا وجیز واحدی کے محفوظ کر چکا ہو اور کسی عالم سے اس کو تحقیق کر لیا ہو اور اس کے معانی اور ترجمۂ لغات مشکلہ کو اور شان نزول اور اعراب قرآنی اور قصص اور جو اس کے قریب ہے اس کو جان چکا ہو، اور حدیث کا علم اتنا کافی ہے کہ ضبط اور تحقیق کر چکا ہو مانند کتاب مصابیح اور مشارق کے اور اس کے معانی دریافت کر چکا ہو، اور اس کی شرح غریب یعنی لغات مشکلہ کا ترجمہ اور اعراب مشکل اور تاویل معضل کی بنا پر رائے فقہائے دین کی معلوم کر چکا ہو'' (ص ۱۳)۔

اور عالم ہونا مرشد کا تو ہم نے اتنے واسطے شرط کیا ہے کہ غرض بیعت

(۱) القول الثابت ص ۲۱-۲۲، مطبوعہ مطبع محمدی سیالدہ (کلکتہ ۱۲۹۲ھ)

سے مرید کو امر کرنا ہے مشروعات کا اور روکنا اس کو خلاف شرع سے اور اس کی
رہنمائی طرف تسکین باطنی کے اور دور کرنا بدخوؤں کا اور حاصل کرنا صفات حمیدہ
کا، پھر مرید کا عمل میں لانا اس کو جمیع امور مذکور میں، سو جو شخص عالم اور واقف ان
امور سے نہ ہوگا اس سے یہ کیوں کر متصور ہوگا۔

﴿ف﴾ مترجم کہتا ہے ،سبحان اللہ! کیا معاملہ بالعکس ہوگیا ہے،
فقرائے جہاں کو اس وقت میں یہ خبط سمایا ہے کہ پیری مریدی میں علم کا ہونا کچھ
ضروری نہیں، بلکہ علم درویشی کو مضر ہے، اس واسطے کہ شریعت کچھ اور ہے اور
طریقت کچھ اور، حالانکہ صوفیان قدیم کے کتب اور ملفوظات میں مثل قوۃ
القلوب اور عوارف المعارف اور احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت اور فتوح الغیب
اور غنیۃ الطالبین تصنیف حضرت عبدالقادر جیلانی میں صاف مصرح ہے کہ علم
شریعت شرط ہے طریقت اور تصوف کی ، یہ بھی جہالت کی شامت ہے کہ جن
مرشدوں کا نام صبح شام مثل قرآن اور درود کے ذکر کیا کرتے ہیں ان کے کلام
سے بھی غافل ہیں کہ وہ کیا فرما گئے (ص ۱۵)۔

اور تیسری شرط بیعت لینے والے کی یہ ہے کہ دنیا کا تارک ہو (ص ۱۶)۔

(یعنی نذرانے اور ہدایا وصول کرنے کے لیے دورے نہ کرتا ہو، ہدیے اس قدر نہ
لے کہ لوگوں کو حیرانی ہو کہ اتنا سامان کس طرح جائے گا)۔

اور پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشدون کامل کی صحبت میں
رہا ہو، اور ان سے ادب سیکھا ہو زمانۂ دراز تک، اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان
حاصل کیا ہو (ص ۱۷)۔

اس ضروری تنبیہ کے بعد اب ہم پھر ابراہیم ادہم کے کسب معاش کا ذکر کرتے
ہیں، ابو یوسف غسولی کا بیان ہے کہ ایک بار ہم ابراہیم کے ساتھ رمضان مبارک میں کھیتوں
کے کاٹنے کا کام کر رہے تھے، کسی نے ان سے کہا کہ کیا اچھا ہوتا اگر ہم اس وقت شہر میں

منتقل ہو جاتے، اور وہاں رمضان کا آخری عشرہ گذارتے، ممکن تھا کہ لیلۃ القدر نصیب
ہو جاتی، یہ سن کر ابراہیم نے فرمایا کہ بس یہیں (دیہات میں) پڑے رہو، اور خوب جم کر کام
کرتے رہو، یہاں کی ہر رات تمھارے لیے لیلۃ القدر ہے۔

اس بارے میں حضرت ابراہیم بن ادہم اتنے متشدد تھے کہ ایک دفعہ وہ صور میں گھر
کے اندر تشریف فرما تھے، اور ان کے رفیق سلیمان ابوالیاس اونی جبہ پہنے ہوئے دروازہ پر
بیٹھے تھے، ابراہیم نے ان کو ڈانٹ کر کہا کہ اندر آؤ، اندر آؤ، ایسا نہ ہو کہ کوئی ادھر سے
گذرے اور تم کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ سائل ہے اور یہ سمجھ کر تم کو کچھ دیدے[1]۔

وہ فرماتے تھے کہ بھیک مانگنا دو طرح پر ہوتا ہے: ایک دروازوں پر جا کر مانگنا ہے،
دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی کہے، میں مسجد سے نہ نکلوں گا، روزے رکھوں گا، نماز پڑھوں گا، اور
عبادت میں مشغول رہوں گا، کوئی اللہ کا بندہ کچھ لا کر دیدے گا تو قبول کرلوں گا۔ فرمایا کہ یہ
سوال کی بدترین صورت ہے، اور یہ چمٹ کر بھیک مانگنا ہے۔

وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ صائم النہار، قائم اللیل، نمازی، حاجی، عمرے کرنے والا اور
مجاہد غازی تو بس وہ ہے جو خود کو لوگوں سے بے نیاز بنادے[2]۔

ابراہیم بن ادہم نے باغوں کی رکھوالی، مزدوری پر کھیت کاٹنے اور ڈول سے کھیت یا
باغ کی سینچائی کا کام کرنے کے سوا، چکی پیس کر بھی گذر بسر کیا ہے، چکی پیسنے کے کئی واقعات
حلیہ میں مذکور ہیں۔

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ ابونعیم اصفہانی نے بہت شرح وبسط کے ساتھ ان کے
حالات وواقعات لکھے ہیں، اور ابن الجوزی کا بیان ہے کہ ان کے حالات کے بیان میں
میری ایک مستقل تصنیف ہے۔

ابراہیم بن ادہم چوبیس سال سے زیادہ شام کے مختلف شہروں میں رہے، زندگی
کے آخری ایام میں جیسا کہ فرج -ان کے رفیق- کا بیان ہے، وہ شہر صور میں مقیم ہوئے اور

(۱) حلیہ: ۷/۲۸۰ (۲) حلیہ: ۸/۱۲

وہاں سے غزوات میں شرکت کرتے رہے، غزوہ سے واپس آتے تو صور میں مسجد کی داہنی جانب قیام پذیر ہوتے، آخر میں ایک غزوہ میں شرکت کے لیے گئے، اور بحرابیض متوسط -یا بحرشام کہئے- کے کسی جزیرہ میں ان کی وفات ہوئی، وہاں سے لاکر ان کو صور کے ایک مقام مدفلہ میں دفن کیا گیا، صور والے جب کسی مرنے والے کا مرثیہ کہتے ہیں تو پہلے ابراہیم کا مرثیہ کہتے ہیں، قاسم بن عبدالسلام نامی ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے یہ بات فرج کی زبانی ۱۸۶ھ میں سنی ہے، اور حضرت ابراہیم بن ادہم کے مزار کو صور میں دیکھا ہے[(۱)]۔

جزیرہ میں وفات پانے اور نعش کو وہاں سے لاکر صور میں دفن کرنے کا ذکر ابن الجوزی نے بھی کیا ہے[(۲)]۔

مناوی نے بھی کواکب دریہ ج اص ۸۷ میں پہلے یہی لکھا ہے، اور اس پر اتنا اضافہ بھی کیا ہے کہ ان کی قبر صور میں مشہور ہے، اس کے بعد ابن عساکر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ بحری جنگ میں شریک ہوئے تھے، اسی لڑائی میں بلاد روم کے کسی جزیرہ میں ان کی وفات ہوئی اور اسی جزیرہ میں مدفون ہوئے۔

ابن حبان نے بھی بلاد روم ہی میں ان کے انتقال کرنے کا ذکر کیا ہے[(۳)]۔

لیکن ان سب کے برخلاف شیخ الاسلام ہروی نے فرمایا ہے کہ ''بشام برفت از دنیا''[(۴)]۔

اور داراشکوہ نے ''سفینۃ الاولیاء'' میں لکھا ہے کہ ان کی وفات جبلۂ شام میں ہوئی اور ایک روایت میں بغداد لکھا ہے[(۵)]۔

اور انوارالعارفین ص ۳۷۱ میں ہے کہ ابراہیم بن ادہم وفات کے وقت ناپید

(۱) حلیہ: ۹/۸
(۲) صفۃ الصفوۃ: ۳۶/۴
(۳) تہذیب: ۱۰۳/۱
(۴) طبقات الصوفیہ: ۵۷
(۵) سفینۃ الاولیاء: ۸۸

ہوگئے۔ بعضے کہتے ہیں کہ امام احمد کے پہلو میں دفن ہیں، یعنی بغداد میں؛ اور بعضے کہتے ہیں حلبہ (جبلہ صحیح ہے) شام میں مدفون ہیں، جہاں حضرت لوط علیہ السلام کا مزار انور ہے۔

خواجہ ابراہیم بن ادہم کے مدفن کے بارے میں تذکرہ نویسوں کا اختلاف بیان آپ کے سامنے ہے، داراشکوہ نے جبلۂ شام میں ان کے مدفون ہونے کو اصح (زیادہ صحیح) قرار دیا ہے، مجھ کو بھی یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ میں فدائیوں کے قلعہ سے روانہ ہوکر جبلہ پہنچا، جبلہ شہر سمندر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے، جبلہ میں ولی صالح حضرت ابراہیم بن ادہم کا مزار ہے، مزار کے احاطہ میں زاویہ بھی ہے، وہاں پانی کا حوض اور وارد وصادر کے لیے کھانے کا انتظام بھی ہے، شام کے مختلف شہروں اور اطراف واکناف سے شعبان کی پندرہویں شب میں لوگ آتے ہیں اور تین دن قیام کرتے ہیں، ان دنوں میں شہر کے باہر بہت بڑا بازار لگتا ہے، جس میں ہر قسم کی چیزیں بکتی ہیں۔

ابن بطوطہ ہی کے بیان کی تصدیق ''خطط الشام'' سے بھی ہوتی ہے، جو دور حاضر کے مشہور محقق محمد کرد علی کی تصنیف ہے، وہ لکھتے ہیں:

وبجبلة على ساحل البحر قبر إبراهيم بن أدهم الزاهد، ومعظم هذه المزارات ما زالت معروفةً يختلف إليها الناس وقام عليها زوايا أوتكايا[(۱)].

اور اس کی تصدیق منجد سے بھی ہوتی ہے، صاحب منجد لکھتا ہے:

''جبلہ، لاذقیہ کے جنوب میں شام کی ایک بندرگاہ ہے، ۶۳۶ء میں اس کو عربوں نے فتح کیا، ۱۰۹۸ء میں اس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوا، پھر ۱۲۸۵ء میں سلطان قلاوون نے اس کو واپس لیا، اس میں رومانی مسرح کے آثار کے علاوہ ابراہیم بن ادہم امیر بلخ اور عابد وصوفی کی قبر ہے''۔

(۱) خطط الشام ص ۱۵۹

صوریہ کے نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ شام کے ضلع لاذقیہ کا ایک شہر ہے، اس کے شمال میں لاذقیہ، جنوب میں بانیاس اور طرطوس، مشرق میں جبال نصریہ یا حصون فداویہ اور مغرب میں بحرابیض متوسط (میڈیٹرینین سی Mediterranean Sea) ہے۔

شہر صور اس سے بہت فاصلہ پر جانب جنوب میں ہے، اور وہ اب جمہوریۂ لبنان میں ہے، کسی غلط فہمی کی بنا پر بہت سے بزرگوں کے مزارات کے باب میں اختلاف بیان پایا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت خضر، حضرت یحییٰ، حضرت لوط علیہم السلام، اس کے لیے ''خطط الشام'' کا مطالعہ کیا جائے۔

ابن بطوطہ نے جو شہر جبلہ کو سمندر سے ایک میل دور بتایا ہے، وہ ان کے زمانے کی بات ہوگی، اب تو شہر جبلہ اس شاہراہ کے کنارہ تک آباد ہو گیا ہے، جو صور، صیدا، بیروت اور طرابلس سے سمندر کے کنارے کنارے جبلہ سے آگے تک چلی گئی ہے، اور سلطان ابراہیم ادہم کا مزار جس سے متصل ایک عظیم الشان مسجد بھی ہے سمندر سے دو یا تین فرلانگ کے فاصلہ پر پورب جانب ہے، میں نے ذی القعدہ ۱۳۹۸ھ میں زیارت کی سعادت حاصل کی ہے۔

☆......☆......☆

واقدی

جن لوگوں نے واقدی پر کذب و وضع کا الزام لگایا ہے، انھوں نے ثبوت میں ایک بھی ایسی حدیث پیش نہیں کی، جس کو واقدی نے خود بنالیا ہو۔ واقدی پر کذب، وضع اور افتعال کا الزام لگانے والوں میں امام احمد، اسحٰق بن راہویہ، امام شافعی، ابوحاتم اور ابوداؤد ہیں۔ ان میں سے امام شافعی نے متن حدیث کے وضع کا نہیں، بلکہ کھل کر سند گھڑنے کا الزام لگایا ہے:

كان بالمدينة سبع رجال يضعون الأسانيد، أحدهم الواقدي (تہذیب)۔

اور ابوداؤد نے افتعال کا الزام لگانے کے بعد جب تفصیل میں گئے ہیں، تو انھوں نے یہ کہا کہ:

روى في فتح اليمن وخبر العنسي أحاديث عن الزهري ليست من حديث الزهري.

اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ اس نے سند وضع کی ہے۔ امام احمد کے تفصیلی کلام کا حاصل بھی یہی ہے، ان کا کہنا ہے کہ واقدی نے حدیث أفعمياوان أنتما کو معمر کے واسطہ سے زہری سے روایت کیا ہے، حالانکہ اس حدیث کو زہری سے یونس کے علاوہ کسی اور نے روایت نہیں کیا ہے۔ ابن معین نے اسی کو ان لفظوں میں کہا ہے کہ واقدی یونس کی حدیث کو معمر کی حدیث بنادیتا تھا، یعنی وہ سند بدل دیتا تھا، امام احمد نے واقدی سے روایت کرنے کو اسی وجہ سے منع کیا تھا، اور اس کو متروک قرار دیا تھا، چنانچہ احمد بن منصور رمادی کا بیان ہے کہ ۱۸۷ھ یا ۱۸۸ھ میں جب ابن المدینی بغداد آئے تو اس وقت واقدی بغداد کا قاضی تھا، ابن المدینی محدثین کے پاس جا جا کر حدیثیں سنتے تھے، تو میں بھی ان کے ساتھ چکر کاٹا کرتا تھا،

میں نے ان سے کہا کہ واقدی سے بھی سننے کا ارادہ ہے؟ تو ابتداءً وہ پس وپیش میں تھے، سوچ رہے تھے، دوبارہ سوال کیا تو انھوں نے فرمایا ارادہ تو ہے کہ سنوں، پھر انھوں نے امام احمد کو لکھا تو امام احمد نے فرمایا کہ ایسے آدمی سے روایت کرنے کو آپ کیسے حلال سمجھتے ہیں جس نے نبہان کی حدیث معمر کے واسطہ سے نقل کی ہے، حالانکہ اس کو یونس کے سوا کسی دوسرے نے روایت نہیں کیا ہے۔

اس قصہ سے واقدی کو متروک قرار دینے کی وجہ بھی ظاہر ہوگئی اور واضح ہوگیا کہ واقدی متن حدیث کے وضع کرنے کی وجہ سے متروک نہیں قرار دیا گیا تھا، بلکہ سند وضع کرنے کی وجہ سے۔

پھر اس بات کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ محدثین نے جو الزام کسی پر لگایا ہے وہ ان کے اپنے علم کی حد تک ہے، اس کو حرف آخر قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے، چنانچہ امام احمد کی یہی بات کہ نبہان کی حدیث کو زہری سے یونس کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا، ان کے علم کی حد تک صحیح ہے، مگر واقعۃً صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ رمادی کے بیان کے بموجب اس کو زہری سے عقیل نے بھی راویت کیا ہے اور اسی لیے رمادی نے کھل کر اعلان کیا ہے کہ اس حدیث کے معاملہ میں واقدی کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے(۱)۔

اس بات کی تائید کہ اگر واقدی میں کوئی عیب تھا تو صرف اتنا کہ وہ بعض احادیث کو کسی شیخ کے اس شاگرد کے واسطہ سے روایت کردیتا تھا جس سے دوسرے کسی اور کا روایت کرنا معلوم نہیں ہے، اس قصہ سے ہوتی ہے کہ اس نے عمرو ناقد سے حدیث **لعن اللہ زوّارات القبور** کے باب میں یہ کہہ دیا کہ یہ حدیث سفیان نے ہم سے بیان کی ہے، حالانکہ بقول ساجی اس حدیث کو سفیان سے قبیصہ کے سوا کسی دوسرے نے روایت نہیں کیا ہے۔

مختصر یہ کہ واقدی کے کذب ووضع کے ثبوت میں اسی قسم کی باتیں ذکر کی جاتی ہیں، ایسا کوئی واقعہ بتایا نہیں جاتا کہ اس نے کوئی ایسی حدیث جس کو کسی نے روایت نہیں کیا، اس

(۱) تہذیب: ۹/۳۶۴

نے اپنی طرف سے اس کا متن یا قصہ گھڑ کر کوئی سند اس پر چسپاں کردی ہو۔

وضع سند، یا کسی شیخ سے کسی حدیث کے سننے کا جھوٹا دعویٰ بھی بہت بڑا عیب ہے، لیکن اس بہانہ سے اس راوی کی تمام مرویات کو ناقابل اعتبار قرار نہیں دیا جاسکتا، ہاں اگر اس کی روایت کی تائید کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتی تو شک ضرور باقی رہے گا کہ معلوم نہیں جس سے وہ اس حدیث کو سننے کا دعویٰ کررہا ہے اس سے اس نے سنا بھی ہے یا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد وشافعی واسحٰق کے معاصر اور کسی کسی سے عمر میں کچھ بڑے، مسلَّم الکل امام فن ابوعبید قاسم بن سلام نے واقدی کی توثیق کی ہے اور ان کی فقہ کا تمام تر مدار واقدی ہی کی کتابوں پر ہے(۱)۔

اور ابراہیم حربی -جن کو اجلۂ اصحاب امام احمد سے بتایا جاتا ہے- نے بھی امام احمد کی جرح کو قبول نہیں کیا، بلکہ ان سے پوری طرح ٹکر لیتے ہوئے فرمایا ہے:

كان الواقدي أمين الناس على الإسلام(۲).

اور حربی نے مصعب زبیری -معاصر احمد- کا یہ قول نقل کرکے کہ واقدی ''ثقة مامون'' تھا، فرمایا کہ مثنی بن معاذ -معاصر امام احمد اور ابراہیم حربی کے استاذ- سے بھی واقدی کی نسبت پوچھا گیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔

حربی کا بیان ہے کہ میں نے ابن نمیر -جو امام احمد کے عراقی معاصر ہیں اور جن کو امام احمد درۃ العراق کہا کرتے تھے، اور ابن معین وامام احمد کوفی (عراقی) شیوخ کے بارے میں جو رائے ابن نمیر کی ہوتی تھی اسی کو اختیار کرتے تھے- سے بھی واقدی کی نسبت سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ یہاں (عراق میں) تو واقدی کی حدیث ٹھیک تھی، باقی اہل مدینہ واقدی کو زیادہ جانتے ہیں۔

اب آیئے دیکھیں اہل مدینہ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، تو اہل مدینہ میں ایک دراوردی ہیں، وہ واقدی کو **أمير المؤمنين في الحديث** کہتے ہیں؛ دوسرے

(۱) تہذیب (۲) تہذیب

مصعب زبیری ہیں، وہ واقدی کو ثـقـة مـأمـون کہتے ہیں؛ تیسرے معن بن عیسیٰ ہیں، ان سے واقدی کی نسبت کسی نے پوچھا، توانھوں نے جواب دیا، کہ بھلا میں اس لائق ہوں کہ مجھ سے واقدی کے باب میں سوال کیا جائے! واقدی تو وہ ہے کہ اس سے میرے باب میں سوال کیا جانا چاہئے، اس سوال کا یہی جواب ابوعامر عقدی - جو امام احمد وابن معین وابن راہویہ کے استاذ تھے - نے بھی دیا تھا۔

ان حضرات کے علاوہ جن لوگوں نے واقدی کی توثیق کی ہے، ان میں ایک ابوبکر صغانی ہیں، جو اپنے زمانے میں ابن معین کی نظیر قرار دیے جاتے تھے۔

عباس عنبری واقدی کے واسطہ سے حدیث بیان کرتے تھے، اور اس کی بہت مدح سرائی کرتے تھے، اور مجاہد بن موسیٰ کہتے تھے کہ میں نے اس سے بڑھ کر کسی دوسرے حافظ حدیث سے حدیث نہیں لکھی۔

ان سب باتوں کے باوجود اگر ذہبی نے یہ لکھ دیا کہ **استـقـرَّ الإجـمـاع علی وهـن الـواقـدي** تو ذہبی کے اس دعوے کی حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ متاخرین کی اکثریت نے امام بخاری وامام احمد واسحٰق وغیرہ کی تقلید جامد میں واقدی کو ضعیف قرار دیا ہے، اسی لیے حافظ ابن حجر کے بعض مشائخ حدیث نے ذہبی کے کلام کا رد کیا ہے۔

ذہبی نے خود تذکرۃ الحفاظ میں اس کا ترجمہ ذکر نہ کرنے کا یہ عذر بیان کیا کہ وہ ''الحافظ البحر'' تھا، لیکن میں نے اس کا ترجمہ اس لیے ذکر نہیں کیا کہ لوگوں نے اس کی حدیث ترک کرنے پر اتفاق کرلیا ہے، حالانکہ وہ بہت بڑا عالم تھا، بس عیب اس میں یہ تھا کہ وہ حدیث میں متقن (پختہ کار ضابط) نہیں تھا، لیکن مغازی وسیر میں وہ چوٹی کا آدمی تھا[۱]۔

دیکھئے ذہبی کی تحقیق میں بھی وہ وضاع یا کذاب نہیں تھا، بلکہ ان کے نزدیک اس میں صرف اتنا عیب تھا کہ وہ حدیث میں مُتقِن نہیں تھا، باقی مغازی وسیر میں اس کا تفوق ان کو بھی مسلم ہے۔☆☆☆

(۱) تذکرہ: ۱/۳۱۸

سیف وقلم

دنیا کی کسی قوم میں خواہ مردہ ہو یا زندہ، تاجداران بے علم یا علمائے بے تاج کی کوئی کمی نہیں ہے؛ لیکن ایسے افراد جو مادی دولت کے ساتھ روحانی دولت کے بھی مالک ہوں، اعضاء وجوارح کے علاوہ اپنی نوع کے دل ودماغ پر بھی یکساں حکومت کرتے ہوں، خال خال پائے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت نمایاں طور پر اگر کسی قوم میں نظر آسکتی ہے تو وہ مسلمان اور صرف مسلمان ہیں۔

اسلامی حکومت کے ابتدائی دور- خلافۃ علی منہاج النبوۃ - میں یہ خصوصیت اس قدر تابانی ودرخشانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے کہ اس کا انکار مہر نیم روز کے انکار کے مرادف ہے، اور اسی وجہ سے ہم بھی اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں خصوصیت مذکورہ کا پایا جانا باعث تعجب نہیں، اس لیے کہ عہد رسالتؐ سے قرب کی وجہ سے اس دور کے فرماں روا دولت وحکومت کے نشہ میں چور نہیں ہوئے تھے؛ لیکن انتہائی حیرت وتعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ زمانہ جو حکومت اسلامیہ کے انتہائی اوج کمال وعروج کا زمانہ تھا، اس عہد کے فرمانروا بھی صرف مادی ترقی پر قانع نہ تھے، اور نہ اس کو سرمایۂ نازش سمجھ کر علمی اور روحانی ترقی کے میدان میں اپنے ہم سفروں سے پیچھے رہے۔

کون نہیں جانتا کہ بنی امیہ میں عمر بن عبدالعزیز نہ صرف ایک عدل پرور، بیدار مغز بادشاہ تھے، بلکہ زہری وعطاء کی طرح ایک جلیل القدر محدث اور فقیہ ومجتہد بھی تھے۔

سلسلۂ عباسی میں مامون کے علمی شغف اور معارف پروری کی داستانوں سے کس کے کان نا آشنا ہیں؛ لیکن جس طرح ان دو فرماں رواؤں کے علمی کمالات سے بہت کم لوگ

ناواقف ہوں گے، اسی طرح دوسرے تاجداران اسلام کے علمی فضائل وادبی خصوصیات کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ قارئین ''دارالعلوم'' کو ایسے صاحب سیف وقلم فرمانروایانِ اسلام سے روشناس کرائیں، لیکن اس سلسلہ میں خلفائے راشدین، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور مامون عباسی کا ذکر ہم قصداً نہ کریں گے، اس لیے کہ ان کے حالات میں مستقل متعدد تصنیفات شائع ہوچکی ہیں، اور بجائے ان کے اہل علم وصاحب کمال وزراء کا اضافہ کرکے ایک حدتک اسی کمی کو پورا کریں گے۔

عبدالملک بن مروان

دولت بنی امیہ کا پانچواں فرماں روا تھا، ۲۶ھ میں پیدا ہوا، اور ۶۵ھ میں تخت نشیں ہوا، لیکن چونکہ اس وقت عبداللہ بن زبیر سریر خلافت کے بہترین حق دار اور اس پر متمکن تھے، اس لیے ۷۳ھ تک اس کی حکومت صحیح معنوں میں خلافت نہ تھی، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کی شہادت کے بعد اس کی خلافت صحیح تسلیم کی گئی، تخت نشینی سے پہلے بڑا خوش اوقات عابد وزاہد تھا، لیکن حکومت ملتے ہی زہد وتقویٰ رخصت ہوگیا، عین اُس وقت جب خلافت کی بشارت پہنچی ہے وہ قرآن مجید کی تلاوت کررہا تھا، بشارت سنی اور یہ کہہ کر قرآن مجید کو بند کردیا کہ: ''آج یہ آخری ملاقات ہے''۔

عبدالملک نے حضرت عثمان غنی، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، ام سلمہ، بریرہ، ابن عمر، معاویہ رضی اللہ عنہم سے حدیثیں سنیں اور یاد کیں، اور عروہ بن الزبیر، خالد بن معدان، رجاء ابن حیوہ، زہری، یونس بن میسرہ، ربیعہ بن یزید، اسماعیل بن عبیداللہ، حریز بن عثمان وغیرہم نے عبدالملک سے حدیثیں روایت کیں۔

ابوالزناد نے عبدالملک کو فقاہت میں سعید بن المسیب وعروہ بن الزبیر کا ہم پایہ قرار دیا ہے، ان کا مقولہ ہے کہ مدینہ میں چار شخص فقیہ تھے: سعید، عروہ، قبیصہ بن ذویب اور

عبدالملک۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ لوگ تو اب چل چلاؤ پر ہیں، آپ کے بعد علمی مشکلات کا حل ہم کس سے کریں؟ آپ نے فرمایا: مروان کا ایک فقیہ بیٹا ہے، اسی سے دریافت کرنا۔

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں کسی نوجوان کو عبدالملک سے بڑھ کر فقیہ نہیں پایا۔

امام شعبیؒ باایں ہمہ جلالت قدر ووسعت معلومات عبدالملک سے ٹکر نہیں کھا سکتے تھے، فرماتے تھے کہ میں جس کے پاس بیٹھتا ہوں اپنے کو اس سے برتر پاتا ہوں، مگر عبدالملک کا حال برعکس ہے، اس کی مجلس میں جو حدیث یا شعر ذکر کرتا ہوں تو وہ اس میں ضرور کوئی مفید اضافہ کرتا ہے[۱]۔

ان محاسن کے ساتھ ہی عبدالملک میں چند عیوب بھی تھے، جو حکومت وشہنشاہی کے طفیل میں پیدا ہوئے اور یہ ایسے عیوب تھے کہ انھوں نے اس کے محاسن کو عام نگاہوں سے چھپادیا، یہی وجہ ہے کہ آج کوئی شخص ایک محدث وفقیہ کی حیثیت سے اس کا نام نہیں لیتا۔

عبدالملک کی حکومت میں جبر وتشدد کا عنصر غالب تھا، اکثر ارکان دولت حد درجہ سفاک وظالم تھے، حجاج کی خون آشام تلوار نے جن بے گناہ اور مظلوم انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا، ان کے خون سے عبدالملک کا دامن بھی رنگین ہے۔

کاش! اس کا دامنِ کمال ان بدنما دھبوں سے پاک ہوتا تو آج وہ ان فرمانرواؤں کی صف میں جگہ پاتا، جو حکمرانی کے ساتھ امامت واجتہاد میں بھی اپنی آپ نظیر تھے۔

شاعری:

عبدالملک سخن ور بھی تھا، لیکن حکومت کی الجھنوں سے اس کو فرصت نہیں مل سکی کہ ذوق سخن کی نمائش کرے، تاہم ان چار شعروں سے اس کی موزونی طبع اور قادرالکلامی کا

(۱) تاریخ الخلفاء: ۱۲

اندازہ ہوسکتا ہے:۔

لَعَمْري لقد عُمِّرتُ في الدهر برهةً

زندگی کی قسم، میں نے عمر دراز پائی

ودانت لي الدنيا بوَقْعِ البواترِ

اور دنیا تلوار کے زور سے میرے آگے جھک گئی

فأضحَى الذي قد كان مما يسُرُّني

كلمح مضى في المُزْمِنات الغوابرِ

لیکن جو چیزیں سرمایۂ شادمانی تھیں اب ان کی حیثیت بجلی کی اس چمک سے زیادہ نہیں جو ایک بار آنکھوں کو خیرہ کرکے مدتوں گذریں غائب ہوگئی۔

فيا ليتني لم أعنِ بالملك ساعةً

ولم ألهُ في لذّاتِ عيشٍ نواضرٍ

پس اے کاش! حکومت کا سودا ایک لمحہ کے لیے بھی میرے سر میں نہ سمایا ہوتا اور نہ میں ناز پروردہ حسینوں کی طرح لذتوں میں منہمک ہوتا۔

وكنت كذي طِمرَين عاش ببُلْغةٍ

من الدهر حتى زار ضَنكَ المقابرِ

اور میں اس فقیر کی طرح ہوتا جو دو پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹا رہتا ہے اور قوت لا یموت پر زندگی بسر کرتا ہے اور بالآخر قبر کی آغوش میں سوجاتا ہے۔

زبان دانی:

عربیت وزبان دانی میں اس کو بے حد قدرت ومہارت تھی، اس کا شمار ان چار شخصوں میں تھا، جن سے بولنے کے ضروری مواقع تو الگ رہے، ہنسی مذاق میں بھی زبان دانی سے متعلق کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی: امام شعبی، عبدالملک، حجاج بن یوسف، ابن القریہ۔

نحو دانی وصحت اعراب کا اس کو اس درجہ اہتمام تھا کہ اپنے بیٹے ولید کو صرف اس وجہ سے کہ وہ نحو نہ جانتا تھا جانشینی وولی عہد کا اہل نہیں سمجھتا تھا[1]۔ زمانہ کی نیرنگ سازی دیکھئے کہ باپ فصاحت وبلاغت کا تو وہ عالم تھا اور بیٹے کی جہالت کا یہ حال کہ منبر نبویؐ پر خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوتا تو کہتا: **يا أهلُ المدينة**، قرآن کی آیت تلاوت کرتا تو وہ بھی غلط[2] **فيا للعجب ولضيعة الأدب.**

عبدالملک جس پایہ کا ادیب وسخن داں تھا، حجاج جو عبدالملک کی جانب سے عراق کا گورنر تھا، وہ بھی اس سے کسی طرح کم نہ تھا، اور صرف ادیب ہی نہیں بلکہ حافظ قرآن، اور دوسرے علوم سے بھی واقف تھا؛ لیکن اس کی سفا کی وخوں ریزی اور ظلم وستم کے خونیں واقعات نے ان تمام خوبیوں پر پردہ ڈال دیا۔

عبدالملک نے دمشق میں ۱۵ رشوال ۸۶ ہجری میں وفات پائی۔

ولید ثانی:

خلفائے بنی امیہ میں اس کا گیارہواں نمبر ہے، اور عبدالملک کا پوتا ہے، ۹۰ھ میں تولّد ہوا، اور ۱۲۵ھ میں وارث تاج وتخت ہوا، لیکن چونکہ پرلے درجہ کا ہوس پرست وسیاہ کار تھا، اس لیے ایک سال سے زیادہ حکومت نہ کرسکا، اس کی بداعمالیوں اور تباہ کاریوں کی وجہ سے رعایا بگڑ گئی، اور ہر کہ ومہ کے دل میں اس کے خلاف نفرت وغصہ کی آگ ایسی بھڑکی کہ جب تک اس کے ناپاک وجود کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا نہیں ڈالا چین سے نہ

(۱) تاریخ الخلفاء، لب التاریخ ۱۲ (۲) تاریخ الخلفاء ترجمہ ولید ۱۲

بیٹھ سکے، جمادی الاولیٰ ۱۲۶ھ میں محاصرہ کرکے اس کا سرتن سے جدا کردیا گیا۔ اس کی سیاہ کاریوں کی تفصیل بیان کرکے صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرنا ہم بے ضرورت سمجھتے ہیں۔

ولید میں جہاں اتنی برائیاں تھیں وہاں چند کمال بھی تھے، مؤرخین متفق اللفظ ہیں کہ خلفائے بنو امیہ میں بلحاظ کمال ادبیت وفصاحت اور بلحاظ مہارت عربیت وسخن وری کوئی اس کا ہمسر نہ تھا، اس کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو:

كفرتَ يداً من منعم لو شكرتَها
جزاك بها الرحمنُ بالفضل والمنِّ
رأيتُك تبني جاهداً في قطيعتي
ولو كنتَ ذا حزمٍ لهدَّمتَ ما تبني
أراك على الباقين تجني ضغينةً
فيا وَيحَهم إن متَّ من شرِّ ما تجني
كأني بهم يوماً وأكثر قيلهم
ألا ليت أنا حين يا ليت لا تغني

ان اشعار میں ولید کا مخاطب اس کا چچا ہشام ہے، جب ولید کے باپ یزید کے مرنے کا وقت آیا تو وہ ولید کی صغرسنی کی وجہ سے اس کو خلافت کے لیے نامزد نہ کرسکا، اس مجبوری سے ہشام کو خلافت سپرد کی اور ولید کو ہشام کے بعد ولی عہد مقرر کیا، ولید جب جوان ہوا، اسی وقت سے اس کے آثار اچھے نہ تھے، عنفوان شباب میں اخلاقی کمزوریاں اس میں پیدا ہوگئی تھیں، اس لیے ہشام کا ارادہ ہوا کہ اس کی ولی عہدی سلب کرکے اپنے بیٹے کو دیدے، ولید کو جب اس ارادے کی اطلاع ہوئی تو یہ مذکورۂ بالا اشعار لکھے۔

منصور عباسی:

سلسلۂ عباسیہ کا دوسرا حکمراں تھا، اور ترجمان قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا

پڑپوتا تھا، منصور لقب ہے، نام ونسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباسؓ۔

منصور ایک بربری کنیز سلامہ کے بطن سے ۹۵ھ میں پیدا ہوا۔

تعلیم وتربیت:

منصور فقہ، ادب میں خاصی مہارت رکھتا تھا، فلسفہ ونجوم سے اس کی دلچسپی عشق کے مرتبہ تک پہنچ گئی تھی، وہ خود بہت ذہین وہوشیار تھا، اس کے علاوہ اس کا خاندان ایک ممتاز مشہور علمی خاندان تھا، فطری مناسبت کے ساتھ تعلیم یافتہ گھرانے کی تربیت سمند شوق کے لیے تازیانہ سے کم نہ تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ منصور نے بڑی تندہی اور محنت سے اس عہد میں جو علوم رائج تھے، حاصل کیے، ابتداءً اپنے پدر بزرگوار محمد بن علی کے پاس زانوے ادب طے کیا، پھر جوں جوں شوق ترقی کرتا گیا اساتذہ کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔

تخت نشینی:

۱۳۷ھ میں اپنے بھائی سفاح بانی خلافت عباسیہ کی وفات کے بعد اس کا جانشین اور تخت خلافت پر متمکن ہوا، مؤرخین کا خیال ہے کہ دولت عباسیہ میں بڑا دوراندیش، مہیب، بہادر، اور مدبر، صاحب رائے بادشاہ تھا، اور علم وادب سے بھی اس کو بہت کافی حصہ ملا تھا۔

قاضی صاعد اندلسی ''طبقات الامم'' میں فرماتے ہیں:

كان مع براعة في الفقه كلِفاً في علم الفلسفة وخاصةً في علم النجوم.

منصور فقہ میں کمال ومہارت کے باوجود فلسفہ خصوصاً نجوم کا بڑا گرویدہ تھا۔

سیوطی لکھتے ہیں:

كان فصيحاً بليغاً مفوهاً خليقاً للإمارة.

(یعنی) وہ بڑا فصیح وبلیغ، بڑا بولنے والا اور خلافت کا اہل تھا۔

مغلطائی لکھتے ہیں:

كان فقيهاً محدثاً كاتباً بليغاً حافظاً

(یعنی) منصور فقیہ ومحدث، انشاء پرداز،

لکتاب اللہ وسنۃ رسولہ ﷺ[۱]. بلیغ اور قرآن وحدیث کا حافظ تھا۔

ذوق علمی اور تراجم:

منصور کی قادر الکلامی کا یہ حال تھا کہ جب خطبہ دیتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ کتاب کھول کر پڑھ رہا ہے، علی العموم حکومت کی اہم ذمہ داریوں اور ملکی انتظامات سے فراغت پانے کے بعد سامان عیش وعشرت کی فراوانی بادشاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے، لیکن منصور کو جو ذوق علمی قدرت نے عطا کیا تھا، اس پر کوئی چیز غالب نہ آسکی، بلکہ حکومت کے بعد وہ اور ترقی کرگیا، چنانچہ منصور سے کسی نے پوچھا کہ دنیا کی لذتوں میں سے کوئی ایسی لذت بھی ہے جس سے آپ محروم ہوں؟ منصور نے کہا: ہاں! بس ایک تمنا رہ گئی ہے کہ میں محدثین کے جھرمٹ میں بیٹھ جاؤں اور مستملی مجھ سے کہے کہ ہاں جناب نے کس کا نام لیا؟ کون سی حدیث ذکر کی؟ اتنا سننا تھا کہ تمام ندیم اور وزیرزادے قلم دان اور دفتر لے کر پہنچ گئے، منصور نے کہا: افسوس میری مراد تم سے نہ تھی، میں تو ان کو کہہ رہا تھا جن کی یہ ہیئت ہوتی ہے، میلے کچیلے کپڑے، پاؤں میں بوائیاں پھٹی ہوئی، لانبے لانبے بال، آفاق گرد (یعنی شائقین حدیث)[۲]۔

منصور نے دینیات کی تکمیل تو بچپن ہی میں کرلی، پھر فلسفہ سے دل چسپی لینے لگا، اور صرف دل چسپی نہیں بلکہ اس سے بے حد شغف ہوگیا، اور اجنبی زبانوں سے ترجمہ کرانے کا اہتمام کیا، چنانچہ کلیلہ ودمنہ، اقلیدس، ارسطو کی منطقی تصنیفات اور فن ہیئت میں بطلیموس کی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ تاریخ الخلفاء میں سریانی، یونانی اور دیگر عجمی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرانے کی تصریح کی ہے[۳]۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فلسفہ کی اشاعت اور اجنبی کتابوں کے تراجم کی ابتداء مامون عباسی کے عہد حکومت میں ہوئی، اور اس میں اولیت کا شرف مامون ہی کو حاصل ہے،

(۱) سیرت مغلطائی ص۱۰۲ (۲) تاریخ الخلفاء ۱۴ (۳) لب التاریخ ص ۲۶۶

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فلسفہ کی عام اشاعت اور تراجم کی کثرت، اس کا تنوع مامون ہی کے عہد میں حاصل ہوا، اور اس جنس کی اتنی بہتات ہوئی کہ بغداد کے علمی بازاروں میں کوڑیوں کے مول بکنے لگی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی داغ بیل منصور ہی نے ڈالی تھی، اور مامون نے منصور ہی کے لگائے ہوئے پودوں کی آبیاری کرکے اس کی محنت وکاوش کو بارآور کیا۔

قاضی صاعد اندلسی لکھتے ہیں:

ثم لمَّـا أفضتِ الخلافةُ فيهم إلى الخليفة السابع عبد الله المأمون ابن هارون الرشيد تَمَّ مابدأ به جَدُّه المنصور[۱]۔

پھر جب قرعۂ خلافت دولت عباسیہ کے ساتویں فرماں روا مامون کے نام نکلا تو اس نے اس مہم کی تکمیل کی جس کو اس کا دادا منصور شروع کرکے چھوڑ گیا تھا۔

منصور کا عہد خلافت اور تدوین علوم:

۱۴۳ھ سے پیشتر علوم مدون نہیں ہوئے تھے، اب تک زبانی روایت کا طریقہ رائج تھا، احادیث کے جو مجموعے پائے جاتے تھے ان کی ترتیب ابواب فقہی پر نہ تھی، استاذ سے جو احادیث شاگرد سنتا تھا کیف ما اتفق لکھ لیتا تھا، ۱۴۳ھ میں علماء اسلام نے اس اہم کام کی طرف توجہ کی۔ تفسیر، سیر ومغازی اور احکام کی حدیثیں الگ کی گئیں، احکامی حدیثیں فقہی ترتیب پر جمع کی گئیں۔ یہ خدمت صرف متن حدیث سے متعلق تھی، اس کے علاوہ قرآن وحدیث سے جو احکام مستنبط ہوچکے تھے ان کو بھی قلم بند کیا گیا۔ لغت، تاریخ اور فنون عربیہ پر کتابیں لکھی گئیں[۲]، اس سلسلہ میں جن بزرگوں نے نمایاں خدمتیں انجام دیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

ابن جریج المتوفی ۱۵۰ھ مکہ مکرمہ میں، امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ اور ابن اسحاق المتوفی ۱۵۰ھ مدینہ منورہ میں، امام اوزاعی المتوفی ۱۵۷ھ شام میں، سعید بن ابی عروبہ المتوفی

(۱) طبقات (۲) لب التاریخ ۱۲

۱۵۷ھ اور حماد بن سلمہ المتوفی ۱۶۹ھ بصرہ میں، معمر بن راشد المتوفی ۱۵۴ھ یمن میں، سفیان ثوریؒ المتوفی ۱۶۱ھ اور امام اعظمؒ المتوفی ۱۵۰ھ کوفہ میں۔ ان میں امام مالکؒ کی تصنیف موطاء کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی، چنانچہ آج بھی باوجودیکہ اس کی تصنیف کو بارہ سو برس گذر چکے گھر گھر موجود ہے۔ علماء نے موطاء پر سینکڑوں کتابیں لکھیں، جن میں سے متعدد کتابیں چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہیں۔

ابن اسحاق کی ''مغازی'' کا اصل نسخہ گو اتنی شہرت نہ پا سکا، مگر اس کے ملخص و مختصر کی جو ''سیرۃ ابن ہشام'' کے نام سے موسوم ہے، بڑی شہرت ہوئی۔ جب سے پریس رائج ہوا ہے، اُس وقت سے اِس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، تاہم ''مغازی'' کا اصل نسخہ اس عہد کی دوسری تصنیفات کی طرح دستبرد زمانہ کی نذر نہیں ہو گیا، اصل کتاب اور اس کا فارسی ترجمہ اب بھی قلمی کتب خانوں میں مل سکتا ہے۔

اِن دو تصنیفوں کے علاوہ اُس عہد کی کوئی تصنیف بھی ہمارے علم میں دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی، حتی کہ ہم ہر کتاب کے متعلق یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کا موضوع کیا تھا۔ ہاں! اتنا پتہ چلتا ہے کہ سفیان ثوری کی کتاب ''جامع ثوری'' کے نام سے موسوم تھی، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس میں احکام کے علاوہ تفسیر، سیر، مناقب وغیرہ کے متعلق حدیثیں بھی ہوں گی اور اس کی نوعیت جامع ترمذی کی سی ہوگی۔

نحو و لغت وغیرہ کی تدوین جن لوگوں نے کی ان کا نام یہاں مذکور نہیں ہے، غالباً خلیل بن احمد عروضی اور معاذ بن مسلم الفراء وغیرہ ہوں گے، یہ لوگ منصور کے عہد حکومت میں تھے اور نحو و لغت وغیرہ میں ان کی تصنفیں بھی ہیں۔

یہاں پہنچ کر مجھے یہ ظاہر کر دینا چاہیے کہ تدوین علوم کا آغاز منصور کے اشارہ سے یا اس کی سرپرستی میں نہیں ہوا تھا، فلسفہ اور نجوم کی اشاعت ہوتے ہوئے دیکھ کر[1] بلکہ بطور خود علمائے اسلام نے اس کی ضرورت محسوس کی اور جو کچھ ان سے ہو سکتا تھا کیا، منصور کو اس سے

(۱) تاریخ الخلفاء:۲٦٦

کوئی سروکار نہ تھا، بجز اس کے کہ محض بخت و اتفاق سے اسلام کی یہ خدمت جلیلہ منصور کے عہد خلافت میں انجام پذیر ہوئی، اور اسی تقریب سے ہم نے منصور کے حالات میں اس کا ذکر کر دیا، اس تصریح سے ہمارا مقصود صرف اظہار واقعہ ہے۔

منصور کے زریں کارنامے:

منصور کے عہد کے اہم کارنامے یہ ہیں: فتح طبرستان، غزوۂ قبرس، تعمیر بغداد، فرقہ راوندیہ کا استیصال۔

طبرستان کا علاقہ فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں فتح ہو چکا تھا، لیکن وہاں کے حکام عہد شکنی کر کر کے گویا مسلمانوں کو بار بار فوج کشی کی دعوت دیا کرتے تھے۔ منصور کے زمانہ میں بھی حاکم وقت نے نقض عہد کیا اور بہت سے مسلمانوں کو مروا ڈالا۔ منصور نے خازم بن خزیمہ اور روح بن حاتم کی سرکردگی میں ایک فوج بھیج کر از سرنو فتح کر کے اپنے مقبوضات میں داخل کیا۔

جزیرۂ قبرس کو حضرت عثمانؓ کی خلافت میں حضرت معاویہؓ نے فتح کیا تھا، لیکن قبرس والوں کا وہی حال تھا جو اہل طبرستان کا تھا۔

تعمیر بغداد اس کے عہد کا نہایت روشن اور نہایت عظیم الشان واقعہ ہے۔ افسوس ہے کہ تعمیر بغداد کی کیفیت بیان کرنا ہمارے موضوع سے بے تعلق ہے، اس لیے ہم بادل نخواستہ اس کو کسی دوسری فرصت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

منصور کے عام حالات:

منصور عموماً حق پسند و منصف مزاج واقع ہوا، ذیل کے واقعات سے بآسانی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے:

سوار بن عبداللہ منصور کی طرف سے بصرہ میں عہدۂ قضا پر مامور تھے، سوار کی عدالت میں ایک سپہ سالار اور ایک تاجر کا کسی زمین کے متعلق ایک مقدمہ دائر ہوا، منصور نے سپہ سالار کے حق میں سفارش لکھی، سوار نے جواب میں لکھ بھیجا کہ تاجر نے اس بات کا

شرعی ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ زمین اسی کی ہے، لہٰذا بلا وجہ شرعی میں اس کے قبضے سے نہیں نکال سکتا۔ منصور نے دوبارہ لکھا کہ بخدا تم کو وہ زمین سپہ سالار کو دینا ہوگی، سوار نے بھی اسی انداز میں جواب دیا، کہ بخدا میں اس کو تاجر کے ہاتھ سے ہرگز نہیں نکال سکتا، تاوقتیکہ اس کے خلاف ثبوت نہ مل جائے۔ منصور کے پاس یہ جواب پہنچا تو خوشی سے اچھل پڑا، اور کہا کہ بخدا میں نے زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیا، میرے قضاۃ مجھ کو بھی حق کی طرف مائل کرنے لگے[1]۔

نمیر مدنی کا بیان ہے کہ محمد بن عمران طلحی منصور کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ کے قاضی تھے اور میں ابن عمران کا منشی تھا، ایک مرتبہ خلیفہ منصور مدینہ تشریف لائے، جمّالوں -شتربانوں- نے خلیفہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں کوئی مقدمہ دائر کردیا، قاضی نے مجھ کو حکم دیا کہ میں خلیفہ کے پاس لکھ بھیجوں کہ "عدالت میں حاضر ہوکر جواب دہی کریں"۔ میں نے قاضی صاحب سے معافی کی درخواست کی، مگر قاضی صاحب نے منظور نہ کیا، اور مجبوراً لکھنا پڑا، جب مہر لگا چکا، تو قاضی صاحب نے فرمایا کہ اس کو پہنچانا بھی تمہارا ہی فرض ہے، میں نے لے جاکر اس کو ربیع (منصور کا دربان) کے حوالہ کیا، ربیع اندر گیا، پھر تھوڑی دیر بعد واپس آکر لوگوں سے خطاب کیا کہ آپ سب سے امیر المؤمنین کہتے ہیں کہ میں عدالت میں بلایا گیا ہوں، اس لیے کوئی شخص میرے ساتھ نہ جائے۔ اس کے بعد خلیفہ اور ربیع قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے، قاضی نے تعظیم کے لیے قیام بھی نہ کیا، اور فریق مدعی کو بلاکر اس کا بیان لیا، اور چونکہ ان کا دعویٰ حق بجانب تھا، اس لیے فریق مدعی کو ڈگری دی۔ جب مقدمہ کی کاروائی سے فراغت ہوئی تو خلیفہ نے کہا، اللہ تعالیٰ تم کو تمھاری دیانت داری کی جزائے خیر دے، اس حسن کارگزاری کے صلہ میں تم کو دس ہزار اشرفی انعام دیتا ہوں[2]۔

قاضی بصرہ سوار بن عبداللہ کی کچھ شکایت منصور کے کانوں تک پہنچی، ان کو دارالخلافہ میں حاضر ہونے کا حکم ہوا، اتفاق سے جب ان کو باریابی کا موقع ملا، عین اسی

(۱) تاریخ الخلفاء ۱۲ (۲) ایضاً: ۱۲

وقت منصور کو چھینک آگئی، سوار نے **یرحمک اللہ** نہیں کہا، منصور نے کہا، تم نے تشمیت کیوں نہیں کی (یعنی **یرحمک اللہ** کیوں نہیں کہا؟) سوار نے کہا آپ نے **الحمد للہ** نہیں پڑھا تھا، منصور نے کہا میں نے جی میں پڑھ لیا تھا، سوار نے بے ساختہ جواب دیا، میں نے بھی جی ہی میں تشمیت کرلی تھی۔ منصور نے سمجھ لیا کہ جب وہ خاص اس کے ساتھ رورعایت اور ملاحظہ کی بات نہیں کرتے تو دوسروں کے لیے کیوں کر ممکن ہے۔ اور ان کو بصرہ روانہ کردیا۔

یہ واقعات حق پرستی وبردباری کی نہایت نادر مثالیں ہیں، جن کی امراء اور فرمانرواؤں سے بہت کم توقع کی جاسکتی ہے، لیکن منصور کی تاریخ میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن کو طوالت کے اندیشہ سے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

شاعری:

منصور کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے، تاہم اس کوچہ سے محض نابلد بھی نہ تھا، ذیل کے اشعار سے اس کی موزونی طبع کا اندازہ کیا جاسکتا ہے: ؎

إذا كنتَ ذا رأيٍ فكُنْ ذا عزيمةٍ   فإنَّ فسادَ الرأي أن يتردَّدا

اگر تم صاحب رائے ہو تو تم کو صاحب عزم بھی ہونا چاہئے، اس لیے کہ رائے کی بڑی خرابی یہ ہے کہ ارادے میں پختگی نہ ہو۔

ولا تُمهِلِ الأعداءَ يوماً بقدرةٍ   وبادرهمُ أنْ يملِكوا مثلَها غدا

دشمن پر قابو پاکر اس کو نہ چھوڑو، اور موقع نہ دو کہ کل وہ بھی تم پر یوں ہی قابو پاجائے۔

منصور سے باقتضائے بشریت بعض ایسی حرکتیں بھی سرزد ہوئی تھیں، جن کو سن کر اسی قدر تکلیف ہوتی ہے جتنی اس کے علم وانصاف کے واقعات پڑھ کر مسرت ہوتی ہے، حضرت امام اعظمؒ، حضرت سفیان ثوریؒ کو قید وبند کی تکلیف دینا، ابن عجلان وغیرہ کو کوڑے لگوانا اس کے دامن شہرت پر بہت بدنما دھبہ ہے۔

منصور نے بماہ ذی الحجہ ۱۵۸ھ بیر میمونہ میں وفات پائی۔ ☆......☆......☆

جوادساباط

ہندوستان میں تیرہویں صدی ہجری میں عیسائی مشن کا ایک عرب حریف

تیرہویں صدی کے ربع اول میں جب کہ انگریزوں کا قدم ہندوستان میں جم چکا تھا، عیسائیت کی تبلیغ ہندو بیرون ہند میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر جاری تھی، ’’برٹش اینڈ فارنر بائبل سوسائٹی‘‘ کے مبلغین اطراف واکناف عالم میں پھیل چکے تھے اور مسیحیت کا جال ہر چہار طرف پھیلا رہے تھے، مسلمان علی العلوم اور مسلمانان ہند علی الخصوص اُن مکائد اور خفیہ تدابیر سے یکسر ناواقف تھے، جو تبلیغ مسیحیت کے سلسلے میں استعمال کی جارہی تھیں، علماء اکثر و بیشتر طبیعت کی سادگی اور علم کے وسائل وذرائع کی قلت کی وجہ سے ان حالات سے بے خبر تھے، اس لیے درس وتدریس کے علاوہ اور کسی چیز سے ان کو مطلب نہ تھا، ان حالات میں مسیحیت کو جو ترقی نصیب ہوسکتی تھی ظاہر ہے، میدان بالکل صاف تھا، زمین نہایت ہموار تھی، مسیحی مبلغین تمام خطرات سے بے فکر ہوکر اپنے کام میں مصروف تھے، ان کو یقین تھا کہ اب فرزند اسلام کو حلقہ بگوش مسیحیت بنا لینے میں ان کو کوئی دقت پیش نہیں آسکتی، وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ یکا یک خدائے اسلام نے اسلام اور مسلمانوں کی دستگیری کے لیے اپنا غالب اور قہار ہاتھ بڑھایا اور مسیحیوں کی تمام ملمع کاریوں کا پردہ چاک کردیا اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے، اس نے اپنے ایک بندے کے دل میں اسلام کا سچا درد اور اس کی حمایت کا حقیقی اور غیر فانی جوش پیدا کردیا، جو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں کود پڑا اور مقابلہ پر ڈٹ گیا اور جب تک صف اعداء کائی کی طرح پھٹ نہ گئی نہایت بے جگری سے دادِ شجاعت دیتا رہا۔ اُس بلند

حوصلہ شیر دل بہادر کو دنیا جوادساباط کے نام سے پکارتی تھی، اور یہ مختصر تحریر اسی بہادر کے قلمی کارناموں کا ایک دھندھلا سا خاکہ اور اس کے مختلف ادوارِ حیات کا نامکمل نقشہ ہے۔

جوادساباط کا سلسلۂ نسب اور مختصر خاندانی حالات:

ماں کی طرف سے امام حسینؓ تک پہونچتا ہے اور باپ کی جانب سے حضرت امام حسنؓ تک، ان کے والد محترم ابراہیم ساباط ۱۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور جزیرہ کے اطراف میں اپنے بنوالعم کے ساتھ سکونت اختیار کی، اور ۱۱۸۷ھ میں سید محمد حکیم باشی کی صاحبزادی شہرباں (بانو) سے عقد کیا، یہ عبداللہ پاشا (ترکی) کی وزارت کا زمانہ تھا، وزیر موصوف نے اسی سال ان کو ماریہ کا حاکم مقرر کیا، پھر کسی وجہ سے حکومت سے علیحدگی اختیار کرکے امیر موسم کے منصب پر فائز ہوئے، اس کے بعد ہجر کا رخ کیا اور وہاں سعدون بن عویمر خالدی کی طرف سے سفیر بن کر ۱۱۹۲ھ میں کریم خاں زندی کے پاس گئے، واپسی کے بعد پھر دوسری بار ۱۱۹۳ھ میں سفارت کی خدمت انجام دینے کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں یہ معلوم کرکے کہ جس کے پاس جانا ہے اس کا انتقال ہوگیا واپسی کا ارادہ کیا، مگر قسمت میں وہیں پیوند خاک ہونا لکھا تھا، مظفر خان بردستانی نے حملہ کیا، ابراہیم نے اپنے ساتھیوں کو لے کر مقابلہ کیا، آخر مقتول ہوئے، إنا لله وإنا إليه راجعون.

ابراہیم ساباط بھی علم کی دولت سے بہرہ مند تھے، ان کی ایک تصنیف کا ذکر خود جواد نے کیا ہے، اس کا نام کتاب الازہار ہے، جواد نے اس کتاب کے حوالہ سے بعض باتیں ذکر کی ہیں، جوادساباط کے نانا سید محمد حکیم باشی بڑے پائے کے طبیب تھے، پہلے شاہ طہماسپ صفوی - بادشاہ ایران - نے شاہی اطباء کی افسری سے ان کو سرفراز کیا، طہماسپ کی وفات کے بعد ایران کو خیرباد کہا اور ٹرکی پہنچے، اس وقت سلطنت عثمانیہ کی باگ سلطان عبدالحمید خان کے ہاتھ میں تھی، سلطان نے بھی ان کو رئیس الاطباء کا منصب عطا کیا، جب سلیمان پاشا اول بغداد کے وزیر مقرر ہوئے تو انھوں نے درخواست کی کہ رئیس الاطباء کی خدمات بھی

مجھے عنایت کی جائیں، سلطان نے وزیر کی درخواست منظور کرلی، اور سید محمد حکیم باشی وزیر کے رئیس الاطباء کی حیثیت سے بغداد روانہ ہوگئے، سلیمان کے انتقال کے بعد علی پاشا کی خدمت میں رہے، جب اس کی بھی وفات ہوگئی، تو عمر پاشا نے اپنے اطباء کی افسری عنایت کی، اس کے بعد ۱۱۸۶ھ میں مبتلائے طاعون ہوکر انتقال کیا اور ماریہ میں مدفون ہوئے۔

جواد ساباط کی ماں بھی بقدر ضرورت پڑھی لکھی تھیں، چنانچہ جواد نے فن تجوید وصرف ونحو اپنی والدہ ہی کی خدمت میں حاصل کیا تھا، پانچ برس کے سن سے اکیس برس تک جواد کی پرورش کرنے کے بعد ۱۲۰۹ھ میں بمقام بصرہ دنیا سے رخصت ہوئیں۔

ولادت:

جواد کی ولادت ان کے والد ابراہیم کی وفات کے پانچ برس پیشتر ۱۱۸۸ھ میں بمقام ماریہ ہوئی، اس وقت وزیر بغداد حسن پاشا (ترکی) تھے، اور یہ حسن کی وزارت کا آخری زمانہ تھا۔

تعلیم وتربیت:

یہ معلوم ہوچکا ہے کہ ابراہیم ساباط اپنی اخیر عمر میں ہجر چلے گئے تھے، اس وقت جواد کی پیدائش ہوچکی تھی اور ابراہیم ان کو اور ان کی ماں کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ابھی جواد نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ باپ کا سایا سر سے اٹھ گیا، جب ابراہیم کے انتقال کا حال معلوم ہوا تو شہربان نے جواد کو لے کر جزیرہ کی طرف کوچ کردیا، کچھ دنوں تک ابوشہر میں بڑی عسرت وافلاس کی حالت میں زندگی بسر کی، خوش قسمتی سے حاجی کوراغلی جنھوں نے ابراہیم ساباط کی امارت موسم کے زمانے میں حج کیا تھا، شہربان کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کردیا تھا، جس سے پیٹ بھرنے کو ٹکڑا اور بدن چھپانے کو چیتھڑا میسر ہوجاتا تھا۔

ابوشہر میں کچھ دنوں رہ کر جزیرہ روانہ ہوگئیں اور وہاں ۱۲۰۶ھ تک مقیم رہیں، پھر جواد کو ۱۲۰۷ھ میں بمقام بصرہ نعمان آقا بن مصطفیٰ آقا ماردینی کے ساتھ خراج احتساب کی

کتابت پر مقرر کرادیا، یہ سلسلہ بھی کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا، آخرکار اسی سال کے اخیر میں کچھ معمولی چیزیں ساتھ کرکے محمد نبی اور محمد بن مشکور کی معیت میں بغرض تجارت کنکوں روانہ کیا، اس کے بعد ۱۲۰۹ھ میں شہربان کا بھی انتقال ہوگیا۔ پانچ برس کی عمر میں باپ کا سایا سر سے اٹھ گیا، اکیسویں برس ماں کی شفقت سے بھی محروم ہوگئے۔

اس مدت میں گو معاش کی جانب سے کبھی بے فکری حاصل نہیں ہوئی، نہ اطمینان سے کسی ایک جگہ قیام ہی ہوسکا، تاہم اس حالت میں بھی قریب قریب تمام علوم وفنون سے بقدر ضرورت واقفیت حاصل ہوگئی تھی، جواد نے خود اپنی تعلیم کا حال لکھا ہے، اور اپنے اساتذہ کے نام گنوائے ہیں، یہ معلوم ہوچکا ہے کہ تجوید، صرف ونحو والدہ کی خدمت میں حاصل کیا، ۱۲۰۲ھ میں بمقام ابوشہر ملا محمد صادق بہبانی سے اصول فارسی اور خطاطی سیکھی، ۱۲۰۴ھ میں عبداللہ بن ابی دندن ساکن حساء سے عروض وقوافی کی تحصیل کی، اور ۱۲۰۵ھ میں احمد بن حمد حساوی کی خدمت میں بمقام حساء معانی وبیان وبدیع پڑھا، ۱۲۰۶ھ میں بمقام بصرہ سید عبداللہ حداد اور نعمان بن سفر آفندی کی خدمت میں حدیث، فقہ، فرائض حاصل کیا، ۱۲۰۷ھ میں محمد غراب سے منطق وکلام اور حکمۃ نظریہ کے کچھ فنون سیکھے، ۱۲۰۸ھ میں بمقام دمشق عارف باللہ شیخ کامل عبدالجلیل نابلسی کی صحبت میں تصوف اور وجدانیات کی چاشنی سے آشنا ہوئے، اس کے بعد ۱۲۰۹ھ میں ماں کا انتقال ہوگیا، ان کے انتقال کے کچھ ہی بعد سے سیاحت شروع کی، اثنائے سیاحت میں بھی جب جب موقع ملا کچھ نہ کچھ تحصیل کرتے ہی رہے، چنانچہ ۱۲۱۳ھ میں جب ڈھاکہ پہنچے تو مولوی سید فضل علی عظیم آبادی کی خدمت میں رہ کر صرف ونحو کی خامی دور کی، ۱۲۱۶ھ میں مدراس میں مقیم ہوئے تو وہاں مولوی عبدالرحمٰن دامانی کے پاس منطق اور اصول فقہ کی تکمیل میں مصروف رہے، ان حضرات کے علاوہ شیخ عبداللہ مغربی، شیخ فضل اللہ بن عثمان حسادی اور مولوی صفدر علی خان ساکن مچھلی بندر اور پادری ہنری مارٹن برطانی انجینئر سے دیگر مختلف علوم وفنون سیکھے۔

سیاحت:

معلوم ہوتا ہے کہ والدہ کے انتقال کے بعد ہی جواد نے سیاحی شروع کر دی تھی، چنانچہ ان کا خود بیان ہے کہ ''۱۲۱۳ھ میں ڈھاکہ پہنچا'' اور اس سے پہلے وہ مختلف بلاد وامصار کی سیر کر چکے تھے۔ حرمین، حجاز، مصر، نجد، یمن وغیرہ کے نام خود انھوں نے لیے ہیں، اس سیاحت میں اقوام وملل کے حالات کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا اور ان حالات سے بہت کچھ قیمتی نتائج اخذ کیے، اور اپنی آئندہ زندگی میں اسلام کی جو عظیم الشان خدمت انھوں نے انجام دی، اس کا جذبہ ان کی اسی واقفیت وباخبری نے ان کے دل میں پیدا کیا تھا، جو انھیں اثنائے سیاحت میں اقوام وملل کے متعلق حاصل ہوئی تھی۔

جواد کی بیش بہا دینی خدمات

تبلیغ مسیحیت کا مقابلہ اور اس کے اسباب وعلل:

فاضل جواد کے تذکرۂ حیات لکھنے سے میرا اصلی مقصد انھیں خدمات کا ذکر کرنا ہے، جو اس بہادر فرزند اسلام نے انجام دی ہیں، اور وہ تبلیغ مسیحیت کا رد عمل ہے، جو وقت کی سب سے اہم دینی خدمت تھی؛ لیکن اس سے پہلے یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ وہ کون سے اسباب تھے، جن کی بنا پر اس خاص خدمت کا انتخاب کیا گیا اور اس کی انجام دہی کا خیال جواد کے دل میں پیدا ہوا۔ جواد نے اس کو خود ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''میں نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر سیر وسیاحت اور زمین کے طول وعرض کی پیمائش شروع کی، اس سیاحت میں مجھے یہ نظر آیا کہ اسلامی دنیا کے ہر ایک حصہ کے باشندے اپنا ایک مذہب مقرر کر کے اپنے مخالفین کی تضلیل وتکفیر میں مشغول ہیں، اور غیر ضروری باتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اور نصاریٰ نے جو رخنے ان کے دین میں ڈالے ہیں، مذہب پر حملے کیے ہیں اور نقصان

پہنچائے ہیں، ان کی بندش واصلاح، مدافعت وتلافی کی کسی کو فکر نہیں ہے۔ نجد، حرمین، جزیرہ، عجم، مصر، یمن ہر جگہ یہی قصہ ہے، میں اپنی سیاحت کے دوران میں ہندوستان پہنچا، وہاں کثیر التعداد علماء کا بھی یہی حال پایا، کم لوگ ایسے ملے جو ضروری امور کی طرف متوجہ ہوں۔

ادھر یہ حال ہے کہ ہندوستان کی عنان حکومت عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے، مسیحی مبلغین نے ایک جمعیت قائم کر رکھی ہے، جس کا نام ''برٹش اینڈ فارنر بائبل سوسائٹی'' ہے، اس کے مصارف کے متحمل مسیحی لوگ ہیں، سوسائٹی کے مبلغین حبش، چین، روم، ایران بلکہ تمام ربع مسکون میں پھیلے ہوئے ہیں، تبلیغ مسیحیت کا کام بڑے زور وشور سے ہو رہا ہے۔ ملیبار، مدراس، بنگالہ کے ایک لاکھ غیر مسلم افراد حلقہ بگوش مسیحیت ہو چکے ہیں اور دس ہزار فرزندان اسلام بھی آغوش اسلام سے بچھڑ کر عیسائیت قبول کر چکے ہیں۔

ان حالات کے مطالعہ سے میرے دل میں اسلام کا درد پیدا ہوا، میں نے سوچا کہ اگر میں نے ان کو اس حالت میں چھوڑ دیا تو معلوم نہیں کیسی بد سے بدتر حالت ہو جائے گی، اور اس وقت سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کوئی چارہ نہ ہوگا، اور اس وقت کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی''[1]۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جس اہم کام کا جواد نے بیڑا اٹھایا تھا، اس کے لیے سرمایہ اور مسیحیوں کے مذہب سے واقفیت ضروری تھی، جواد کی مالی حالت جس قدر گری ہوئی ہے، مخفی نہیں ہے، اور اس وقت تک مسیحیوں کے اصول وفروع سے بھی کافی واقفیت حاصل نہیں ہوئی تھی، اس لیے سب سے پہلے ان دونوں کا انتظام کر لینا ضروری تھا۔

عہدۂ قضا:

جواد کو یہ بات بہت مناسب معلوم ہوئی کہ جس گھر میں آگ لگانی ہے، اس میں

(۱) البراہین الساباطیۃ: ۳۰

اگراسی گھر کے چراغ سے آگ لگے تو خوب ہے، چنانچہ انھوں نے کسی بڑے انگریز کے ہاں ملازمت کرلی، اور کچھ ہی دنوں میں حسن تدابیر اور لطائف الحیل سے کچھ ایسا اس کا دل اپنے قابو میں کرلیا کہ اس نے سفارش کرکے اسحاق پٹن میں ان کو قاضی کا عہدہ دلوادیا۔

زبان انگریزی کی تحصیل:

جواد کو اب کسی قدر اطمینان حاصل ہوگیا اور انھوں نے کوشش کرکے انگریزی زبان سیکھنا شروع کی، ذہین وطبّاع تھے ہی، تھوڑے ہی دنوں میں اتنی مہارت حاصل ہوگئی کہ انجیل کا انگریزی ترجمہ سمجھنے لگے، یہ تبلیغ مسیحیت کے مقابلہ میں جواد کا پہلا قدم تھا، جب اتنا ہوگیا تو انھوں نے دوسرا قدم اٹھایا، یعنی ملت اسلامیہ سے اپنا انحراف ظاہر کرکے ۱۲۱۵ھ میں سیدھے مدراس پہنچے۔

انجیل کی خدمت:

اور وہاں مجمع مقدس سے درخواست کی کہ انجیل کا عربی ترجمہ کرنے کی خدمت اس کے سپرد کی جائے، تاکہ اہل عرب بھی انجیل مقدس سے فائدہ اٹھاسکیں، انجیل کا عربی ترجمہ کرنے کے لیے ان کو مترجم مقرر کرلیا گیا اور دس سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

لیکن اس طویل مدت میں کبھی وہ اپنے مخفی مقصد سے غافل نہیں ہوئے، اور نہ اس کی تکمیل میں کسی قسم کی کوتاہی کی، بظاہر انجیل کے ترجمہ میں مشغول تھے، مگر پوشیدہ طور پر وہ برابر اپنا اصلی کام انجام دیتے رہے، عیسائیوں کو ان پر پورا اعتماد ہوگیا تھا، اور وہ ان سے بہت خوش تھے۔

ترجمہ کی خدمت سے علاحدگی:

سوء اتفاق سے ۱۲۲۵ھ میں ایک دین فروش، دنیا ساز شخص حدیدہ سے وارد ہندوستان ہوا، جواد کے پاس آکر مقیم ہوا، یہ کیا جانتے تھے کہ وہ ان کے حق میں کانٹے بوئے

گا۔ انھوں نے دوادوش کرکے انگریزوں کے یہاں اس کو سوروپیہ ماہوار کی ملازمت دلوادی، اس نے اس احسان کی یہ مکافات کی اور حق نمک یوں ادا کیا کہ جواد کی طرف سے انگریزوں کے کان بھرنا شروع کیے اور ترجمۂ انجیل کے بہانہ سے مسیحیت کے قلعہ پر بمباری کے لیے جو گولہ بارود یہ تیار کررہے تھے، اس کا راز طشت از بام کردیا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اتہامات لگاکر انگریزوں کو جواد سے سخت بدظن کردیا، نوبت بایںجا رسید کہ جواد کو اپنی جان کے لالے پڑگئے، اس وقت ان کو مناسب معلوم ہوا کہ ترجمہ کے کام سے علیٰحدگی اختیار کرکے کچھ دنوں کے لیے وطن مالوف چلے جائیں، چنانچہ بارہ سال ترجمہ کا کام کرنے کے بعد ۱۲۲۷ھ میں اس کام سے دستبردار ہوکر خلفان بن سعید ازدی کی معیت میں وطن مالوف کے لیے جہاز میں سوار ہوئے، جہاز نے لنگر اٹھایا، ابھی کچھ ہی دور جہاز پہنچا ہوگا کہ رفیق سفر خلفان سے کسی بات میں تکرار ہوگئی اور اس کی وجہ سے ایسی رنجش پیدا ہوگئی کہ اس کی معیت میں سفر کرنا بھی ناگوار ہوگیا اور یہ ارادہ مصمم ہوگیا کہ کسی جگہ جہاز لنگر انداز ہوتو وہاں اس کا ساتھ چھوڑدیں، تلسیری میں جہاز لنگر انداز ہوا اور جواد وہیں اتر پڑے اور دوسرے جہاز کے انتظار میں وہاں کچھ دنوں تک پڑے رہے۔

بشارت اور ترجمہ کے کام پر دوبارہ تقرر:

ایک رات یونہی پڑے پڑے اپنی روانگی کے متعلق کچھ سوچ رہے تھے کہ یکا یک کسی نے آواز دی: جواد ساباط! یہ ''حاضر ہوا'' کہہ کر اٹھے اور دروازہ کھول کر باہر آئے تو مبہوت رہ گئے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا، مگر کوئی آدمی نظر نہ پڑا، دفعۃً پھر آواز آئی: ''جواد ساباط! وطن واپس جانے کا خیال محال چھوڑ دو، جس کام کو شروع کیا ہے جب تک اس کی تکمیل نہ کرلوگے گھر پہنچنا ناممکن ہے''۔ آواز سنائی دی اور کسی بولنے والے کا نشان نہیں ملا، تو جواد نے سمجھا کہ یہ صدائے غیب ہے، گھر جانے کی فکر چھوڑ کر مراجعت بنگالہ کا سامان کیا اور بنگالہ پہنچے، چونکہ ترجمۂ انجیل کا کام ادھورا ہی رہ گیا تھا، مسیحیوں کی بھی

خواہش تھی کہ ترجمہ مکمل ہو جائے، جواد کو بھی ضرورت تھی کہ وہ مواد پھر فراہم ہوں جن پر ان کے مقصد کی تکمیل موقوف تھی، اس لیے دوبارہ ترجمہ کی خدمت کے لیے ان کا تقرر عمل میں آیا، دوبارہ تقرر کے بعد دو برس تک ترجمۂ انجیل کا اور کام کیا، اور اس درمیان میں اپنے کام کو بڑی جانفشانی اور دماغ سوزی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

جواد کی دینی خدمات کی تفصیل:

جواد بظاہر تو مسیحیت قبول کر کے چودہ برس تک انجیل کے ترجمہ میں مصروف رہے، مگر وہ درپردہ مسیحیت کے جال کا تار و پود بکھیرتے رہے، جس کو سوسائٹی نے پھیلا رکھا تھا، اس طویل مدت میں انھوں نے دو بڑے پایہ کی کتابیں لکھیں، جن میں عقائد مسیحیت کی کمزوری، اس کے اصول و فروع کا بطلان کھول کر رکھ دیا، اسلام کی حقانیت خود عیسائیوں کی مسلّمہ کتابوں سے بیان کی، ایک کا نام "**الصراصر الساباطیة**" اور دوسری کا "**البراھین الساباطیة**" ہے، "صراصر" کو تو وہ نہ چھپوا سکے، البتہ براہین چھپوائی اور بڑا کام کیا، اس کا چھپوانا کوئی آسان کام نہ تھا، عیسائیوں کے ملازم تھے، عیسائیوں کو ان کی جانب سے شبہہ ہو ہی گیا تھا، اور بہت سے لوگ بھی ان کے سخت دشمن ہو رہے تھے، اور ان کی ہر نقل و حرکت کو بنظر تجسس دیکھ رہے تھے، دو تین آدمیوں کے علاوہ اور کوئی ساتھ دینے والا نہ تھا، ان حالات میں جواد ہی کا کام تھا کہ تقریباً اڑھائی سو صفحے کی کتاب چھپوا کر شائع کر دی۔

براہین کی طباعت اور اشاعت:

براہین کی طباعت اور اشاعت کا قصہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے، جواد کا جب دوبارہ تقرر ہوا، اس وقت سے وہ برابر اس فکر میں تھے کہ ان کی یہ کتابیں مفید نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ان کی اشاعت کا کوئی سامان نہ ہو، اس لیے وہ اپنی تنخواہ سے کچھ پس انداز کرتے جاتے تھے، جب کچھ معقول رقم یکجا ہو گئی، تو انھوں نے اپنا ایک ذاتی پریس قائم کیا، اور گھر میں چھپ کر اس کتاب کو چھاپنا شروع کیا، جواد کا حدیدی نمک خوار اب تک نمک

حرامی سے باز نہیں آیا تھا، اس کو کچھ شبہہ ہو گیا اور وہ تفتیش کرنے لگا کہ آخر یہ دروازہ بند کر کے کیا کیا کرتے ہیں، جب اتنا معلوم ہو گیا کہ کوئی کتاب چھاپ رہے ہیں تو پریس کے ملازموں کو بہکانا اور پھوڑنا شروع کیا، چنانچہ کئی ایک نے کام چھوڑ دیا، مگر جواد نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی دھن میں برابر لگے رہے، یہاں تک کہ براہین کے چھ سو نسخے تمام و کمال چھپ کر تیار ہو گئے، اور اس کے بعد تمام اخراجات جواد نے اپنی جیب خاص سے ادا کیے، براہین کے کل نسخے چھپا کر رکھ دیے، اس کے بعد خلفان بن سعید ازدی کے معرفت مختلف مقامات میں بھجوا کر مفت تقسیم کرا دیے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے، اور یہ تفصیل جواد نے براہین میں خود لکھی ہے:

۱۰۰/ نسخے حرمین، حجاز، نجد میں
۵۰/ نسخے یمن میں
۵۰/ نسخے عمان میں
۱۵۰/ نسخے بصرہ، بغداد، دجلہ، نجف، اور جزیرہ کے دیگر مقامات میں
۱۰۰/ نسخے ایران و ماوراء النہر میں
۱۵۰/ نسخے اسلامبول اور اس کے ملحقات میں
۱۰۰/ نسخے ہندوستان میں (۱)

کل نسخے وقف کر دیے، براہین کے ہر نسخہ پر یہ عبارت طبع کرا دی: "**وقفها عفا الله عنه كلها تقرباً الى الله ورسوله لا تباع ولا تشرى ولا تمنع عن ناقل ولا مطالع**".

غریب الوطنی کی حالت میں جب کوئی حامی و مددگار بھی نہ ہو اور ہر طرف سے دشمنوں کا نرغہ ہو، مخالفین کی نظر بچا بچا کر اڑھائی سو صفحے کی کتاب تصنیف کرنا، اور اس کی اشاعت کے لیے ایک خطیر رقم سے پریس قائم کرنا، اور ڈھائی سو صفحے کی کتاب کے

(۱) براہین ساباطیہ

۶۰۰ ر نسخے کی طباعت کے تمام مصارف کا تنہا متحمل ہونا، اور حسبۃً للہ اکثر بلاد اسلامیہ میں اس کے کل نسخے مفت تقسیم کرا دینا، کیا یہ اسلام کی معمولی خدمات ہیں؟ میرا تو خیال ہے کہ اگر ہر زمانے میں دو چار ایسے ہی دین کے مخلص خادم جو دین کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ اور مذہب کی جانب سے مدافعت کے لیے اسی طرح جانی و مالی قربانیاں دینے کو تیار ہو جایا کریں، تو مخالفین کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں اور ان کی کل تدبیریں بیکار ہو جائیں۔

جواد نے ان واقعات کو دردناک انداز سے نظم میں بیان کیا ہے، چند اشعار نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا[1]:

وأخذت أنظمها بسلک قریحتي	حتی غدت تحکي الکثیب المعثم
وأتیت في تنمیقها بغرائب	غراء لم تتأت للمتقدم
وطبعتها وجعلتها وقفاً ولا	أمسي لما أسست غیرمتمم
من عین مالي والطروس شواهدي	وسطورهن مع المداد الأدهم
وبنو الجروج یبیِّتون وقصدهم	أن یظفَروا مني بأدنی ملزم
والخِلُّ إن نادیتُ أو خاطبتُه	لم یلتفت نحوي ولم یتکلم
وکذا الصدیق یقول إن صادفتُه	إني براء منک إنک ملزمي
وشهرتها لم أخشَ دائرةَ الردی	والواش حولي کالحمام الحُوَّم
وجعلتها مني هدیة مخلص	لا باللئیم ألا ولا بالدِّعرِم

براہین کی بعض خصوصیات:

۱:- اناجیل اور دیگر صحیفوں کی عبارتیں ان کے انگریزی تراجم کے حوالے سے نقل کی گئی ہیں، جو ۱۶۰۴ء میں جیمس اول فرمانرائے برطانیہ کے حکم سے عالم وجود میں آئے تھے، پہلے اصل عبارت انگریزی زبان میں نقل کرتے ہیں، اس کے بعد عربی میں اس کا ترجمہ

کرتے ہیں۔

۲:- جس مطلب کو ثابت کرنا ہوتا ہے، اس کو عام فہم دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔

۳:- حتی الوسع بہت مختصر عبارت میں مطلب ادا کر جاتے ہیں۔

۴:- کہیں کہیں وہ مکالمات بھی ذکر کر جاتے ہیں، جو ان کے اور پادریوں کے مابین ہوتے رہتے تھے۔

۵:- کتاب کے مطالعہ سے ان تجار کا کیرکٹر صاف نظر آنے لگتا ہے، جو ممالک اسلامیہ سے بغرض تجارت وارد ہندوستان ہوتے تھے اور انگریزوں کے ہاتھ ان ممالک کی مخصوص چیزیں فروخت کرتے تھے، جو انگریزوں کے ہاں آ کر کسی صیغہ میں ملازم ہو جاتے تھے، درحقیقت اجمالی طور پر یہ کتاب ان کے حالات کا آئینہ ہے۔

براہین کی گمنامی کا سبب:

حیرت ہے کہ براہین کی تصنیف وتالیف، طباعت واشاعت کے تمام مراحل ہندوستان میں طے ہوتے ہیں، مگر آج چند اشخاص کے سوا کوئی اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ میں ملک کی اس بے اعتنائی پر دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا اور اس گمنامی کے اسباب کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ مولانا محمد احسن نانوتویؒ نے میری رہبری کی، اور ان کی ایک تحریر نے میری حیرت کا خاتمہ کر دیا، مولانا کی اس تحریر سے ان حالات کا بھی اجمالی علم حاصل ہوتا ہے، جو براہین کی اشاعت اور جواد کی ہندوستان سے روانگی کے بعد رونما ہوئے، مولانا کی عبارت یہ ہے:

”آنچہ محشی حال ایں جواد ساباط شنیدہ است کہ بعد ارتداد خود رسالۂ لا جواب در ردّ نصاریٰ نوشت وخفیہ طبع کنانید، وبعد تمامی طبع برمرکبے سوار شد وراہ عرب گرفت، وچوں رسالہ اش شیوع یافت حکام نصاریٰ آنرا ہر جا کہ یافتند جمع ساختہ بعضے نسخ طعمہ آتش ساختند، وبعض را در دریا اند، وبمقد ورخود درنابود کردنش

پرداختند ۔ ازیں معلوم می شود کہ نصرانی گشتنش بایں وجہ بود کہ حال ایں مذہب کما ینبغی دریابد، وبعد علم تفصیلی بر دآں شتابداھ[1]۔

اس عبارت سے چند فوائد حاصل ہوئے:

ا:-مولانا کے زمانہ تک جواد اور براہین کے جاننے والے لوگ موجود تھے۔

۲:- جواد عیسائیت کے بعد پھر مسلمان ہوئے، بعض حضرات جو جواد کو یہودی سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔اس خیال کی تردید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جواد نے براہین میں نصاریٰ کی طرح یہودیوں کے معتقدات کا بھی ابطال کیا ہے۔

۳:- براہین کی گمنامی اور بے نشانی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کچھ نسخے نذر آتش اور کچھ دریا برد کردیے گئے اور حکومت کے زور سے اس کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی کوشش کی گئی۔

۴:- مسیحیوں نے اپنے مقاصد کے لیے براہین کو بے حد مضر اور اپنی تدابیر کی کامیابی کے لیے سدّ راہ پایا، اس لیے اس کا نام ونشان مٹانے کی انتہائی کوشش کی گئی۔اس بات سے براہین کی عظمت ووقعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۵:-مولانا نے جن لوگوں کی زبانی یہ واقعہ سنا تھا، ان حضرات کی نظر میں بھی براہین ردنصاریٰ میں لاجواب تھی۔

جواد کی دیگر تصنیفات:

جواد کی دیگر تصنیفات کی تعداد تیس تک پہنچتی ہے، اکثر عربی زبان میں ہیں، بعض بعض فارسی اور اردو میں بھی ہیں، بعض کے نام یہ ہیں:

ا- ترجمۂ انجیل مقدس بزبان فارسی، ۲-ترجمۂ انجیل بزبان عربی، ۳-الجنن الساباطیۃ: یہ ان اعتراضات کا رد ہے، جو انجیل کے فارسی ترجمہ پر کسی نے کیے تھے، ۴-النفحت الساباطیۃ: جواد کے عربی اشعار کا مجموعہ، ۵-خیالات ساباطیۃ: فارسی اشعار کا

(۱) حاشیہ نفحۃ الیمن: ۱۴۲

مجموعہ، ۶-الخلاصۃ الساباطیۃ في عبادات الحنفیۃ، ۷-شراب الصوفیۃ: تصوف میں، ۸-دھماکۂ ساباطیہ (اردو) صرف ونحو میں۔

جواد کی ہندوستان سے روانگی:

جواد نے اسلام کی جس خدمت کا بار اپنے ذمہ لیا تھا، جب اس سے سبک دوش ہوگئے، تو انھوں نے مناسب سمجھا کہ اب ہندوستان چھوڑ دینا چاہئے، اور ممالک اسلامیہ میں سکونت اختیار کرنی چاہئے، جب رخت سفر باندھ چکے اور روانگی کے لیے بالکل آمادہ ہوگئے، تو براہین کا ایک نسخہ اور اس کے ساتھ ایک خط لکھ کر پادری طامسن کے نام روانہ کیا، خط کا خلاصہ یہ ہے:

''از: خادم دین محمدی ناصر شرع احمدی جواد ساباط بن ابراہیم ساباط حسنی حنفی:

پادری طامسن! ہداہ اللہ، واضح ہو کہ جب میں ان ممالک میں پہنچا اور آپ لوگوں کی مغویانہ اور مفسدانہ کارروائیاں دیکھیں، میں نے اس کا بھی مشاہدہ کیا کہ مسلمانوں کے جاہل طبقہ کے دل مائل ارتداد ہیں، اور میں نے مراکیوس کے وہ اعتراضات بھی پڑھے، جو اس نے قرآن مجید پر کیے ہیں، اور تمھارے مقاصد خوب اچھی طرح معلوم کرلیے، تو میں ہمہ تن تمھاری طرف متوجہ ہوگیا، اور گھر گرہستی چھوڑ کر تمہارے ساتھ اشتراک عمل کیا، لیکن میں نے جو کچھ کیا صرف تمھارے دین کی حقیقت اور تمھاری شریعت کے قواعد معلوم کرنے کے لیے کیا، جب میرا کام پورا ہوگیا، اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا، تو میں تم سے علیٰحدہ ہوگیا اور تم کو بھلا بیٹھا۔

براہین کا ایک نسخہ روانہ کرتا ہوں، میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس کی تصنیف وتہذیب میں صرف کیا ہے، اور بڑی دماغ سوزی کی ہے۔امید ہے کہ بنظر انصاف اور تعصب کی پٹی اتار کر اس کا بغور مطالعہ کریں گے، ممکن ہے

خدائے تعالیٰ اس کے ذریعہ آپ کو سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق دے، اور آپ کو بھی نبی عربی ﷺ کا نام لیوا بنادے، والسلام علی من اتبع الھدی۔

جواد کا فضل وکمال اور ان کے ایک معاصر کی شہادت:

احمد بن محمد شیروانی تیرہویں صدی ہجری کے ایک مشہور یمنی ادیب ہیں، نفحۃ الیمن اور عجب العجائب کے ذریعہ سے ہندوستان میں وہ کافی سے زیادہ مشہور ہو چکے ہیں۔ یہ جواد ساباط کے معاصر تھے، جواد سے ان کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی ہے، انھوں نے خود اپنی مقدم الذکر تصنیف میں جواد سے اپنی ملاقات اور جواد کے فضل وکمال کا ذکر کیا ہے، موصوف جواد سے ۱۲۲۲ھ میں ملے ہیں اور اس وقت تک جواد ابھی عیسائی ہی بنے ہوئے تھے، چنانچہ موصوف نے خود ان کو - اپنے خیال کے مطابق - مرتد ہی لکھا ہے، اور اس کے بعد جواد کی زندہ دلی، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی کی مدح سرائی کی ہے، پھر ان کی چودہ تصنیفات کے نام گنوا کر لکھا ہے کہ ان کے علاوہ ان کے اور بھی بہت سے رسائل ہیں اور ان کی فارسی اور عربی میں ایک وہ کتاب بھی ہے جس کو حل کرنے سے ان کے ہم عصر علماء عاجز ہیں، اور ان کے بعض قصائد میں غیر مستعمل اور غریب الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں، اس کے بعد اسی قسم کے تین قصائد کا انتخاب درج کیا ہے، اور اس کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی ہے:
هو أدقُّ من السحر، وأصلبُ من الصَخر، ما يلتذُّ به كل سامع، وتشنَف به المسامع. موصوف نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جواد عیسائی ہو جانے کے بعد ناثانئیل کے نام سے مشہور تھے۔

جواد کی وسیع المشربی:

براہین کے مطالعہ سے جواد کی وسیع المشربی کا بھی پتہ چلتا ہے، وہ باوجود حنفی المذہب ہونے کے حنفی، شافعی، شیعہ، سنی آویزشوں کو بہت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور حد درجہ اس سے بیزار ہیں، وہ تمام کلمہ گو مختلف فرقوں کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں، ان کی تمنا

ہے کہ تمام اندرونی اختلافات یک قلم مٹا کر مسلمانوں کی مختلف الخیال جماعتیں مخالفین کے مقابلہ میں ایک بنیان مرصوص کی شکل میں نظر آئیں۔

خاتمہ:

چونکہ اس صحبت میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے سے ایجاز واختصار پیش نظر ہے، اس لیے یہاں پہنچ کر بادل ناخواستہ قلم روک لینا پڑا، اور کئی ایک قابل ذکر باتیں لکھنے سے رہ گئیں، تاہم اگر وقت نے مساعدت کی تو کسی دوسری صحبت میں جواد کا مکمل تذکرہ قوم کے سامنے پیش کر سکوں گا، سر دست یہ مختصر تذکرہ قوم کی خدمت میں پیش کر کے امیدوار ہوں کہ قوم اس تذکرہ سے بہت کچھ سبق حاصل کرے گی، اور صاحب تذکرہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرے گی۔

☆......☆......☆

پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں

پورب کے خطہ میں جو اولیائے کرام آسودۂ خاک ہیں اور ان کو شہرتِ دوام وقبول عام حاصل ہے، ان میں ایک بہت برگزیدہ ہستی حضرت شاہ طیب بنارسی قدس سرہٗ کی ہے۔

ایک عرصہ سے مجھے حضرت موصوف کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق تھا، اور اس شوق میں مجھے ''مناقب العارفین'' کی تلاش وجستجو تھی، جس کو اُن کے حالات میں اُن کے صاحبزادہ شاہ محمد یٰسین قدس سرہ نے تصنیف فرمایا ہے، خوش قسمتی سے بنارس میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا، اور میں اس کے مطالعہ سے بہرہ ور ہوا۔

مجھے اس کتاب میں اچھا خاصہ تاریخی وعلمی مواد نظر آیا، اس لیے میں نے اردو میں اس کا خلاصہ قلم بند کرلیا، اور آج اسی خلاصہ کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کررہا ہوں۔

﴿مخدوم شاہ طیب بنارسی﴾
(المتوفی ۱۰۴۲ھ)

آپ نسباً فاروقی ہیں، آپ کے اجداد میں شیخ خلیل فاروقی پہلے پہل اس نواح میں وارد ہوئے اور مجھوارہا کے متعلقات میں جسری ایک گاؤں ہے، وہاں اقامت اختیار کی، اور وہیں فوت ہوئے، ان کا مزار جسری میں ہے، اُن کے صاحبزادے بندگی شیخ قطب کی شادی بھتری-ضلع غازی پور- کے قریب موضع خانقاہ میں شیخ نور کے گھرانے میں ہوئی تھی، اس لیے وہ خانقاہ میں رہتے تھے، اور وہیں ان کے صاحبزادے بندگی میاں فرید پیدا ہوئے، شیخ قطب کی وفات کے بعد بندگی میاں فرید اپنے بھائی میاں داؤد[1] کے ساتھ تحصیل علم کے

(۱) معارف میں ''میاں دادا'' چھپا ہے، لیکن بظاہر صحیح ''میاں داؤد'' ہے (مرتب)۔

ارادہ سے بنارس آئے اور تحصیل علم کے بعد دونوں بھائی اپنے پیر کے حکم سے بنارس ہی میں متاہل ہوکر مقیم ہوگئے۔ مخدوم شاہ طیب، میاں داؤد کے پڑپوتے ہیں، شیخ خلیل تک آپ کا سلسلۂ نسب یوں ہے: شاہ طیب بن شیخ معین الدین بن شاہ حسن بن داؤد بن قطب[1] بن خلیل۔

تعلیم وتربیت:

مخدوم شاہ طیب کا سن ولادت معلوم نہیں ہوسکا، مخدوم کی عمر دس سال کی تھی کہ اُن کے والد شیخ معین الدین کا انتقال ہوگیا، والدہ بقید حیات تھیں، مگر پرورش اُن کی پھوپھی نے کی، اس وقت مخدوم قرآن پاک پڑھتے تھے، قرآن پاک اور فارسی پڑھنے کے بعد ایک مدت تک استاذ الفضلا ءمخدوم العلماء میاں شیخ نظام بنارسی کی خدمت میں رہے، اور اُن کے مدرسہ میں صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد جون پور چلے گئے، اور وہاں بعض فضلاء کی خدمت میں نحو ومعانی پڑھنے کے بعد افضل العصر اعلم الدہر میاں شیخ نوراللہ انصاری[2] ہروی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، اور ان سے شرح وقایہ وحسامی کی تحصیل کی۔

اسی اثنا میں گھر والوں نے شادی کے لیے مجبور کیا، اس کی وجہ سے دوتین سال تک تحصیل علم کی طرف متوجہ نہ ہوسکے، دوتین سال کے بعد دوبارہ جون پور گئے، اور فقہ واصول کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، ابھی فقہ واصول کی تحصیل سے آگے نہ بڑھے تھے، کہ کسی وجہ سے یہ سلسلہ پھر بند ہوگیا، اور علم ظاہر کی تحصیل اسی منزل پر آکر رک گئی۔

(۱) مناقب العارفین ص ۸۸ و ۸۹ و ۹۴

(۲) نوراللہ انصاری، شیخ عبدالجلیل انصاری کے بھتیجے اور شاگرد رشید تھے، صاحب تحفۃ الابرار نے ان کو سرآمد ملایان جون پور قرار دیا ہے، بڑے عالم وفاضل اور درس وتدریس میں شہرۂ آفاق تھے، اورنگ زیب کے عہد میں کسی صوبہ کے صدر مقرر ہوئے، اور ۱۰۱۲ھ میں وفات پائی، مزار سدھور میں ہے (تحفۃ الابرار قلمی)۔ تجلی نور میں ان کو شیخ عبدالجلیل کا بھائی قرار دیا ہے، نیز ان کی قبر جون پور میں بتائی ہے۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں، تحفۃ الابرار کے مصنف نے ملا نوراللہ کا زمانہ پایا ہے، اور وہ ان کے استاذ بھائی ہیں، اس لیے انھی کا بیان قابل اعتماد ہے۔ منہ

بیعت:

سلسلۂ تحصیل بند ہوجانے کے بعد ایک بار مخدوم شاہ طیب کو سال بھر تک جون پور میں کسی ضرورت سے رہنا پڑا، اس درمیان میں مولانا خواجہ کلاں جون پور میں رونق افروز ہوئے، ان کے ہمراہ شیخ تاج الدین جھونسوی بھی تھے، جن سے مخدوم صاحب کے دوستانہ تعلقات طالب علمی کے زمانہ سے تھے، اس دفعہ جب ان سے مخدوم صاحب کی ملاقات ہوئی تو پرسش احوال کے بعد مخدوم صاحب نے کہا کہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ حضرت شاہ حسن بنارسی - اپنے دادا - کے کسی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کروں، شیخ تاج الدین یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ مولانا خواجہ کلاں حضرت شاہ حسن ہی کے خلیفۂ برحق ہیں، اور خوش قسمتی سے اس وقت یہیں رونق افروز ہیں، مخدوم خوشی سے اچھل پڑے، اور اسی وقت مولانا خواجہ کلاں کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت سے مشرف ہوئے، مولانا خواجہ کلاں کی اقامت جھونسی ضلع الہ آباد کے قریب شیخ پورہ میں تھی، بیعت کے بعد مخدوم صاحب برابر شیخ پورہ میں حاضر ہوا کرتے تھے، دوسری یا تیسری حاضری میں مولانا نے ان کو اجازت نامہ اور پیراہن عطا فرما کر ان کی تکمیل کی خدمت شیخ تاج الدین کو سپرد فرمائی، اس کے بعد مخدوم صاحب شیخ تاج الدین کی خدمت میں رہنے لگے، ایک مدت دراز کے بعد شیخ نے ان کو تعلیم وتلقین کی اجازت دے کر بنارس روانہ کیا، مخدوم صاحب وہاں سے منڈواڈیہہ آئے، لیکن ازدحام کی وجہ سے اطمینان نصیب نہ ہوا، اس لیے قلعۂ بنارس کے قریب گنگا وبرنا کے درمیان (جہاں مخدوم شاہ طیب کا آباد کیا ہوا گاؤں شریعت آباد آج بھی موجود ہے) اپنا حجرہ بنایا، اور دو تین دوستوں کے ساتھ وہیں رہنے لگے، تھوڑے ہی دنوں میں وہ شہرت نصیب ہوئی کہ وہاں طلبہ اور مریدین ومسترشدین کا ہجوم ہونے لگا، اکثر مریدوں نے وہیں اپنے مکان بنوائے اور دست کار مسلمان آباد ہوئے، پھر بعض معتقدوں نے خانقاہ اور مسجد تعمیر کرائی، شیخ تاج الدین کی وفات کے بعد جس وقت مخدوم شاہ طیب نے پیران سلسلہ کے مزارات پر حاضری کے ارادہ سے دہلی کا سفر کیا، تو دہلی میں حضرت شیخ عبدالحق محدث

دہلوی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، اور اُن سے سلسلۂ قادریہ کی اجازت حاصل کی، اور ان کے ہاتھ سے خرقۂ قادریہ پہنا۔

معمولات:

شریعت آباد میں قیام کے بعد مخدوم شاہ طیب مریدوں کی تربیت، فقیروں کی خدمت اور عبادت گذاری میں شب وروز ایسے مصروف تھے کہ کسی وقت فارغ نظر نہیں آتے تھے، ان کا معمول تھا کہ اکثر نمازِ عشاء سے پہلے کھانا کھالیتے تھے، عشاء کے بعد بکثرت نوافل پڑھتے، پھر وظائف سے فارغ ہوکر بستر پر جاتے، اور کم وبیش ایک پہر آرام کرکے اٹھ جاتے، اور وضو کرکے نماز تہجد پڑھتے، اس کے بعد اکثر جہر کے ساتھ صبح تک ذکر کرتے رہتے تھے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تہجد کے بعد صبح تک اپنے صحن میں ٹہلتے، اور یہ اشعار پڑھتے اور روتے:ـ

گرصد ہزار قرن ہمہ خلق کائنات　　فکرت کنند درصفت وذاتت اے خدا
آخر بعجز معترف آیند کاے الہ　　دانستہ شد کہ ہیچ ندانستہ ایم ما

اور کبھی تہجد کے بعد تلاوت میں مشغول ہوجاتے، نماز فجر کے بعد اکثر اسی جگہ بیٹھے رہتے، اور کبھی حجرہ میں جاکر اوراد وتلاوت ومراقبہ میں مشغول ہوجاتے، نماز چاشت کے بعد اکثر تلاوت کرتے رہتے، نصف النہار کے قریب قیلولہ کرتے - تھوڑی دیر لیٹ جاتے - ظہر کے بعد پھر ایک پارہ قرآن پاک پڑھتے، اس کے بعد سبق پڑھاتے، اور کبھی کبھی کچھ لکھتے، عصر کے بعد مغرب تک مصلے پر بیٹھے ہوئے مشغول رہتے، مغرب کے بعد بھی ذکر ومراقبہ ونماز میں مصروف رہتے، ان اوقات میں کوئی آجاتا تو اس سے بات چیت بھی کرلیتے، اور آنے والے کی بہت دل جوئی فرماتے۔

حضرت مخدوم صوم داؤدی کے پابند تھے، نیز پنج شنبہ، جمعہ، دوشنبہ، ایام بیض، عاشورا، اور عشرۂ ذی الحجہ کے روزے بالالتزام رکھتے تھے، رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں اکثر اعتکاف کرتے۔

وضع وقطع:

کپڑے موٹے جھوٹے پہنتے، اکثر گزینہ کا کرتا بنواتے، اور نیلا یا سبز عمامہ باندھتے، اور انہی رنگوں کو پسند کرتے تھے، جوگیوں کا رنگ سخت ناپسند کرتے، اور مریدوں کو بھی اس رنگ کے کپڑے استعمال نہ کرنے دیتے، عمامہ پانچ یا سات گز کا ہوتا تھا، نیم آستین بہت پسند تھی، اس پر پشمینہ کا جبہ لازم تھا، گدڑی کم پہنتے تھے، آخر وقت میں کوئی مرید سلا کر لایا تو چند روز اس کو پہنا تھا، اور پسند بھی کیا تھا، فرغل سے بہت برہم ہوتے تھے۔

طریق تربیت:

مخدوم صاحب کا دستور یہ تھا کہ ہر شخص کو فوراً مرید نہیں کرتے تھے، جب پوری رغبت پاتے اور صلاح میں مستقیم دیکھتے، تب بیعت کرتے، اور ابتدا میں صرف ایام بیض کے روزے اور چھ رکعت صلوٰۃ الاوابین اور کچھ نوافل ووظائف بتاتے، اور مجاہدۂ نفس اور تعمیر اوقات کی تاکید فرماتے، تقلیل طعام کا مقید نہ فرماتے، اکثر لوگوں سے یہ کہتے کہ کام کرنا چاہئے، کھانا کم کرنے کی حاجت نہیں ہے، اور اگر کسی کو تقلیل طعام کا مشورہ دیتے تو اس کی تاکید فرماتے کہ بتدریج کم کرنا چاہئے، اور کم بھی اتنا کہ قوت عبادت میں ضعف نہ پیدا ہو، اور مدتوں تک ذکر کی تلقین نہیں فرماتے، جب اقسام طاعت سے اوقات معمور ہوجاتے، اور عبادت کی حلاوت حاصل ہونے لگتی، اور فواحش نفسانی ولذت شہوانی سے رہائی حاصل ہوجاتی، اس وقت ذکر جہر تلقین فرماتے، اور جب تک مرید کمال استقامت کو نہیں پہنچ لیتا، اسرار کی گفتگو نہ فرماتے۔

توکل وقناعت:

ابتدائے قیام شریعت آباد میں بہت تنگی وعسرت کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی، اکثر فاقے کی نوبت آجاتی تھی، بعد میں فتوحات کا دروازہ کھل گیا، مخدوم کے مریدوں اور

معتقدوں میں زیادہ تعداد دست کار صالح مسلمانوں کی تھی، وہ کثرت سے تحفے اور ہدیے پیش کرتے، جس کو مخدوم بے تامل قبول فرماتے، اور اس کو خاص اپنی خوراک وپوشاک میں صرف فرماتے، مال داروں کے ہدیے جب تک ان کی نیت اور ان کے اعتقاد کی پختگی کا اطمینان نہ فرمالیتے، نہ قبول کرتے، جب اطمینان حاصل ہوجاتا تو قبول کرتے، لیکن اس کو فقیروں، ہمسایوں اور مسافروں پر صرف فرماتے، خود استعمال نہ کرتے [۱]۔

اخلاق وعادات:

مہمانوں اور مسافروں کی بہت دل جوئی فرماتے، بیکسوں کی ہمدردی، کمزوروں کی غم خواری اور حاجت مندوں کی کار برآری آپ کا شیوہ تھا، کوئی اپنی امداد یا سفارش کے لیے امرا وحکام کے پاس لے جانا چاہتا تو بے تامل چلے جاتے، حکام بھی آپ کی بات نہ ٹالتے۔

آپ اغنیاء کے ساتھ گفتگو میں بہت سخت تھے، نرمی سے ہرگز ان سے بات نہ کرتے، ان کی خلاف شرع حرکات پر بہت ڈانٹتے، اگر کوئی مونچھیں بڑھائے ہوئے حاضر خدمت ہوتا تو اس کی مونچھیں کاٹ دیتے، داڑھی منڈوں کا منہ نہ دیکھتے، اور اگر دیکھتے تو ان سے توبہ کراتے، اور اُن کے منہ پر ہاتھ پھیرتے، اس کے بعد ان کو داڑھی رکھنے کی توفیق ہوجاتی، آپ کے کلام میں بڑا اثر تھا، اکثر بدکار لوگ آپ کے کلام کی برکت سے نیکوکار بن گئے۔

اہل دنیا سے بہت متنفر تھے، ان کے نذرانے قبول نہ کرتے، مددمعاش کو مددممات کہتے تھے۔

اپنے معاصرین کا ذکر بھلائی کے ساتھ کرتے، مشائخ وقت میں سے کسی کی نسبت کوئی دریافت کرتا، تو فرماتے کہ بزرگ ہیں۔

حقائق واسرار کا ذکر جو اس زمانہ میں خانقاہوں میں رائج تھا، آپ کی مجلس میں بالکل نہ ہوتا تھا، فرماتے تھے کہ ان حال کی باتوں کو قال میں لانا ادب سے دور ہے۔ فرماتے تھے کہ مذاکرہ کے لائق یہی مسائل شرعیہ اور قواعد اخلاق وآداب ہیں [۲]۔

(۱) مناقب العارفین ص ۱۱ (۲) ایضاً: ص ۱۲

قوالی سے پرہیز:

ابتداء میں سماع کے بہت دل دادہ تھے، مگر آخر وقت میں قوالی سے بالکلیہ پرہیز کرنے لگے تھے، اور فرماتے تھے کہ اس زمانہ میں سرود نہ سننا چاہئے کہ کوئی شرط اب موجود نہیں رہ گئی، زمانہ خراب ہوگیا، مناسب یار نہیں رہے، اور قوالوں میں لالچ پیدا ہوگئی ہے، ایسے وقت میں قوالی سننا درویشوں کے طریقے کے مناسب نہیں ہے[۱]۔

پابندی شریعت کا اہتمام:

مخدوم صاحب کو پابندی شریعت میں کمال استقامت حاصل تھا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب میں بہت سخت تھے، جاہلانہ رسمیں اور اکثر بدعتیں جو اس دیار میں رائج تھیں مثلاً جلوہ، نقارہ اور شادی بیاہ کی رسمیں ان سب کو انھوں نے نیست ونابود کردیا تھا، اہل بدعت وغفلت کے حق میں بہت سخت تھے، خلاف شرع بات دیکھ کر بے قابو ہوجاتے، ان کے قریب اگر کوئی دمامہ بجاتا، اور اس کی آواز ان کے کان میں پڑ جاتی تو جاکر اس کو توڑ ڈالتے، کسی کو فجر کے وقت سوتا ہوا پاتے تو اس کے منھ پر پانی ڈال کر جگاتے، یا لکڑی سے بیدار کرتے، اور کبھی کبھی تو مار دیتے[۲]۔

شاہ یٰسین صاحب سے ایک دفعہ پوچھا کہ تہجد کے وقت اٹھتے ہو، اور اسماء حسنیٰ کا ذکر کرتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت سلامت کبھی کبھی اٹھتا ہوں، مداومت نہیں ہے، فرمایا کہ میں نے تم کو پیراہن اسی لیے دیا ہے؟؟ ہرگز تساہل نہ کرنا، اور نماز تہجد کو ذکر اسماء حسنیٰ کے ساتھ اپنے اوپر لازم قرار دینا، ذکر جس وقت فرصت ہوکر لو، اس کے لیے وقت تہجد لازم نہیں ہے، ہاں ناغہ نہ کرو[۳]۔

(۱) مناقب العارفین:۱۳
(۲) ایضاً (۳) ایضاً ص۲۴

حضرت مخدوم کے خلفاومریدین

مخدوم شاہ طیب کے فیض تربیت سے جو بزرگ مرتبۂ کمال کو پہنچے، ان کی تعداد بہت ہے، مگر ان میں دو بزرگ ان کے حقیقی خلیفہ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک آفتاب آسمان ہدایت اور قطب فلک ارشاد ہے۔

۱:-ایک بندگی شیخ ناصر الدین جو مولانا خواجہ کلاں شیخ پوری کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، مخدوم صاحب ان کو بچپن ہی سے بہت چاہتے تھے، آپ ہی کی خدمت میں وہ رہتے تھے، صرف ونحو کی تعلیم بھی آپ ہی سے حاصل کی، اس کے بعد مخدوم صاحب سے اجازت لے کر جون پور گئے، اور فقہ واصول ومعانی کی تحصیل کرنے کے بعد مدتوں آگرہ میں رہ کر تفسیر وحدیث کا فن پڑھا، اور وہیں تمام کتب متداولہ سے فراغت حاصل کرکے فاضل ہوئے۔

تحصیل کے بعد گھر پہنچے تو مولانا خواجہ کلاں سے اجازت لے کر شیخ تاج الدین جھونسوی نے ان کو اپنا مرید کیا، اور تعلیم وتربیت فرمائی، شیخ کی وفات کے بعد ان کا بیشتر وقت مخدوم صاحب کی صحبت میں گذرتا تھا، مخدوم صاحب ان کی تربیت بہت توجہ سے فرماتے تھے، ان دونوں بزرگوں نے اپنی خلافت ان کو تفویض فرمائی۔

مخدوم صاحب نے جب اپنے صاحبزادے مخدوم شاہ یٰسین کو مرید کیا تو اس وقت شیخ ناصر الدین موجود تھے، مخدوم نے ان کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ آپ ان کے کفیل ہیں، مطلب یہ تھا کہ ان کی تربیت آپ کے سپرد ہے، شیخ موصوف ''مناقب العارفین'' کی تصنیف کے وقت[۱] تک زندہ تھے۔ شاہ یٰسین ان کو مخدومی ومولائی ومرشدی لکھتے ہیں۔

۲:-دوسرے بندگی میاں شیخ عبدالرشید جون پوری صاحب مناظرہ رشیدیہ، جون پور کے شہرۂ آفاق عالم اور سجادہ درویش تھے، مدۃ العمر درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا، ابتداء میں اپنے پدر بزرگوار کے مرید ہوئے، بلکہ خرقۂ خلافت سے بھی مشرف ہوئے، لیکن والد کی زندگی میں سلوک اختیار نہیں کیا تھا، ان کی وفات کے بعد منڈواڈیہہ حاضر ہوکر مخدوم

(۱) مناقب العارفین کا سال تصنیف ۱۰۵۴ھ ہے۔

صاحب سے مرید ہوئے اور تعلیم حاصل کی اور مخدوم صاحب کی صحبت ان کو ایسی پسند آئی کہ درس وتدریس کا مشغلہ چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا، مگر حضرت مخدوم نے اس کو پسند نہیں کیا، اور اس سلسلہ کو باقی رکھنے کی تاکید کے ساتھ ان کو جون پور رخصت کیا، اور فرمایا کہ صبح کے وظیفہ کے بجائے طالب علموں کو سبق پڑھائیں کہ یہ بھی عبادت ہی ہے، اس کے بعد شاہ عبدالرشید برابر مخدوم کی خدمت میں آتے جاتے رہے، تا آنکہ مخدوم نے خواجگانِ چشت کا پیراہن اور سلاسل چشتیہ وقادریہ وسہروردیہ میں بیعت کرنے کی اجازت ان کو دی اور اپنا خلیفۂ مطلق قرار دیا۔

حضرت مخدوم کے دوسرے مریدوں میں مندرجہ ذیل حضرات بھی قابل ذکر ہیں:

۱:- میاں شیخ عالم: جو مخدوم صاحب کے چچا اور شیخ تاج الدین کے مرید تھے، مگر اپنے کو حضرت مخدوم کے مریدوں میں شمار کرتے تھے اور اکثر ان کی صحبت میں رہتے تھے، حضرت مخدوم سے ایک سال پہلے-۱۰۴۱ھ- وفات پائی، منڈواڈیہہ میں حوض (تالاب) کے اوپر ان کا مزار ہے۔

۲:- شیخ عبدالمومن کشمیری: اوائل میں شاہی نوکر تھے، مخدوم سے مرید ہونے کے بعد مجاہدے اور ریاضتیں کیں، اور بلند مقامات حاصل کیے۔ ۱۰۳۰ھ میں وفات پائی، منڈواڈیہہ میں مخدوم صاحب کی والدہ کے مزار کے پاس ان کا مزار ہے۔

۳:- شیخ فاضل پھلتی: فاضل وقت وعالم زمانہ تھے، مخدوم صاحب کی خدمت میں پانچ سال تک استفادہ کیا اور نعمتیں حاصل کیں، اس کے بعد مخدوم نے ان کو باصرار پھلت رخصت کیا، پھلت میں بہت سے لوگ ان سے فیضیاب ہوئے، ان کا مزار پھلت کے روضہ میں ہے۔

۴:- شیخ حسن: جن کی وفات ۱۰۴۹ھ میں ہوئی، اور ان کا مزار شریعت آباد میں خود ان کی بنا کردہ مسجد کے صحن میں ہے، یہ بزرگ مولانا محمد رہتکی [1] قدس سرہ العزیز کے مرید تھے،

(۱) مولانا محمد رہتکی بڑے صاحب فیض بزرگ تھے، ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ ان سے تقریباً تین سو کافروں نے پڑھا تھا، اور جو ان سے پڑھتا تھا مسلمان ہوجاتا تھا (مناقب العارفین ص ۲۲)

مگر مخدوم صاحب کے صحبت یافتہ تھے۔

۵:- شیخ عبداللہ مشہدی بھی مخدوم صاحب کے مرید باصفا اور باخدا بزرگ تھے، طالب علمی کے سلسلہ میں زیادہ باہر رہنے کی وجہ سے خلافت سے مشرف نہیں ہوسکے، تاہم وہ اس کے اہل تھے، بڑے متبع سنت ونیک کردار تھے۔

مخدوم صاحب کے سجادہ نشین:

مخدوم صاحب کے ممتاز خلفاء میں خود ان کے صاحبزادہ مخدوم شاہ یٰسین بنارسی بھی ہیں، جو ان کے بعد ان کے سجادہ نشیں ہوئے، وہ پندرہ سال تک کبھی ان سے جدا نہیں ہوئے، اور انھی کی خدمت میں ''ارشاد'' و''کنز الدقائق'' تک تحصیل کی، اس کے بعد مخدوم نے ان کو جون پور روانہ کیا۔ وہاں افضل العلماء بندگی میاں شیخ افضل [1] جون پوری اور اعلم زمانہ میاں شیخ عبدالرشید [2] جون پوری کے پاس سات آٹھ سال تک مصروف تحصیل

(۱) میاں شیخ افضل استاد الملک کے لقب سے مشہور ہیں، ان کے والد شیخ حمزہ مفتی رودولی میں رہتے تھے، ابتداء میں اپنے والد سے پڑھا، تکمیل دہلی جاکر ملا شیخ حسین کے حلقۂ درس میں کی، صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث کی قرأت وسماعت ملا ابوحنیفہ کی خدمت میں کی، استاد الملک نے اپنے چھوٹے بھائی سلطان محمود کے ساتھ جون پور میں قیام کیا۔ ملا محمود جونپوری اور دیوان عبدالرشید آپ کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ ۱۰۳۲ھ میں انتقال کیا، چاچک پور (جون پور) میں مدفون ہوئے (تجلی نور ص ۴۳)

(۲) میاں شیخ عبدالرشید جن کو دیوان محمد رشید بھی کہتے ہیں، عثمانی مشہور ہیں، ان کے والد شاہ جمال مصطفیٰ موضع بردنہ پرگنہ انگلی ضلع جون پور کے تھے، پہلے آپ نے ملا شمس نور بردنوی سے پڑھا، اس کے بعد ملا افضل جون پوری کے یہاں فاتحہ فراغ پڑھا، ملا محمود جونپوری کے معاصر تھے، پہلے اپنے والد کے مرید ہوئے، جو ایک واسطہ سے شیخ نظام الدین امیٹھوی کے مرید تھے، پھر شاہ طیب بنارسی کے مرید ہوئے اور انھی سے خلافت پائی۔ مناظرہ میں آپ کا رسالہ رشیدیہ داخل درس نظامی ہے، آپ نے بردنہ کی سکونت ترک کرکے جون پور میں ایک خانقاہ تعمیر کی، اور وہیں مقیم ہوئے۔ ۱۰۸۳ھ میں واصل بحق ہوئے، محلّہ رشید آباد (جون پور) میں مدفون ہیں (تجلی نور)۔ حضرت شاہ طیب بنارسی کے خلفاء میں آپ کا ذکر ہوچکا ہے، سید غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی سبحۃ المرجان میں آپ کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ هو من كبار الأولياء و كرام العلماء، یہ بھی لکھا ہے کہ شاہجہاں نے قاصد بھیج کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی، مگر انھوں نے انکار کردیا، اور اپنے زاویہ سے قدم باہر نہیں نکالا (سبحۃ المرجان ص ۶۶)۔

رہے، اور منطق ونحو وفقہ واصول اور بعض رسائل حکمت پر عبور حاصل کیا، سال میں ایک دفعہ دو تین ماہ کے لیے گھر آتے، اور مخدوم سے فیوض وبرکات حاصل کرتے، انیس سال کی عمر میں مخدوم نے ان کو مرید کیا، اور کچھ چیزیں تلقین فرمائیں، بیس سال کی عمر میں عید کے دن خواجگان چشت کا پیراہن عطا ہوا، اور اجازت نامہ وخلافت سے مشرف ہوئے، یہ ۱۰۴۰ھ کا واقعہ ہے۔

جس وقت وہ اصول بزدوی پڑھ رہے تھے، اس وقت مخدوم صاحب کبھی فرماتے کہ اب بس کرو، فقیر کے لیے اتنا علم کافی ہے، اور کبھی یہ کہتے کہ کوئی دوسری چیز پڑھو، اس زمانہ میں چونکہ ان کی شادی ہوچکی تھی، اور سال بھر تک پڑھنے کا بہت نقصان ہوا تھا، اس لیے فرمایا کہ جون پور گھر سے بہت قریب ہے، اس کی وجہ سے پڑھنے کا نقصان ہوتا ہے، تم کڑہ چلے جاؤ، شاہ یٰسین صاحب کڑہ چلے گئے، اور وہاں استاد علماء میاں شیخ جمال اولیاء[1] کی خدمت میں ہدایہ جلد اول کی قرأت اور بیضاوی کی سماعت شروع کی، مگر ابھی دو اڑھائی مہینے ہی گذرے تھے کہ مخدوم صاحب نے ان کو واپس بلا بھیجا، وہ کڑہ سے چلے تو راستہ ہی میں خبر ملی کہ مخدوم صاحب کا وصال ہوگیا۔

مخدوم صاحب کا وصال:

مخدوم صاحب کا وصال مہ پورہ میں ہوا، وہاں سے نعش مبارک منڈواڈیہہ لائی گئی، اور وہیں آپ مدفون ہوئے، وفات کے وقت شاہ یٰسین صاحب موجود نہیں تھے، میاں شیخ ناصر شیخ پوری ساتھ تھے، اور انھیں نے آپ کو سپرد خاک کیا، دوسرے دن شاہ یٰسین پہنچے، اور تیسرے دن میاں شیخ عبدالرشید نے پہنچ کر فاتحہ پڑھی، اور ان کی دل جوئی فرمائی،

(۱) شیخ جمال اولیاء بڑے متبحر عالم اور عارف کامل تھے، میر سید محمد کالپوی نے بھی زیادہ انھی کی خدمت میں تحصیل علم کی تھی، نیز چشتی طریقہ میں انھی کے مرید ومجاز تھے، میر سید محمد کی وفات ۱۰۷۱ھ میں ہوئی (تقصار ص ۲۰۵) شیخ جمال اولیاء، شیخ بہاء الدین جون پوری کے خلیفہ میاں سالار بڈھ ساکن کڑہ کی اولاد میں تھے، جیسا کہ مخدوم محمد عیسیٰ کے ذکر میں آگے مذکور ہوگا، میاں شیخ سالار، شیخ بڈھ حقانی کے بھی مرید وشاگرد تھے، جیسا کہ پہلے آچکا ہے۔

یہ حضرات ایک ماہ تک وہیں مقیم رہے، یہ واقعہ شوال ۱۰۴۲ھ کا ہے۔

شاہ یٰسین صاحب کا بیان ہے کہ میں نے ایک رات آپ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ یہاں کیا گذری؟ فرمایا خوب گذری، اور اونچا مقام نصیب ہوا، لیکن بیٹا! میرا ارادہ تھا کہ اس بارگاہ میں درویشی کا ہدیہ پیش کردوں، پر یہاں تو یہ حال ہوا کہ درویشی کا نام دامن میں چھپانا پڑا، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مخدوم کے الفاظ یہ تھے:

''دل میرا ایسا تھا کہ اس درگاہ منہ (میں) فقیری کنہ (کو) تحفہ کیجئے،
کاپی ایہان (یہاں) دامن تلین (تلے) چھپاونان (چھپانا) پڑی ہے''۔

﴿شیخ تاج الدین جھونسوی﴾

(المتوفی ۱۰۳۰ھ)

ہر چند کہ مخدوم شاہ طیب کو بیعت اور خلافت واجازت مولانا خواجہ کلاں سے حاصل تھی، مگر چونکہ ان کی تربیت وتکمیل شیخ تاج الدین نے فرمائی تھی، اس لیے وہ ان ہی کو اپنا پیر سمجھتے تھے، اور اپنے کو ان ہی کی طرف منسوب فرماتے تھے۔

شیخ تاج الدین، مولانا خواجہ کلاں کے چچازاد بھائی تھے، مولانا کے والد بزرگوار شیخ نصیرالدین کے پانچ بھائی تھے۔ میاں شیخ الہ دین، میاں شیخ ضیاء الدین، شیخ منہاج الدین، شیخ ابوالفتح اور شیخ سلیمان، ان میں سے شیخ منہاج الدین کے فرزند شیخ تاج الدین تھے اور شیخ نصیرالدین کے مولانا خواجہ کلاں۔

شیخ تاج الدین نے فارسی پڑھنے کے بعد اپنے چچا شیخ نصیرالدین کے پاس صرف کی کچھ کتابیں پڑھیں، بعد ازاں تحصیل علم کے لیے جون پور گئے، وہاں نحو وصرف کی کتابیں پڑھیں، اکثر میاں شیخ نوراللہ انصاری ہروی کی خدمت میں استفادہ کیا، ابھی منار الاصول تک پڑھا تھا کہ ان میں ایک جذبۂ قوی پیدا ہوا، اور پڑھنا چھوڑ کر جون پور سے شیخ پورہ چلے آئے، اور مولانا خواجہ کلاں کی خدمت میں منازل سلوک طے کرنے میں مشغول ہوگئے،

اس وقت ان کو سماع کا شوق تھا، مولانا خواجہ کلاں سے چھپ چھپ کر سنتے تھے، مگر مولانا خواجہ کلاں نے کسی کسی وقت ان کو اشارۃً کچھ کچھ کہا تو سماع سے ان کا دل سرد ہو گیا، کم سنی میں ان کے والد نے ان کو بندگی شاہ ابوالفتح(۱) حسنی ظفر آبادی کے ہاتھ پر بیعت کرایا تھا، مگر مدارجِ سلوک انھوں نے مولانا خواجہ کلاں کی صحبت میں طے کیے، اکثر مشائخ وقت سے ملاقاتیں رہیں، اور وہ ان کے مداح تھے، میاں شیخ جعفر ساکن امیٹھی(۲) دو ہفتہ ان کے پاس رہے۔ اور انھوں نے شیخ تاج الدین کے فضل وعلوشان کا اعتراف کیا، مولانا شیخ افضل جون پوری بھی ان کے کمالات کے معتقد ومعترف تھے۔

معمولات واخلاق وعادات:

شیخ تاج الدین کھانا بہت کم کھاتے تھے، صرف دو ایک چمچہ صرف مونگ (غالبًا مونگ کی کھچڑی) یا چاول اور شوربا کھاتے تھے، اکثر جاڑوں اور برسات میں زنجبیل کے مربّی سے افطار کرتے تھے، بہت سے معجون بھی تیار رکھتے تھے، جو مریضوں کو دیتے تھے، راتوں کو اکثر بیدار رہتے، پاؤں پھیلا کر کبھی نہ سوتے، چھوٹے سے کھٹولے پر لیٹتے تھے، جس پر پیر پھیلانا ہی ممکن نہ تھا، تھوڑی دیر ویسے ہی پاؤں سمیٹے ہوئے سو جاتے، یا آنکھ بند کیے پڑے رہتے، پھر اٹھ کے وضو کرتے، اور نماز یا مراقبہ میں مشغول ہو جاتے، اکثر نماز تہجد کے بعد جہر کے ساتھ ذکر کرتے، اور بڑی محنت کرتے تھے، سلسلۂ چشتیہ کے علاوہ اذکار سہروردیہ وشطاریہ، وقلندریہ ومداریہ کی اجازت بھی انھوں نے حاصل کی تھی، اور ان کا شغل بھی کرتے تھے، شیخ ابوالفتح صدیقی سے اذکار قلندریہ اور حاجی محمد مداری(۳) سے سلسلۂ مداریہ کے اذکار کی ان کو اجازت تھی۔ صبح کے وقت ایک پہر دن چڑھے تک ان کا حجرہ مقفل

(۱) سید رکن الدین ابوالفتح فیض اللہ سہروردی خلف شمس الدین ابونجیب محمد مخدوم آفتابِ ہند ظفر آبادی کی اولاد میں تھے، ۱۰۵۵ھ میں وفات پائی، مزار موضع سرسانواں ضلع اعظم گڑھ میں ہے (چراغ نور ص ۶۴)۔

(۲) المتوفی ۱۰۴۰ھ کمافی النفحات العنبریہ ۱۲ منہ

(۳) حاجی محمد مداری سلسلۂ مداریہ کے بزرگ اور پابند شرع تھے، سیکرور میں ان کا مزار ہے (مناقب العارفین)۔

رہتا، اس کے بعد نکلتے تو میدان کی طرف چلے جاتے، واپسی پر بہت دیر تک وضو اور مسواک کرتے رہتے، اسی درمیان میں لوگوں سے گفتگو فرماتے، اس کے بعد حجرہ میں جا کر تلاوت یا نماز یا مراقبہ میں مشغول ہو جاتے، دوپہر کے قریب تھوڑی دیر کھٹولے پر آرام کرتے، ظہر کی نماز پڑھ کر مخدوم شاہ طیب کو حجرہ میں بلا کر تعلیم دیتے، اور کبھی خود ان کے حجرہ میں چلے جاتے، اور دو دو تین تین گھنٹے بیٹھتے، اکثر شیخ پورہ میں رہتے تھے، کبھی کبھی خوجہ پورہ میں بھی قیام فرماتے، جھونسی میں بہت زیادہ قیام کرتے، اور ابراہیم پورہ بھی زیادہ جاتے تھے، مسکینوں اور ضعیفوں کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتے، بیواؤں کے کاتے ہوئے سوت منگوا کر ان کو اس کا دام دیتے، اور اس سے خاص اپنے کپڑے بنواتے، یتیموں پر ماں باپ سے زیادہ شفیق اور عاجزوں کے لیے پشت پناہ تھے، حاجت مندوں کی حاجت فوراً پوری کرتے، تمام تر اخلاق نبوی سے آراستہ تھے، سب سے ہنس کر بولتے، اور اکثر مزاح وخوش طبعی بھی کرتے، بچوں کے ساتھ انہی کی جیسی باتیں کرتے، ان کو کھلونے دیتے، جوانوں کے ساتھ ان کے روزگار کی بات چیت کرتے، بوڑھوں کے ساتھ تواضع ونرمی برتتے، اکثر بے دست وپا کمزور اشخاص کو بلا کر اپنی خرچی دیدیتے اور کھانا کھلاتے، ہر طبقہ کے آدمی سے اس کے مناسب حال گفتگو کرتے، کوئی کاشتکار آجاتا تو کھیتی باڑی اور مویشی کا حال دریافت کر کے اسی کے ضمن میں اس کو مسائل زراعت واحکام بیع وسلم وغیرہ بتادیتے، شریعت کا حد درجہ پاس ولحاظ رکھنے کے باوجود کسی سے درشتی نہیں فرماتے تھے، بلکہ نرمی سے منع کرتے، اور باطنی توجہ سے منکروں کے دل سے انکار کو دور کرتے تھے۔

شریعت کی عظمت اور بیعت کی بیخ کنی:

شریعت کا بڑا احترام کرتے تھے، اور سختی سے اس کے پابند تھے، اس دیار میں جو بدعتیں رواج پاگئی تھیں، ان کو یکسر مٹا ڈالا تھا، کہیں ان کا نام ونشان باقی رہنے نہ دیا تھا، مثلاً جلوہ کہ بہت سے ممنوعات پر مشتمل تھا، اور شادی کی بہتیری رسمیں جو ہندوؤں سے مسلمانوں میں آئی تھیں، جیسے چوک وکلس ورلحکہ (رنجک) جن کے ہندوانے نام ہی بتاتے ہیں کہ اہل

کفر کے شعائر میں سے ہیں، ان سب کو برطرف کردیا تھا، نقارہ، ڈھول اور تمام مزامیر جو شادی
اور ولادت اور ختنہ میں بجتے تھے، سب کو منع کردیا تھا، وہ بدعتیں جو ایام مصیبت میں رائج تھیں،
جیسے عورتوں کا چالیس دن تک جمع ہونا اور زمین پر سونا، اور دسویں بیسویں اور چالیسویں کا
کھانا، ان کی بھی بیخ کنی کرڈالی تھی، جلوہ کی حرمت میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا جس کا نام
''قامع الجلوہ محی السنۃ وماحی البدعۃ'' تھا، اس میں تمام رسوم نکاح پر بحث کی تھی۔

علم وفضل:

باوجودیکہ آپ کی تحصیل ''منارالاصول'' سے آگے نہ تھی، مگر تسکین جذبہ کے بعد
چندروز تک اصول وفقہ وحدیث وتفسیر کی کتابوں کا کماحقہ مطالعہ کیا تھا، اس لیے آپ کی نظر
بہت وسیع ہوگئی تھی، حافظہ بہت قوی تھا، اس لیے مضامین ازبر تھے، آپ کے کتب خانہ میں
دوتین سو کتابیں تھیں، سب پر ان کو عبور حاصل تھا، تصنیف کا مشغلہ بھی کچھ کچھ تھا، چالیس
کے قریب رسائل وغیرہ تالیف فرمائے تھے، ظاہر شرع کی رعایت کمال درجہ ملحوظ خاطر تھی،
اس لیے اسرار میں کوئی رسالہ تصنیف نہیں کیا۔

طریق تربیت:

مریدوں کی تربیت اُن کی استعداد کے لحاظ سے فرماتے، اور ان کے حوصلہ کے
اندازہ سے اوراد ووظائف بتاتے، مرید بہت کم کرتے، جب کوئی مرید ہونے کے لیے آتا تو
اس کے احوال کی تفتیش سختی سے فرماتے، کسی کسی کا دو دو تین تین سال تک امتحان کرتے،
مرید ہونے پر ان کی بہت کڑی نگرانی کرتے، اس کی بہت تاکید کرتے تھے کہ ایک جگہ جم کر
کام کرنا چاہئے، ہردری، سرسری نہ ہونا چاہئے۔ فرماتے تھے کہ توحید مطلب کے بدون
خدارسی ممکن نہیں، مخدوم شاہ طیب کا طریق تربیت آپ ہی کے طریق سے ماخوذ تھا۔

آپ کے مریدین:

آپ کے خلفاء میں مخدوم شاہ طیب بنارسی اور شیخ ناصرالدین ہیں، اُن کے علاوہ

حسب ذیل حضرات کو بھی شرف بیعت حاصل تھا:
میاں شیخ عالم، مخدوم شاہ طیب کے چچا، سید عبدالکریم جن کا اصل وطن بارہا
(بارہہ) تھا، اس کے بعد جھونسی میں متوطن ہوگئے تھے، ۱۰۵۴ھ تک زندہ تھے، شیخ مصطفیٰ
کاکوروی ابتدا میں آپ سے پڑھتے تھے، بعد میں مرید ہوگئے، مدتوں آپ کی صحبت میں
رہے، اور اجازت تلقین حاصل کرکے وطن مالوف لوٹے، ان اطراف میں ان سے بہت
فیض پہنچا، مگر جلد ہی سفر آخرت پیش آگیا۔

وصال:

شیخ تاج الدین قدس سرہ کی عمر جب ساٹھ سال کی ہوئی تو اکثر فرماتے تھے کہ اب
میری وفات کا زمانہ بھی قریب آگیا ہے، میں نے خدا سے ہمیشہ درخواست کی ہے کہ میری
عمر تریسٹھ سال سے زیادہ یا کم نہ ہو، تاکہ عمر کے لحاظ سے سرور کائنات ﷺ کی موافقت کے
ساتھ دنیا سے جاؤں، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ نے ۱۰۳۰ھ میں تریسٹھ سال کی عمر میں
وفات پائی، اور آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مخدوم شاہ طیب وشیخ ناصرالدین وغیرہما
نے آپ کو جھونسی میں گنبد کے باہر دفن کیا، آپ نے مرض الموت میں وصیت کی تھی کہ مجھ کو
گنبد کے اندر نہ رکھیں، اس لیے کہ میں ان بزرگوں کی مساوات کے لائق نہیں ہوں،
حضرت مخدوم شاہ طیب سے یہ بھی فرمایا تھا کہ کفن سنت تین کپڑے ہیں: پیرہن، تہ بند اور
چادر اور ہرچند کہ بعض لوگوں نے علماء اور مشائخ کے لیے دستار بھی تجویز کی ہے، لیکن مجھ کو
دستار ہرگز نہ دینا، اور تم بھی دستار قبول نہ کرنا، فقیروں کو دستار نہ دینا چاہئے۔

جانشین:

وصال کے بعد حضرت شاہ طیب نے دو مہینے جھونسی رہ کر شیخ تاج الدین کے حکم کے
مطابق طالبوں کی تربیت اور مریدوں کو تلقین فرمائی، اس کے بعد وہ پیراہن جوان کو شیخ نے
یہ کہہ کر دیا تھا کہ اس کو آپ پہلے پہن کر شیخ ناصرالدین کو پہنا دینا، خود پہن کر شیخ ناصرالدین
کو پہنا دیا، اور ان کو شیخ کا جانشین مطلق قرار دے کر بنارس روانہ ہوگئے۔

مولانا خواجہ کلاں

(المتوفی ۱۰۰۴ھ)

آپ اسد العلماء شیخ نصیر الدین شیخ پوری کے صاحبزادہ تھے، آپ نے صرف ونحو کی اکثر کتابیں اور فقہ واصول کا کچھ حصہ اپنے والد سے پڑھا، اس کے بعد شاہ پور لونیہ میں افضل الوقت قاضی پیارے کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے حاشیہ کافیہ اور کتب معانی وفقہ واصول فقہ کی تحصیل کی، پانچ سال کے بعد گھر آئے، اور چند دنوں کے بعد دوبارہ شاہ پور کا رخ کیا، اور چند برسوں میں کتب متداولہ سے فراغت حاصل کر کے مکان لوٹے، تو اپنے والد کی خدمت میں طریق صوفیہ کے سیر وسلوک میں بدل وجان مصروف ہوئے، ان کے والد نے اولاً ان کو نوافل ووظائف میں اس کے بعد اذکار واشغال میں مشغول فرمایا، اسی طرح بتدریج تربیت فرماتے رہے، تا آنکہ ایک مدت بعد پیران چشت کا خرقہ خاص اور اجازت تلقین وخلافت سے ان کو نوازا، ہر چند کہ مولانا خواجہ کلاں کو بیعت میاں شیخ حبیب اللہ سجادہ نشین حضرت شیخ فرید بنارسی سے تھی، مگر تکمیل ان کے والد ہی نے فرمائی۔

اخلاق وعادات:

مولانا خواجہ کلاں میں تواضع وانکسار حد درجہ تھا، حتی کہ وعظ ونصیحت کا کام بھی دوسروں کو سپرد کر دیا تھا، فرماتے تھے کہ ہمارے ہاتھ سے امر ونہی منکر نہیں ہوتا، ہم اپنے حال میں خود درماندہ ہیں، دوسروں کی دستگیری ہم سے کیا ہوگی، فقراء کی خود خدمت کرتے، اپنا کام کسی سے نہیں لیتے تھے، وضو کا پانی خود لاتے تھے، دوسرے کو حکم نہیں دیتے تھے، اپنے پیروں کی اولاد کا بہت احترام وخدمت کرتے، بلکہ مخدوم زادہ کا فرستادہ بھی آتا تو اس کے لیے کھڑے ہو جاتے، بنارس کا کوئی بھی آدمی پہنچ جاتا تو اس کی تعظیم بجالاتے کہ پیروں کے شہر کا آدمی ہے، مخدوم شاہ طیب فرماتے ہیں کہ میں اگر پاؤں چھونے کے لیے ہاتھ بڑھاتا،

تو میرا ہاتھ پاؤں تک ہرگز پہنچنے نہ دیتے، ایک بار شیخ تاج الدین اور شاہ طیب نے سفر حج کی اجازت مانگی اور اس کے لیے مصر ہوئے تو فرمایا کہ:

”ٹوٹ جھونپڑیا دیکھ کے اب مت کاہے چھاڑے جاہ“

یعنی میری ٹوٹی جھونپڑی دیکھ کر مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ۔

آپ کے صاحبزادگان شیخ پورہ میں رہتے تھے، مگر آپ کا قیام اکثر جھونسی رہتا تھا، کبھی کبھی شیخ پورہ چلے جاتے۔ ۱۰۵۴ھ میں آپ کے سجادہ پر آپ کے لڑکے شیخ اولیا تھے، اس وقت ان کی عمر نوے سال کی تھی، بڑے متقی وصالح تھے۔

مولانا خواجہ کلاں قدس سرہ نے اسی (۸۰) سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور جھونسی میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

شیخ نصیر الدین

(المتوفی ۹۸۰ھ)

آپ کا لقب اسد العلماء تھا، والد کا نام میاں شیخ بڈھ تھا، آٹھ مہینے کے تھے کہ اسی وقت ان کو نانا میاں شیخ نے لے لیا تھا، اور انہی کے زیر سایہ آپ کی پرورش ہوئی، میاں شیخ پرگنہ جھونسی میں موضع سہنجوہ کے رہنے والے تھے، چالیس گاؤں ان کے قبضہ میں تھے، بڑے زمیں دار تھے، اسی کے ساتھ متقی وصالح بھی تھے۔

شیخ نصیر الدین جب قرآن پاک اور فارسی پڑھ چکے، تو میاں شیخ نے ان کو دس سال کی عمر میں حضرت شیخ فرید بنارسی کی خدمت میں پہنچا دیا، آپ نے وہاں صرف کی کتابیں پڑھیں، شیخ فرید نے ان کو اپنے بھتیجے شاہ حسن کے سپرد فرما دیا اور کہا کہ:

باباہو! ایں یار سعادت آثار را حوالۂ شما نمودم،	باباہو! اس سعید یار کو میں نے تمھارے حوالہ
در تربیت وے سعی کما ینبغی خواہید نمود۔	کیا، اس کی تربیت میں کما حقہ کوشش کرنا۔

طالب علمی میں ایک بار خوش ہو کر شیخ فرید نے اُن کو مرید کر لیا تھا، اور اپنی کلاہ اُن کے سر پر رکھ دی تھی۔ ایک مدت تک شیخ نصیر الدین علوی پورہ میں شیخ فرید وشاہ حسن کی

خدمت میں مصروف تحصیل رہے، اس کے بعد جون پور آ کر میاں شیخ چندن محدث کے پاس حدیث پڑھنا شروع کیا، تھوڑے دنوں کے بعد شیخ فرید نے اُن کو بلا بھیجا، اُن کی طلبی پر بنارس گئے، اس دفعہ شیخ فرید نے علوی پورہ آدمی بھیج کر شاہ حسن کو بلایا اور شیخ نصیر الدین کا ہاتھ پکڑ کر ان کو شاہ حسن کے سپرد فرمایا، اور کہا کہ بابا ہو! جو کچھ تم کو اس فقیر سے ملا ہے، اس کو شیخ نصیر الدین سے دریغ نہ رکھنا، سب دے دینا، اس کے بعد شیخ نصیر الدین، شاہ حسن کے ساتھ ان کے حجرہ تک یہ خیال لے کر آئے کہ وہ ان کو اس وقت کچھ عنایت فرمائیں گے، مگر شاہ حسن نے اُن کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ میاں! ابھی تم جا کر تحصیل علم کرو، جو کچھ تمھاری قسمت میں ہے مل کر رہے گا، خاطر جمع رکھو، وقت پر تم کو سب کچھ پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد وہاں سے رخصت ہو کر جون پور آئے، اور چند سال تک تحصیل علم میں مصروف رہے، فراغت کے بعد گھر آئے اور درس دینا شروع کیا، اس وقت ان کا قیام مصطفیٰ آباد عرف ہورے میں تھا، جب شاہ حسن بنارس سے حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو مصطفیٰ آباد میں تین دن قیام فرمایا، وہاں سے چلے تو راستہ میں ایک جگہ ٹھہر کر انھوں نے شیخ نصیر الدین کو اذکار کی تلقین فرمائی، اور تلقین کی اجازت اور اپنی خلافت ان کو عطا کی، اور یہ فرمایا کہ جھونسی میں مکان اور حجرہ بنا کر وہیں مشغول بیاد حق ہونا، مخلوق اس جگہ سے بہرہ مند ہوگی، اس لیے آپ جھونسی میں کچا حجرہ بنوا کر رہنے لگے۔

شیخ نصیر الدین کو میاں شیخ پھول شطاری سے اعمال شطاریہ کی اجازت حاصل تھی، آپ نے ربیع الاول ۹۸۰ھ میں وفات پائی، وفات سے ایک دن پہلے آپ نے مولانا خواجہ کلاں سے فرمایا کہ شرح وقایہ یا کنز حاضر کرو، کہ میں تم کو تجہیز و تکفین کے مسائل سکھا دوں، انھوں نے عرض کیا کہ بندہ تو جانتا ہے، فرمایا: نہیں! لاؤ، وہ کتاب لائے، تو بہت شرح وبسط سے ان مسائل کو بیان کر کے فرمایا کہ اسی طرح کرنا، جھونسی میں آپ کا اور آپ کے صاحبزادہ مولانا خواجہ کلاں کا مزار ایک گنبد میں ہے، باقی قبور گنبد کے باہر ہیں۔

﴿شاہ حسن داؤد بنارسی﴾

(المتوفی سنہ ۹۰۰ھ)

آپ جید عالم تھے، آپ نے صَرف میں ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ''مرغوب الطالبین'' ہے، نحو میں بھی آپ کا ایک رسالہ ہے، آپ نے اکثر کتب متداولہ اپنے چچا شیخ فرید کی خدمت میں پڑھی تھیں، فراغ کے بعد ایک مدت تک مصروف درس وتدریس رہے، بعد میں یہ مشغلہ چھوڑ کر تمام تر تصفیۂ باطن ومجاہدات وریاضات میں لگ گئے، قلعۂ بنارس کے کنارے ایک حجرہ بنا کر تنہا اسی میں رہتے تھے، نماز کے وقت اور بعض دوسرے اوقات میں شیخ فرید کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور ان کی ہدایت کے موافق مشغولی اختیار کرتے تھے، آخر وقت میں علوی پورہ میں بھی ایک حجرہ بنالیا تھا، جس میں سات سال قیام کیا، اسی زمانہ میں آپ پر زیارت حرمین شریفین کا شوق غالب آیا اور حج کے ارادہ سے گھر سے نکل پڑے، خشکی کی راہ طے کرنے کے بعد کشتی میں سوار ہوئے، کچھ دور تو خیریت سے گئے، لیکن اس کے بعد ایک دن فرنگیوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، آپ نے ان کا مقابلہ کیا، اور لڑتے ہوئے دریا میں گر کر راہ حق میں شہید ہوگئے، یہ ۴؍ جمادی الاولیٰ ۹۰۰ھ کا واقعہ ہے، اس وقت آپ کے والد شیخ داؤد اور چچا شیخ فرید دونوں بزرگ بقید حیات تھے۔

شاہ حسن کے کئی صاحبزادے تھے، ان میں ایک شیخ معین الدین جو شاہ طیب کے والد بزرگوار ہیں، دوسرے شیخ مسعود جو پہلے شیخ بڈھ حقانی سے مرید ہوئے تھے، لیکن خرقۂ خلافت دہلی میں شیخ عبدالعزیز[1] جون پوری ثم الدہلوی کے ہاتھ سے پہنا تھا، دہلی سے واپس آ کر انھوں نے اپنے باغ میں ایک حجرہ بنوایا، اور وہیں رہنے لگے، اور وہیں وفات کے بعد مدفون ہوئے۔

---

(۱) المتوفی ۹۷۵ھ کما فی اخبار الاخیار وغیرہ، ۱۲ منہ

﴿شیخ فرید بنارسی﴾

(المتوفی ۹۰۶ھ)

شیخ فرید کے والد شیخ قطب بن خلیل موضع خانقاہ-ضلع غازی پور- میں سکونت پذیر تھے، اُن کی وفات کے بعد شیخ فرید اور ان کے بھائی شیخ داؤد بغرض تحصیل علم بنارس آئے، اُس وقت بنارس میں دو بزرگ مسند ارشاد پر متمکن تھے، ایک شیخ خواجہ مبارک سوندھو جو ابھی بہت زیادہ شہرت پذیر نہ ہوئے تھے، دوسرے بندگی شیخ موسیٰ فردوسی جن کا تمام عوام وخواص میں بڑا چرچا تھا، اس لیے ان دونوں بھائیوں نے بھی انہی کی خانقاہ کا رخ کیا، شیخ موسیٰ بڑی مہربانی سے پیش آئے، اور خود اندر جا کر دو روٹیاں لائے، اور ان بھائیوں کو دے کر فرمایا کہ علوم ظاہری و باطنی سے تمھارا حصہ برادر عزیز خواجہ مبارک کے پاس ہے، اس کے بعد ایک آدمی ساتھ کر کے خواجہ مبارک کے پاس ان کو بھجوا دیا، دونوں بھائی خواجہ مبارک کی خدمت میں رہنے لگے، اور تحصیل علوم ظاہری میں مشغول ہو گئے، فراغت کے بعد خواجہ مبارک نے شیخ فرید کو مرید کیا، اور چشتی طریقہ میں ان کو تعلیم دینا شروع کی، شیخ فرید بڑی محنت ومشقت سے پیر کی ہدایت کے مطابق منازل سلوک طے کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت کا حق بھی بجالاتے، وضو اور غسل کا پانی مہیا کرتے، برسوں کے بعد خواجہ مبارک نے ان کو تلقین کی اجازت دی اور اپنا خرقۂ خاص پہنایا، اور فرمایا کہ تم میرے فرزند اور جانشین ہو، خلافت دینے کے وقت یہ وصیت فرمائی کہ ہر طالب کے ساتھ تواضع سے پیش آنا، فقراء کے ساتھ نیک سلوک کرنا، اور طالب علموں پر مہربان رہنا، اور علم ظاہری کا درس ترک نہ کرنا۔ خلافت پانے کے بعد وہ مرجع خلائق بن گئے، تاہم پیر کی صحبت کبھی ترک نہ کی، اور تازندگی اُن سے جدا نہ ہوئے۔

خواجہ مبارک کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق برابر درس دیتے رہے، اکثر بعد ظہر سبق پڑھاتے، باقی اوقات عبادت وغیرہ میں گذارتے، ابتدا میں بڑی تنگی سے

بسر ہوتی تھی، بعد میں پرگنہ کسوار کے کسی حاکم نے پانچ سو بیگھہ زمین کا پروانہ عطا کیا، اس وقت سے بڑی فراغت سے بسر ہونے لگی، اس کے بعد بادشاہ وقت نے بھی ہزار بیگھہ زمین کا فرمان بھیج دیا، انہی معافیوں سے فقراء خانقاہ، طلبہ اور مہمانوں کا خرچ چلتا تھا، ہر وقت ان کے دستر خوان پر کھانے والے فقراء وطلبہ اور مہمانوں کی تعداد سو کے قریب ہوتی تھی، آپ نے یہ سب معافیاں اپنے بھائی شیخ داؤد کے سپرد کر دی تھیں، وہی ان کا انتظام اور دیکھ بھال کرتے تھے، اور مطبخ وغیرہ کے خرچ کی ذمہ داری ان ہی کے سر تھی۔

وفات:

۹۰۶ھ میں شیخ فرید ایک کام سے چنار گئے ہوئے تھے، وہاں سے کشتی پر واپس آرہے تھے، ملاح کی شرارت اور حاکم چنار کی سازش سے کشتی ڈوب گئی، اور شیخ فرید اپنے بھائی داؤد کے ساتھ غرقاب ہو گئے، اور شہادت کا مرتبہ پایا[1]۔

حضرت شیخ فرید کے خلفاء:

شیخ فرید کے خلفاء کی تعداد بہت ہے ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱:- میاں شیخ حبیب اللہ: آپ کے فرزند اور جانشین تھے، شیخ فرید سب لڑکوں سے زیادہ ان ہی کو چاہتے تھے، یہ بھی ان کی خدمت سے کبھی جدا نہیں ہوتے تھے، علوم ظاہری کی تکمیل نہیں کی تھی، مگر باطنی کمالات سے آراستہ تھے۔

۲:- میران سید بڈھ حسینی: جن کا مزار موضع مسوئین میں ہے، دانشمند متبحر اور بغایت متشرع تھے، شیر شاہ کے زمانہ میں اکثر افغان ان کے مرید تھے، ایک افغان جاہلانہ رسم کے مطابق ہاتھ میں دھاگا باندھے ہوئے حاضر خدمت ہوا، آپ کی نگاہ اس پر پڑی تو آپ نے

(۱) تجلی نور ص ۲۵ حصہ اول میں شیخ وجہ الدین اشرف المعروف بہ شیخ فرید کے عنوان سے آپ کا ذکر ہے، لیکن اخیر میں ان کا جون پور آکر تادم واپسیں مقیم ہونا، اور جون پور کے محلّہ شاہ گنج میں ان کے پختہ مقبرہ کا موجود ہونا بھی مذکور ہے، جو یقیناً غلط ہے، أهل البيت أدرى بما فيه کے اصول پر شاہ یٰسین صاحب کا بیان قابل قبول ہے، اور اس بیان کے صحیح ہونے کے دوسرے قرائن بھی ہیں، صاحب تجلی نور کا ماخذ بحر زخار ہے، بحر زخار میں اس طرح کے اور اوہام بھی ہیں، ۱۲ منہ۔

اُس کو توڑ دیا، اور بہت ڈانٹا بلکہ از سرِ نو نکاح پڑھایا۔

۳:- زبدۃ المحدثین خواجہ مبارک فاروقی: عالم باعمل اور محدث کامل تھے، فقہ واصول میں مہارت رکھتے تھے،......مشارق الانوار کو ابواب فقہ پر ترتیب دے کر اس کا نام مدارج الاخبار رکھا تھا، اکثر شیر شاہ سوری کی صحبت میں رہتے تھے، مگر معمولات میں فرق نہ آنے دیتے تھے، ان کی اولاد بنارس وجون پور میں آباد ہے[1]۔

۴:- میاں شیخ لاڈ: عارف کامل تھے، ہندی اشعار کہتے تھے، اور ان میں اسرار حقیقت بیان کرتے تھے، اپنے پیر کی تعریف میں بھی انھوں نے ہندی اشعار کہے ہیں، جو بنارس اور جون پور میں زبان زد تھے، مزار مڈیاہو کے قریب موضع قاضی پورہ میں ہے۔

---

(۱) یہ بزرگ ملا عزیز اللہ جونپوری کے نانا ہیں، تحفۃ الابرار میں ملائے موصوف نے ان کی تذکرہ میں لکھا ہے کہ شیر شاہ سوری اور اس کے لڑکے کے وزیر تھے، اکابر علماء ان کی صحبت میں رہتے تھے، مثلاً شیخ عبداللہ لاہوری انصاری مخاطب بمخدوم الملک، ملا مبارک، شیخ عبدالجلیل سرہندی وغیرہم، ملائے موصوف نے ان کی تصنیفات میں معدن الاسرار شرح مدارج الاخبار کا بھی ذکر کیا ہے، جس کو انھوں نے ۹۵۲ھ میں اسلام خان سوری کے نام پر لکھا تھا، اس کے علاوہ شرح مشکوٰۃ مسمی بہ ریحانی اور ایک تفسیر اور شرح حدیث نیت وشعب ایمان، اور مبارک الواعظین اور رسالہ مواقیت الصلوٰۃ (تصنیف ۹۶۹ھ) کے نام بھی انھوں نے لکھے ہیں، ۹۸۰ھ میں وفات پائی، اور قلعۂ کور میں مدفون ہوئے، ان کے اجداد رہتک سے بنارس آئے تھے (تحفۃ الابرار قلمی ص ۳۲)۔ تجلی نور ص ۵۵ میں خواجہ ارزانی محدث جون پوری کے عنوان سے آپ کا ذکر ہے، سال وفات ۹۸۱ھ لکھا ہے، اور مدفن قلعہ چنار بتایا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ تحفۃ الابرار کا قلمی نسخہ بہت مشکوک ہے، اس لیے فیصلہ مشکل ہے۔ تجلی نور میں یہ بھی مذکور ہے کہ خواجہ مبارک کے والد کا نام شیخ ارزانی تھا، ان کے آباء واجداد بنارس میں مدفون ہیں، شیخ ارزانی قادری سلسلہ میں شیخ فتح اللہ حقانی کے خلیفہ تھے، بڑے مقبول اور صاحب سلسلہ بزرگ تھے، ۱۰۷۲ھ میں انتقال ہوا، جامع مسجد جون پور کے پاس ان کا پختہ مزار موجود ہے، مگر ملا عزیز اللہ نے ان کا مزار موضع بکھرہ میں بتایا ہے، جو ساحل گنگا سے دکھن ایک کوس کے فاصلہ پر ہے، اور وہی ان کا وطن ومولد بھی ہے (تحفۃ الابرار ص ۳۲)۔

نیز سال وفات بھی غلط ہے، اس لیے کہ ان کے لڑکے کا سال وفات خود صاحب تجلی نور نے ۹۸۱ ہجری لکھا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ لڑکے کی وفات باپ کی وفات سے ایک سو نو برس پہلے ہوئی، جو کسی طرح قابل قبول نہیں، شاید نو کے بجائے دس لکھ دیا ہے، یعنی ۹۷۲ھ میں ان کا وفات پانا قرین قیاس ہے۔

﴿خواجہ مبارک بنارسی﴾

بڑے جید عالم تھے، ابتدا میں درس وتدریس کا مشغلہ تھا، اور اس میں ہم عصروں پر خاص تفوق حاصل تھا، ان کی فضیلت علمی کسی کے آگے جھکنے اور مرید ہونے سے مانع آتی تھی، خود ہی کتب سلوک کا مطالعہ کرتے تھے، اور اس کے مطابق ذکر اور مجاہدے کرتے تھے، بالآخر حضرت خواجہ محمد عیسیٰ کی باطنی کشش نے ان کو جون پور پہنچایا، اور وہ ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، شاید ایک ہفتہ وہ آپ کی صحبت میں رہے ہوں گے کہ حضرت خواجہ نے ان کو خرقہ خاص اور تلقین کی اجازت دے کر بنارس روانہ کیا، جو لوگ مدتوں سے پڑے ہوئے تھے، ان کو خیال ہوا کہ ہم اتنے دنوں سے یہاں ہیں، حضرت مخدوم نے جو التفات ان پر کیا ہم پر نہیں کیا، کہ آتے ہی خرقۂ خلافت عطا فرمایا، حضرت مخدوم نے ان کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ مبارک سادہ تختہ لے کر آئے تھے، میں [نے] اس پر نقش اللہ کھینچ دیا، اور رخصت کیا، تمہارے تختے ماسوا کے نقوش سے سیاہ ہیں، ہر چند ان کو دھوتا ہوں مگر نشان نہیں مٹتا، تمہارے تختے مدتوں میں صاف ہوں گے۔

خواجہ مبارک جب بنارس سے روانہ ہوئے ہیں تو حضرت مخدوم محمد عیسیٰ کو کشف سے معلوم ہوگیا، فرمایا کہ ''سوندھو پاس آوتے ہیں'' جب حاضر خدمت ہوئے تو فرمایا: آؤ اے مبارک سوندھو! اس وقت سے آپ خواجہ مبارک سوندھو مشہور ہوگئے۔

جون پور سے آنے کے بعد خواجہ مبارک نے شرح وقایہ وغیرہ کتب متداولہ کا درس ترک کر دیا اور کلیۃً یادِ حق میں مشغول ہوگئے، لیکن جب کوئی طالب حق آتا، تو پہلے اس کو علوم ضروری تعلیم فرماتے، اس کے بعد طریق تصوف سکھاتے، علم شریعت سیکھنے کی طالبوں کو سخت تاکید فرماتے، آپ نے ساری عمر فقر وفاقہ میں بسر کی، کسی کا نذرانہ قبول نہیں کیا، کوئی مخلص پکا ہوا کھانا لاتا، تو اس کو قبول کر لیتے اور کچھ آپ تناول فرما کر حاضرین کو تقسیم کر دیتے، آپ نے مجردانہ زندگی بسر کی، خود کوئی حجرہ بھی نہیں بنوایا، کسی محبّ نے مٹی پھوس کا ایک جھونپڑا

بنوادیا تھا، مدۃ العمر اسی میں رہے، اور خلوت سے قدم باہر نہیں نکالا، آپ کا حجرہ وہیں تھا جہاں آج مزار ہے، ان کا روضہ[۱] منورہ مرجع خلائق ہے۔

خواجہ مبارک کے خلفاء میں شیخ فرید کا ذکر ہو چکا، دوسرے خلیفہ شیخ سعد اللہ بنارسی تھے[۲]، خواجہ صاحب ان کو بھی بہت چاہتے تھے۔ تیسرے شیخ بڈھ حقانی جون پوری تھے، آپ بڑے عالم تھے، خواجہ محمد عیسیٰ سے عوارف پڑھی تھی، اور آپ ہی نے ان کو حقانی کا لقب عطا کیا تھا، ابتدا میں مرید بھی آپ ہی سے ہوئے تھے، پھر حضرت مخدوم کے حکم کے بموجب خواجہ مبارک کی خدمت میں حاضر ہوئے، خواجہ نے مقامات طے کرائے، اور تکمیل کے بعد خرقۂ خلافت دے کر جون پور روانہ کیا، شیخ بڈھ حقانی کے شاگردوں اور مریدوں کی تعداد بہت ہے، ازانجملہ مخدوم شیخ سالار بڈھ ہیں، جن کا مزار کڑہ (مانک پور) میں ہے۔

شیخ بڈھ حقانی کا مزار جون پور میں ہے[۳]۔

(۱) آپ کا مزار راج گھاٹ (کاشی) اسٹیشن کے قریب گرانڈ ٹرنک روڈ سے دکھن کچھ فاصلہ پر ایک احاطہ میں ہے اور جن لوگوں کا اس پر قبضہ ہے وہ آسانی سے کسی کو وہاں جانے نہیں دیتے، سن وفات معلوم نہیں ہو سکا، مگر مناقب العارفین میں بتصریح مذکور ہے کہ خواجہ مبارک نے اپنی وفات کے بعد شیخ فرید کو اپنا جانشین چھوڑا (ص۹۲) اور شیخ فرید کی وفات ۹۰۶ھ میں ہوئی ہے، اس لیے خواجہ مبارک کی وفات یقیناً نویں صدی کے اواخر میں یا ۹۰۶ھ سے پہلے ہوئی ہے۔

(۲) شیخ سعد اللہ بنارسی حضرت خواجہ مبارک کے بہت قدیم مرید و خادم تھے، شیخ فرید کے آنے سے بہت پہلے وہ خواجہ سے وابستہ ہو چکے تھے، اور خواجہ صاحب کی نظر عنایت ان کے حال پر بہت زیادہ تھی، بنارس میں میر سید صدر جہاں کی مسجد کی مغربی دیوار سے متصل ان کا روضہ ہے (مناقب العارفین ص۹۲)۔

(۳) تجلی نور میں آپ کا ذکر شیخ شمس الحق بڑے حقانی کے عنوان سے ہے، اس میں آپ کو شیخ محمد عیسیٰ کے خلفاء میں شمار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ایک سو تیس سال کی عمر میں ۹۵۰ھ میں انتقال فرمایا، آپ کا پختہ مزار جون پور محلّہ ارزن میں شاہ امید علی کے مکان کے پیچھے دکھن جانب ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ آپ شیخ مبارک بنارسی کے برادر حقیقی تھے، شیخ مبارک سے مراد شیخ مبارک ارزانی المتوفی ۹۸۰ھ تو ہو نہیں سکتے، اس لیے کہ وہ متاخر ہیں، ہاں خواجہ مبارک سوندھو ہو سکتے ہیں، مگر حیرت ہے کہ شاہ یٰسین قدس سرہ نے اس کی طرف قطعاً اشارہ نہیں کیا، بلکہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بڈھ جون پور کے باشندہ ہی تھے، واللہ اعلم ۱۲ منہ۔

مخدوم محمد عیسیٰ تاج قدس سرہ

(المتوفی ۸۷۰ھ)

محمد بن عیسیٰ بن تاج الدین بن بہاء الدین جون پور کے اکابر مشائخ و مشاہیر اولیاء میں ہیں، اور مخدوم محمد عیسیٰ تاج کے نام سے مشہور ہیں، شیخ عبدالحق دہلوی نے آپ کی نسبت لکھا ہے کہ هو ممن يُتَّفق علی ولايته وعظمته وكرامته. شیخ فتح اللہ اودھی کے خلیفۂ راستین اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے شاگرد رشید تھے، یاد حق میں بالکلیہ مستغرق اور دنیا و اہل دنیا سے قطعی بے نیاز تھے، بادشاہ وقت نے نذر دینا چاہی، تو قبول نہ فرمایا اور یہ رباعی پڑھی:

من دلق خود با طلس شاہاں نمیدہم — من فقر خود بملک سلیماں نمیدہم
از رنج فقر دردل گنجے کہ یافتم — ایں رنج رابراحت شاہاں نمیدہم

آپ کے فقر و درویشی کا یہ پایہ تھا کہ گھر میں چراغ بھی نہ جلاتے تھے، استغراق کی کیفیت یہ تھی کہ حجرہ کے دروازہ پر ایک درخت تھا مگر ان کو اس کی خبر نہ تھی، ایک دن ان کی جائے نشست پر کچھ پتیاں پڑی ہوئی تھیں تو پوچھا کہ پتیاں کہاں سے آگئیں؟ اس وقت لوگوں نے بتایا تو ان کو معلوم ہوا کہ یہاں کوئی درخت بھی ہے۔ مخدوم کے دادا اور پردادا بھی اہل اللہ میں سے تھے، ان کے مزارات دہلی میں ہیں۔ آپ اور آپ کے چھوٹے بھائی احمد عیسیٰ لڑکپن میں اپنے والد قاضی عیسیٰ خلیفۂ دوم مخدوم جہانیان کے ساتھ دہلی سے جون پور آئے، قاضی عیسیٰ اور مخدوم صاحب جون پور میں مدفون ہیں، اور احمد عیسیٰ اپنے برادر بزرگ سے خلافت حاصل کر کے بہار چلے گئے، وہاں اپنا فیض جاری کیا، اور وہیں مدفون ہوئے، حضرت مخدوم کی وفات ۸۷۰ھ میں ہوئی، شیخ عبدالحق محدث نے ''اخبار الاخیار'' میں اور شیخ عبدالرحمٰن چشتی نے ''مرآۃ الاسرار'' میں آپ کے حالات لکھے ہیں اور شیخ غلام غوث جون پوری اور شیخ مصطفیٰ جون پوری نے آپ کے حالات میں مستقل رسالے لکھے ہیں۔

مخدوم محمد عیسیٰ کے خلفاء:

خواجہ مبارک سوندھو کے علاوہ حضرت مخدوم کے اور بہت سے خلفاء تھے، از اں جملہ حضرت شیخ بہاء الدین جون پوری المتوفی ۹۴۷ھ ہیں، جن کا تذکرہ ''اخبار الاخیار'' و ''تجلی نور'' وغیرہ میں ہے، مگر ان کتابوں میں حضرت مخدوم سے ان کا صرف مرید ہونا اور تعلیم پانا مذکور ہے، خلافت کی نسبت لکھا ہے کہ سید راجے حامد شاہ مانک پوری سے پائی ہے۔ شیخ بہاء الدین کے خلف وخلیفہ شیخ اڈھن جون پوری ہیں، ان کی وفات ۹۷۰ھ یا ۹۷۶ھ میں ہوئی۔ شیخ بہاء الدین سے جامۂ خلافت حضرت میر سید علی قوام شاہ عاشقان نے بھی پایا، آپ کی وفات ۹۵۰ھ میں ہوئی، سرائے میر میں مزار ہے۔ شیخ بہاء الدین سے میاں سالار بڈھ ساکن کڑہ کو بھی خلافت حاصل ہوئی تھی، جن کی اولاد میں میاں شیخ جمال گیارہویں صدی میں تھے۔

مخدوم کے خلفاء کبار میں آپ کے چھوٹے بھائی احمد عیسیٰ تاج بھی تھے، ان کے خلفاء میں میاں بڑے طبیب ہیں، جن سے میاں مدن منیری کو- جو علماء مشاہیر میں تھے، اور مصباح وکافیہ کے حواشی لکھے تھے- خلافت حاصل تھی، اور ان سے شیخ دولت منیری[1] کو جامۂ خلافت ملا تھا، اور شیخ دولت کو شیخ حافظ سارنی سے بھی نعمت ملی تھی، شیخ دولت بڑے کامل بزرگ تھے، اور ان کی خدمت میں بہت سے لوگ خدا رسیدہ ہوئے۔

مخدوم شیخ درویش قاسم اودھی- المتوفی ۹۰۴ھ- بھی مخدوم محمد عیسیٰ کے خلیفہ تھے، اور ان سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو خلافت ملی تھی۔

مخدوم[2] ملک فتح اللہ بھی مخدوم محمد عیسیٰ کے خلیفہ تھے، ان کا روضہ مقام عشری میں ہے۔

(۱) شیخ دولت منیری کی وفات ۱۰۱۶ھ میں ہوئی، ان کی عمر سو سے زیادہ تھی، ملا عزیز اللہ مداری ان سے منیر میں ملے تھے (تحفۃ الابرار قلمی)۔

(۲) سید قاسم حاجی پوری کے جد کلاں سید ابوالحسن نے ملک فتح اللہ کی خدمت میں ظاہری و باطنی علوم کی تحصیل کی، اور خلافت پائی، صاحب کرامات تھے، ملک فتح اللہ کی دامادی کا شرف بھی ان کو حاصل تھا (مناقب العارفین ص ۱۱۶)

نیز سید زاہد[1] سارنی مخدوم سلیمان مانڈوی -المتوفی ۹۴۴ھ- اور قاضی بدیع الدین ساکن سرائے بدو بھی حضرت مخدوم کے خلیفہ تھے، شیخ قاضی شطاری[2] بھی چشتی طریقہ میں آپ کے خلیفہ تھے۔

شیخ بودھن ساکن[3] موضع اچولی، شیخ حسین ڈھولقابادی- گجرات-، مخدوم شاہ فرید[4] ساکن قصبہ بھتری- ضلع غازی پور-، قاضی ابراہیم ساکن سربرہد (سبرحد) شیخ خیر الدین سارنی، شیخ اختیار الدین سارنی، سید علاء الدین سارنی بھی حضرت مخدوم محمد عیسیٰ کے مرید وخلیفہ تھے، شاہ یٰسین صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت مخدوم کے خلفاء سارن میں بہت تھے۔

....

(۱) نزہۃ الخواطر میں زہید بن بدھا بن حمزہ بن قطب بن عمر بن جلال حسینی زیدی کے عنوان سے ان کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ قرین قیاس یہ ہے کہ زاہد نام ہوگا، اور ان کے لیے شیخ عالم صالح کے اوصاف لکھے ہیں، اور محمد بن علاء المعروف شیخ قاضن شطاری کو ان کا داماد اور شیخ ابوالفتح ہبۃ اللہ کو ان کا نواسہ بتایا ہے ۱۲۔

(۲) المتوفی ۸۹۸ یا ۹۰۲ (کمافی النفحات العنبریہ) اور نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴ میں انصاح کے حوالہ سے سنہ وفات ۸۹۲ھ لکھا ہے، مگر اس میں کچھ سہو ہوگیا ہے، اس لیے کہ انصاح میں سن وفات کا ذکر بالکل نہیں ہے، نیز نزہۃ الخواطر میں ان کو سید زاہد سارنی کا مرید لکھا ہے ۱۲ منہ۔

(۳) سکونت کا پتہ مرآۃ الاسرار میں دیا ہے۔

(۴) حضرت شاہ یٰسین نے لکھا ہے کہ: فرزندان وے الی یومنا ہذا دران مقام مشہور و معزز اند'' ۱۲ منہ

تصحیح واستدراک

بسلسلہ ''پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں''

۱- اس مضمون میں شاہ یٰسین کو میں نے حضرت مخدوم شاہ طیب کا فرزند اس بنیاد پر لکھ دیا تھا کہ تذکرہ کی بعض کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے، مثلاً 'بحر زخار' میں ہے:

''شاہ یسین خلف وخلیفہ شاہ طیب..........مناقب العارفین نام کتاب در احوال اولیا جمع نمودہ''۔

لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے پروردہ ضرور تھے، مگر ان کے بیٹے نہیں تھے، اُن کے والد کا نام شیخ احمد تھا، اور وہ بندگی شیخ اوجھڑ صدیقی جون پوری کی اولاد میں سے تھے، سلسلۂ نسب اس طرح پر ہے:

شاہ یسین بن شیخ احمد بن شیخ محمد بن شیخ عبدالرحیم بن بندگی شیخ اوجھڑ۔

شاہ یسین کا مزار جھوسی میں شیخ نصیر الدین اسد العلماء کے روضہ کے اندر ہے۔ ملاحظہ ہو سمات الاخیار، ص: ۶۸۔

۲- ایک جگہ میں نے شاہ یسین کے کڑہ جانے اور وہاں شیخ جمال اولیا کی خدمت میں ان کی تحصیل علم کا ذکر کیا ہے، یہاں کڑہ کے بجائے کوڑہ صحیح ہے۔ غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ فارسی کی قلمی کتابوں میں کڑہ اور کوڑہ دونوں کو کرّہ لکھا جاتا ہے، مگر پہلے کو کَرَہ پڑھا جاتا ہے اور دوسرے کو کُرَّہ، ابتداء مجھ کو تنبہ نہیں ہوا، اور 'مناقب العارفین' میں لفظ کرہ دیکھ کر اس مضمون میں اس کو کڑہ لکھ دیا، بعد میں تنبہ ہوا کہ جمال اولیا کا وطن تو کوڑہ (جہان آباد) تھا، اور وہی اُن کی جائے اقامت تھی، جیسا کہ تقصار- ذکر میر سید محمد کالپوری- وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے تصحیح کی ضرورت پیش آئی، کوڑہ کو بحر زخار میں اس شکل سے لکھا ہے کُرّہ، ملاحظہ

ہو بحر زخار قلمی نسخہ فرنگی محل ذکر شیخ سالار بدھ کُرّوی۔

۳- اسی طرح میں نے شیخ سالار بڈھ کو ساکن کڑہ لکھا ہے، یا یہ لکھا ہے کہ اُن کا مزار کڑہ (مانک پور) میں ہے۔ وہاں کڑہ کے بجائے کوڑہ (جہان آباد) ہونا چاہئے، بحر زخار میں ہے کہ شیخ سالار بڈھ کی وفات ۹۴۶ھ میں ہوئی، اور کُرّہ (کوڑہ) کے چکلہ میں ان کا مزار ہے، اور مناقب العارفین میں ہے کہ:

''برعوارف شرحے خوب نوشتہ''

۴- 'مناقب العارفین' میں شاہ حسن کے سال وفات کا جہاں ذکر ہے، وہاں تسع مائۃ تو بالکل صاف ہے، اس سے پہلے کے الفاظ مشکوک ہیں، اس لیے میں نے اُن کا سال وفات ۹۰۰ھ لکھ دیا ہے، لیکن شیخ فرید کے حال میں شاہ یٰسین نے لکھا ہے کہ ان کی وفات شاہ حسن کے تھوڑے ہی دن بعد ہوئی ہے، اس لیے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسن کا واقعۂ شہادت بھی ۹۰۶ھ میں پیش آیا، 'مناقب العارفین' میں اس مقام پر بھی کاتب کے تصرف سے عبارت منحرف ہوگئی ہے، ورنہ بات بالکل صاف ہو جاتی۔

تنبیہ:- مولانا سید عبدالحی ناظم ندوہ نے 'نزھۃ الخواطر' جلد چہارم میں غالباً گنج ارشدی کے حوالہ سے اور صاحب 'بحر زخار' نے بھی شاہ حسن کا سال وفات ۹۶۰ھ لکھا ہے، مگر یہ قطعاً غلط ہے؛ اس لیے کہ دونوں بزرگوں نے شیخ فرید کا سال وفات ۹۰۶ھ لکھا ہے، اور شاہ یٰسین نے تصریح کی ہے کہ شاہ حسن کی وفات شیخ فرید کی زندگی میں ہوئی ہے۔

☆......☆......☆

حضرت شیخ الاسلام کی

حیات مبارکہ

کے تین دور اور ان کی خصوصیات

بچشم دیگراں کبیر و بنظر خود حقیر......اپنی اور دوسروں کی نگاہ کا فرق

مشاہیر اسلام میں کسی کو "بدیع الزماں" کے لقب سے پکارا گیا ہے اور کسی کو مورخین "نادرۃ العصر" لکھتے ہیں۔ جن مشاہیر کو ان الفاظ سے یاد کیا گیا ہے ان کے کسی ایک کمال کے لحاظ سے یہ القاب حقیقت پر مبنی ہوں تو ہوں، مگر ان کے تمام اوصاف کے لحاظ سے خالی از مبالغہ نہیں؛ لیکن شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے جملہ اوصاف کے لحاظ سے بدیع الزماں، نادرۃ العصر اور یکتائے روزگار تھے۔ وہ اپنے متنوع علمی کمالات و باطنی مقامات، بے شمار محاسن اعمال اور بے انتہا بلند اخلاق و کردار کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے۔

مولانا کی زندگی کے تین دور ہیں: پہلا دور خاص علمی خدمت کا دور تھا، جو ابتدائے قیام مدینہ منورہ ۱۳۱۷ھ سے شروع ہو کر اسارت مالٹا ۱۳۳۴ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اس سترہ سال کی مدت میں تین بار آپ ہندوستان واپس آئے اور کبھی چند مہینے اور کبھی چند برس رہ کر پھر حجاز تشریف لے گئے ہیں۔ فترات قیام ہند کے استثناء کے بعد کم و بیش تیرہ سال آپ نے مدینہ منورہ میں علم دین کی نشر و اشاعت میں صرف فرمائے ہیں، اسی دور کی یادگار آپ کا فاضلانہ رسالہ "الشہاب الثاقب" ہے، جس میں بریلوی فتنہ کی آپ نے بیخ کنی کی ہے،

اور اسی دور کی یادگار ہماری جماعت کے ممتاز عالم، ادیب اور مفسر مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جنھوں نے مدینہ طیبہ میں مولانا سے تعلیم پائی تھی۔

دوسرا دور مالٹا سے واپسی (۱۳۳۸ھ) کے بعد سے (۱۳۴۶ھ) دار العلوم دیوبند کی صدارت عظمیٰ پر فائز ہونے تک کا ہے۔ یہ زمانہ آپ کی سیاسی گرم جوشی، تحریک خلافت و تحریک آزادی کی علم برداری، فرنگی حکومت سے ٹکر لینے اور اس کے نتیجہ میں قید و بند کا دور ہے، جس میں آپ کی سیاسی بصیرت و تدبر، مجاہدانہ عزم و ہمت اور غیر متزلزل صبر و استقامت کا ظہور ہوا۔

تیسرا دور دار العلوم کی صدارت (۱۳۴۶ھ) سے لے کر وفات تک کا زمانہ ہے، جس میں بیک وقت آپ دنیائے اسلام میں اپنے نوع کی واحد اور سب سے بڑی دینی درس گاہ کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین بھی تھے اور اس مدت کے اکثر حصہ میں ہند، و مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود کی کفیل جماعت جمعیۃ علماء ہند کے صدر و رئیسِ مجلس بھی تھے؛ اور ان تمام تعلیمی، سیاسی و اصلاحی عظیم مہمات کی سرانجام دہی کے ساتھ اس دور میں ہندوستان کے سب سے اونچے عارف باللہ اور شیخ طریقت بھی تھے، جن کے ہاتھ پر لاکھوں بندگانِ خدا نے بیعت کر کے ہدایت پائی اور کتنوں کو معرفت خداوندی نصیب ہوئی۔

ان تین دوروں کے علاوہ آپ کی زندگی کا ایک اہم دور اسارت مالٹا کا زمانہ بھی ہے، جس میں اپنے شفیق استاد و مربی کے ساتھ ان کے والہانہ شفقت، بے مثال وفا شعاری اور کمال عقیدت و خدمت گزاری کے جوہر کھلے۔

مولانا کی زندگی کا یہ ایک نہایت اجمالی خاکہ ہے، اس اجمال کی تفصیل اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے: ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

بہر حال ان ہر چہار ادوار حیات کی تفصیلی داستان سنانے کا حق تو مولانا کے مستقل

سوانح نگار کو ہے، میں اس وقت کچھ اپنے تاثرات اور چند مشاہدات کو ذکر کرکے مولانا کے تذکرہ نویسوں کی صف میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے حضرت مرحوم کی زیارت کا شرف پہلی بار مالٹا سے واپسی کے بعد ۱۳۳۸ھ یا ۱۳۳۹ھ میں اس وقت حاصل ہوا، جب میں دارالعلوم دیوبند میں دورہ کا طالب علم تھا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پرانے مکان میں میرا قیام تھا اور حضرت مرحوم نئے مکان میں قیام پذیر تھے، اس وقت تحریک خلافت شباب پر تھی، اس سلسلہ میں اکثر جلسے ہوتے رہتے تھے، ان جلسوں میں حضرت مرحوم کی تقریریں میں نے سنی ہیں، اس زمانہ میں میں نے دیکھا ہے کہ بسا اوقات ظہر سے پہلے یا ظہر کے بعد اپنے ہاتھ سے اپنے خطوط مدرسہ کے لیٹر بکس میں ڈالنے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ کھدر کا پاجامہ، کھدر کا براؤن رنگ کا کرتہ زیب بدن اور کھدر کی دوپلی ٹوپی- جیسی اس زمانہ میں تمام طلبائے دارالعلوم پہنا کرتے تھے- زیب سر ہوتی تھی۔

طلباء میں اُس وقت اکثر یہ چرچا رہتا تھا کہ حضرت کے پاس عنقریب نسائی شریف کا سبق شروع ہوگا، مگر چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز بعد عصر مدرسہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ مولانا کو گرفتا کرنے کے لیے پولیس آئی ہے۔ اس خبر کا سننا تھا کہ ایک تہلکہ مچ گیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان سے لے کر مفتی صاحب کی مسجد بلکہ مدرسہ تک، راستوں اور گلیوں میں طلباء بھر گئے اور اَڑ گئے کہ ہم گرفتار نہ ہونے دیں گے، معاملہ نہایت نازک صورت اختیار کر گیا اور اتفاق سے اس وقت سوائے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کوئی دوسرا بڑا شخص دیوبند میں موجود نہ تھا، مفتی صاحب مرحوم نہایت خاموش اور سیدھے سادے بزرگ تھے، مگر اس دن معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگوں میں ہر قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک مکان کی چھت پر چڑھ کر طلباء کو صبر وسکون اور پر امن رہنے کی تلقین فرمائی۔ مفتی صاحب کی تقریر سے ہنگامہ کچھ فرو ہوا اور پولیس نے بھی اس وقت واپس چلے جانے میں مصلحت سمجھی، طلبہ جب واپس چلے

گئے، تو رات کے سناٹے میں فوج نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان کا محاصرہ کیا اور اس وقت پولیس حضرت کو گرفتار کرکے لے گئی۔ گرفتاری کے وقت میں بھی محاصرہ میں تھا، مگر ہم لوگ اس وقت بے خبر سو رہے تھے، صبح کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔

اسی گرفتاری کے بعد کراچی کا وہ مشہور مقدمہ پیش آیا، جس میں حضرت مرحوم کی جرأت حق نے انگریزی ایوانِ حکومت میں زلزلہ ڈال دیا تھا۔

اس کے بعد مدتوں حضرت کی زیارت سے محرومی رہی، پھر جب ۱۳۴۶ھ میں آپ دارالعلوم کی مسند صدارت پر رونق افروز ہوئے، تو اس کے بعد سے مرض وفات تک یاد نہیں کتنی بار حضرت کی صحبت میں رہنے اور طویل وقصیر زیارت سے بہرہ ور ہونے اور آپ کی نوازشوں اور شفقتوں سے مالا مال ہونے کا موقع ملا۔

زیارتوں کا یہ سلسلہ بہت طویل اور اس کی مدت تیس سال سے زیادہ ہے، مگر اس پوری مدت میں- باوجودیکہ میرا تعلق بیعت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا اور حضرت مرحوم کو اس کی اطلاع بھی تھی- میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ حضرت مرحوم اپنے اخص خواص تلامذہ ومریدین ومحبین کی نسبت سے کچھ کم اعتماد ومحبت وشفقت اس حقیر پر فرماتے ہیں، میں حضرت کی اس بلندیٔ اخلاق سے بہت زیادہ متاثر تھا اور ہوں۔

مجھ کو حضرت مرحوم کی اس خصوصیت نے بھی بے حد متاثر کیا تھا، کہ آپ اپنے عقیدت مندوں سے ظاہر دارانہ نہیں، بلکہ دل سے محبت فرماتے تھے، اور بہت قوی الاحساس تھے؛ اس لیے اگر کسی عقیدت مند کو کوئی معمولی تکلیف یا کوفت کسی وجہ سے پہنچ جاتی، تو ہر چند کہ اس میں آپ کے ارادہ واختیار کو کوئی دخل نہ ہوتا، جب بھی اس کو بہت محسوس کرتے تھے اور کلمات معذرت لکھ کر اس کی دل دہی ضروری سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ مئو میں مجھے اطلاع ملی کہ حضرت فلاں گاڑی سے بلتھرا روڈ جاتے ہوئے مئو سے گزریں گے، میں اس وقت ملنے کے لیے اسٹیشن گیا، مگر حضرت اس گاڑی سے تشریف نہیں لائے اور زیارت سے محرومی رہی؛ اس کے بعد ہمارے قصبہ کے نیک نفس طبیب حکیم سعد اللہ صاحب

نے ایک دن مجھ سے کہا کہ میں نے اس سال حج کا ارادہ کرلیا ہے، اور میری خواہش ہے کہ مدینہ منورہ میں مدرسۃ العلوم الشرعیہ میں قیام کروں، اس لیے حضرت مولانا کا ایک سفارشی خط وہاں کے لیے حاصل ہو جاتا تو بہت بہتر تھا۔ میں نے حکیم صاحب کی خواہش کی بناء پر حضرت کو ایک عریضہ دیوبند کے پتہ پر لکھا، حضرت نے سفارشی خط تحریر فرما کر بھیج دیا اور اس کے ساتھ احقر کے نام بھی ایک والا نامہ تحریر فرمایا، جس میں اسٹیشن سے میری ناکام واپسی پر اظہار افسوس کے ساتھ جلد ہی تشریف آوری کی بشارت کے ذریعہ دل دہی فرمائی تھی، اس خط کا متن بعینہ یہ ہے:

''محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

مزاج مبارک؟

والا نامہ دیوبند سے واپس ہوکر یہاں ٹانڈہ میں باعث سرفرازی ہوا، مجھ کو بلتھرا روڈ میں معلوم ہوا کہ آں جناب گزشتہ جمعرات ۱۲؍شوال کو خبر پا کر شام گاڑی پر اسٹیشن پر تشریف لائے تھے، اس سے مجھ کو افسوس ہوا، چونکہ شاہ گنج میں اس دن دیرہ ایکسپریس کے لیٹ ہوجانے کی بناء پر آپ کی چھوٹی لائن والی شہنشاہی گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ اس لیے اس گاڑی میں نہیں آسکا تھا۔ شب کی گاڑی میں تقریباً بارہ بجے گزرا، لیکن بدقسمتی سے ملاقات سے محروم رہا، آنے اور جانے کے دونوں وقتوں میں، اگر منظور الٰہی ہے تو قریبی زمانہ میں شرف زیارت حاصل کروں گا۔ حسبِ ارشاد مدینہ منورہ کو عریضہ لکھ دیا ہے، جناب حکیم سعد اللہ صاحب کو دے دیجئے اور ہدایت فرما دیجئے کہ مدینہ منورہ میں موٹر سے اتر کر اسباب مزدوروں کے سر پر رکھوا کر بھائی صاحب کے مکان پر چلے جائیں، کتنا ہی مدینہ منورہ کے معلم یا دوسرے اشخاص روکیں یا دوسری طرف پھیریں تو اس طرف توجہ نہ فرمائیں، بھائی صاحب باب النساء پر بالکل حرم نبوی علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے متصل رہتے ہیں۔ احباب کے لیے کچھ حصص مکانات کے خالی رکھتے ہیں، وہاں چلے جائیں۔ بھائی صاحب انشاء اللہ حسب استطاعت امداد واعانت لازمہ میں کوتاہی نہ فرمائیں گے۔ مکان حرم نبویؐ کے بالکل قریب ہے، صرف سڑک کا فاصلہ ہے۔ حکیم صاحب کی خدمت میں سلام مسنون عرض کردیجئے۔ والسلام

واقفین پرسان حال سے سلام مسنون عرض کردیجئے۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ/ ۱۸؍شوال ۱۳۵۶ھ''

اس مکتوب گرامی کو پڑھ کر میرے دل میں اس کرم وسمو اخلاق کا بھی بڑا خاصہ اثر ہوا کہ باوجودیکہ حکیم صاحب سے مولانا کا کوئی تعلق بلکہ جان پہچان بھی نہیں ہے، مگر حضرت نے صرف خط لکھ کر ٹال نہیں دیا، بلکہ بمقتضائے **الدین نصیحۃ** ان کی راحت وسہولت کے لیے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔

یہ باتیں کسی کی نگاہ میں معمولی ہوں، مگر جس نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور آج اس کی نگاہ اس دنیا میں خود اسلام کے شیدائیوں کے اندر اس کے عملی نمونے دیکھنے کی متمنی ہو، اس کے نزدیک یہ باتیں بہت غیر معمولی ہیں اور حضرت کے واقعات زندگی میں اس کی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں، مگر میں تو اس وقت اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات میں سے ایک آدھ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

میں حضرت کے کمال بے نفسی سے بھی بے حد متاثر تھا علم وعرفان اور صلاح وتقویٰ میں جو اونچے سے اونچا پایہ آپ کا تھا اور شہرت ومقبولیت کا جو بلند ترین مقام آپ کو حاصل تھا، وہ ہر کس وناکس کو معلوم ہے، مگر اس کے باوجود کبھی محسوس نہیں ہوا کہ آپ ذرہ بھر بھی کوئی برتری اپنے اندر محسوس کرتے ہوں۔ اپنے چھوٹے سے چھوٹے شاگردوں تک سے بے تکلفی کی گفتگو، بلکہ بعض اوقات مزاح بھی فرماتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اللہ اکبر یہ بے نفسی!

عہد طالب علمی کے رفقاء کے ساتھ آج بھی اسی بے تکلفی سے ملتے اور بات چیت کرتے تھے، جس طرح طالب علمی میں کرتے ہوں گے۔ حضرت مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت کے بے تکلفانہ برتاؤ کا منظر جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں بار بار دیکھنے میں آیا ہے، آج بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے، اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ حضرت مرحوم سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے کو کچھ نہیں سمجھتے تھے، ورنہ آج تو وہ زمانہ ہے کہ جہاں کسی کو ذرا برتری ہوئی تو وہ اپنے پرانے رفیقوں سے بھی اس رکھ رکھاؤ سے اور اپنے کو اس طرح لیے دیے ملتا ہے کہ جیسے کبھی باہم بے تکلفی تو کیا شناسائی بھی نہیں تھی، بلکہ ہم نے تو ایسے شاگردوں کو بھی دیکھا ہے جو شہرت ومقبولیت کے مقام پر پہنچ کر اپنے غیر مشہور اساتذہ سے تلمذ کی نسبت کے اظہار واعتراف میں بھی پس وپیش کرتے ہیں۔

حضرت کی اسی بے نفسی کا نتیجہ تھا کہ مصافحہ کے وقت جہاں آپ نے محسوس فرمایا کہ ملنے والا ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتا ہے تو بڑے جھٹکے کے ساتھ ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔

مجلس میں آپ کی تشریف آوری کے وقت لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے، تو سخت کراہت ونفرت کا اظہار فرماتے تھے، بلکہ بعض مواقع میں نہایت سختی سے فرمایا کہ کوئی کھڑا ہوگا تو میں ہرگز نہ آؤں گا۔ ایک دفعہ مدنی منزل سے مسجد جانے کے لیے اٹھے اور دروازہ پر پہنچے تو کسی طالب علم نے آگے بڑھ کر ان کواڑوں کو کھول دیا جو دروازہ کے نچلے نصف حصہ میں لگے ہوئے ہیں، حضرت نے بڑی برہمی کے ساتھ فرمایا، کہ تم نے اس کو کیوں کھولا، کیا میرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں؟ بے موقع نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی ذکر کردوں کہ ایک دفعہ بلتھرا روڈ سے واپسی میں شاہ گنج جانے والی ٹرین پکڑنے کے لیے حضرت کو مئو کے اسٹیشن پر سرِ شام سے اڑھائی بجے رات تک رکنا پڑا، مجھ کو کوئی اطلاع نہ تھی، اس لیے حضرت نے آدمی بھیج کر اطلاع کرائی، میں چلنے لگا تو خیال ہوا کہ کچھ ناشتہ اور چائے کا سامان اور چولہا بھی لے چلنا چاہئے۔ اس لیے اپنے لڑکے رشید احمد اور دو طالب علموں کو بھی ساتھ لے لیا، سٹیشن پہنچ کر سلام ومصافحہ کے بعد حضرت کے سامنے میں نے یہ

کہتے ہوئے رشید احمد کو پیش کیا کہ یہ خادم زادہ ہے۔ حضرت نے اس کو بھی مصافحہ کا شرف بخشا، پھر اس کی تعلیم کے بارے میں کچھ سوالات کیے، تھوڑی دیر میں حضرت کے صاحبزادہ میاں اسعد سلمہ اللہ باہر سے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے، تو حضرت نے میری طرف اشارہ کرکے ان کو مصافحہ کرنے کے لیے کہا، جب وہ میری طرف بڑھے تو حضرت نے فرمایا یہ بھی خادم زادہ ہے۔ ان الفاظ کا جو اثر میرے قلب پر ہوا میں اس کو آج تک نہیں بھولا ہوں، یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے تو حضرت سعدیؒ کا یہ شعر بھی ضرور یاد آتا ہے: ؎

بزرگاں نہ کردند بر خود نگاہ — خدا بینی از خویشتن بیں مخواہ

اسی قبیل سے حضرت والا کا اس ظلوم وجہول کو بعض خطوط میں ایسے الفاظ سے یاد کرنا ہے جن کو نقل کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ مولانا کا تصلُّب فی الدین، اتباع سنت اور آپ کی استقامت علی الشریعت بھی اس عہد میں بے مثال تھی۔ ایک بار ہمارے قصبہ کی ایک مسجد میں حضرت نے امامت فرمائی، محراب میں نقش ونگار بنے ہوئے تھے، نقش ونگار ایسے تھے کہ چار پھولوں کے ملنے سے یہ شکل + پیدا ہوتی تھی، حضرت نے اس پر بہت نکیر فرمائی اور امام مسجد سے کہا کہ یہ صلیب ہے اس کو جلد سے جلد نیست ونابود کرائیے۔

جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاسِ سورت میں نئے تعلیم یافتہ چند نوجوانوں نے سٹیج کا -جس پر حضرت اور دوسرے علماء تشریف فرما تھے- فوٹو لینے کی کوشش کی، تو حضرت نے نہایت گرج دار آواز میں ان کو ڈانٹا اور فوٹو نہیں لینے دیا۔

ایک بار اعظم گڑھ میں سدھاری پر ایک دینی جلسہ تھا، اس کی صدارت کے لیے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نامزد تھے، مگر وہ سفر میں چلے گئے تھے اور جلسہ کے دن تک واپس تشریف نہیں لائے تھے، اس لیے منتظمین نے جلسہ شروع ہونے سے پہلے اس ناکارۂ خلائق کو زبردستی صدر بنا دیا۔ جلسہ میں شرکت کے لیے حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد طیب مدظلہ تشریف لا چکے تھے۔ پہلے اجلاس میں حضرت کی تقریر سے قبل اقبال سہیل مرحوم نے اپنی یہ فارسی نظم -جس کی ایک نقل خود سہیل مرحوم کی عطاء کی ہوئی

میرے پاس محفوظ ہے- پڑھ کر سنائی:

زعیم ممتحن آمد، مشیر مؤتمن آمد — امام اہل فن آمد، نظام اہل دیں آمد
بصدق اووطن نازد بہ نطق اوسخن نازد — حدیثش جانفزا آمد بیانش دل نشیں آمد
دریں آشوب زار ہند ذاتش اہل ملت را — مآرب را کفیل آمد معارف را امیں آمد
جناب طیب آں سروروان گلشن قاسم — جمال رشد وتقویٰ یادگار صالحیں آمد
مبارک تشنگانِ جرعۂ علم ومعارف را — بیانش ورغدوبت جوئے شیر وانگبیں آمد
وزاں پس آں حبیب ماادیب ماخطیب ما — کہ ذاتش درمئو احناف را حصن حصیں آمد
زفیض مقدم ایشان حق آگاہاں حق اندیشاں — سدھاری را کلہ گوشہ بہ چرخ چاربیں آمد
سخن کوتہ کن اے اقبال اینک گرچہ میدانم — کہ لطفش اہل معنی را شراب الصالحین آمد

اوراس کے بعد میں نے اُن کلمات تعظیم کے ساتھ جن سے زیادہ کے حضرت مستحق تھے آپ کی تقریر کا اعلان کیا، اقبال صاحب کی مدحیہ نظم اور میرے کلماتِ تعظیم سن کر خاموش رہ جانا مولانا کب گوارا کر سکتے تھے۔ کرسی پر بیٹھنے کے ساتھ خطبہ مسنونہ کے بعد سب سے پہلے منھ پر تعریف کرنے کی خوب خوب مذمت بیان کی اوراس باب میں جو حدیث وارد ہوئی ہے اس کو پڑھ کر سنایا اوراس کی تشریح فرمائی۔

تحریکِ ترکِ موالات کے زمانہ میں ولایتی مال کے استعمال کو حضرت تدیناً ناجائز سمجھتے تھے، اس زمانہ میں بارہا میں نے دیکھا ہے کہ جب امامت کے لیے آگے بڑھے، تو محراب میں بچھے ہوئے مخملی مصلے کو دیکھ کر سخت برافروختہ ہوئے ہیں اوراس کو اٹھا کر پھینک دیا ہے، اور یہ تو ہر خاص وعام کو معلوم ہے کہ ڈاڑھی منڈانے پر کتنی سختی سے انکار کرتے تھے۔

حضرت مرحوم کو دینی غیرت واسلامی حمیت اور دینی تعلیم کی اہمیت کا شدید ترین احساس بھی ہمارے لیے سرمایۂ عبرت تھا، مجھ کو یاد ہے کہ ہمارے قصبہ کے ایک ممتاز عالم نے جب اپنے ایک لڑکے کو حضرت کے سامنے پیش کرتے ہوئے امتحان میں کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی تو حضرت نے پوچھا کیا پڑھتا ہے؟ انھوں نے کہا انگریزی،

حضرت یہ سن کر سخت برافروختہ ہوئے اور بڑی برہمی سے فرمایا کہ اپنے لیے جنت کا راستہ تجویز کیا ہے اورلڑکے کے لیے جہنم کا۔

میری نظر میں یہ نکیر شدید نفس انگریزی تعلیم پر نہیں تھی، بلکہ اس کے عمومی اثرات ونتائج کے پیش نظر خصوصیت کے ساتھ طبقۂ علماء کو متنبہ کرنا تھا کہ وہ کیوں دینی تعلیم پر انگریزی تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں؟ حضرت اقدس کو دینی تعلیم کے ساتھ ایسا شغف تھا اور دینی مدارس کے قیام اوران کی بقاء واستحکام کا ایسا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے کہ دور دراز مقامات کے دینی مدارس کی دعوتیں بھی نہایت خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے اور ریل کے لمبے سفر کے بعد بیس بیس تیس تیس میل کے کچے راستے لاری یا موٹر کے ذریعے طے کر کے ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور کارکنانِ مدرسہ کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، اس کے ماسوا ان کے لیے چندہ کی اپیلیں شائع کراتے تھے اور اہل خیر حضرات کے نام سفارشی خطوط بھی لکھ دیتے تھے۔

کسی مقام پر اگر اپنی جماعت کے دو مدرسے ہوتے اوران میں باہم چشمک ہوتی تو دونوں کے اراکین کو ملانے اوران میں صفائی کرانے کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ امروہہ میں دو مدرسے قائم اور دونوں میں سخت اختلاف کی صورت پیدا ہوگئی تو حضرت نے دونوں کو ایک کر دیا۔ اس واقعہ کا مختصر تذکرہ مکتوبات شیخ الاسلام ص ۷۳ ج ۱ کے حاشیہ میں بھی ہے۔

خود ہمارے قصبہ میں اپنی جماعت کے دو مدرسے تھے اور اب بھی ہیں۔ کسی تیسرے شخص نے حضرت کے گوش گذار کیا کہ دونوں مدرسوں کے اراکین میں کچھ اختلاف رہتا ہے، مصالحت کی کوئی صورت ہو جائے تو بہتر ہے، حضرت کو اس کی فکر دامن گیر ہوگئی۔

۸/ربیع الاول ۱۳۵۳ھ کو حضرت نے اپنے ایک والا نامہ میں اس حقیر کو تحریر فرمایا:

”ممکن ہے کہ اس مہینہ کی آخری تاریخوں میں بہار کا سفر واقع ہو، بوقت واپسی انشاءاللہ مئو آنے کا ارادہ کروں گا۔“

اس کے بعد ۲۲ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ کو دوسرے والا نامہ میں یہ تحریر فرمایا کہ:

''اگر منظور خدا ہے تو بروز شنبہ ۹ رجولائی کو شبلی منزل اعظم گڑھ پہنچوں گا اور وہاں ایک دن قیام کر کے مئو حاضر ہوں گا۔ تمام دن منگل وہاں قیام کروں گا۔ دارالعلوم میں ٹھہروں گا۔ میں صرف آپ حضرات کی قدم بوسی کے لیے حاضر نہیں ہو رہا ہوں، بلکہ امیدوار ہوں کہ آپس کے اتحاد میں آپ حضرات میری امداد واعانت فرما کر مجھ کو ہمیشہ کے لیے شکر گذار بنائیں گے۔ جناب والد صاحب اور دیگر اراکین و مدرسین کرام کی خدمت میں بعد از سلام مسنون میری اس عرض کو پہنچا دیں۔ والسلام''

اس اطلاع کے مطابق ۹ رجولائی کو حضرت اعظم گڑھ اور ۱۰ ر کو مولانا مسعود علی ندوی کی معیت میں مئو تشریف لائے اور مصالحت کرانے کے لیے کوئی امکانی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن افسوس کہ مصالحت نہ ہو سکی۔ تفصیلات کے ذکر کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے، مولانا مسعود علی صاحب ماشاء اللہ بقید حیات ہیں اور ان کو تفصیلات کا پورا علم ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے کہ اس سفر کے تمام مصارف خود حضرت نے برداشت کیے اور مئو کے عقیدت مندوں نے ادا کرنے چاہے تو قبول نہیں فرمائے۔

اسی طرح پورۂ معروف میں تشریف آوری کے موقع پر وہاں کے دو مدرسوں کے باہمی اختلاف کو بھی رفع فرمانے کی پوری جدوجہد فرمائی۔

کیا اچھا ہوتا کہ ہم نرے اظہار عقیدت کے بجائے آپ کی زندگی کے جو محبوب مشاغل تھے، ان میں اپنے آپ کو مشغول کرتے اور آپ کی خواہشوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر سچی عقیدت واخلاص مندی کا ثبوت بہم پہنچاتے۔

حضرت اقدس کو درس حدیث سے جو عشق وشغف تھا وہ بھی عقیدت مندوں کے لیے درس عبرت ہے۔ دن کے مختلف اوقات میں اور رات کے بارہ بجے تک اس جانفشانی کے ساتھ حدیث کا جو درس دیتے تھے، وہ محض اپنے منصب کے وظیفہ کی انجام دہی نہیں تھی،

بلکہ آپ اس کو روحانی ترقی، سرکار رسالت مآب ﷺ کی روح مقدسہ سے حصول فیض اور وصول وقرب کا بہت بڑا ذریعہ اور سلوک کے طریق میں سے ایک عظیم الشان طریقہ سمجھتے تھے، مجھ کو اس پر اس وقت تنبہ ہوا جب تدریس کے مشغلہ سے علیحدگی اختیار کیے مجھ کو کئی برس ہو گئے، اور کسی صاحب نے اپنے مدرسہ میں مجھ کو بلانے کے لیے حضرت کو واسطہ بنایا تو حضرت نے تنہائی میں مجھے بلا کر دیر تک سمجھایا، جب میں نے اعذار پیش کیے، تو آخر میں حضرت نے فرمایا کہ بہر حال درس حدیث کا مشغلہ کچھ نہ کچھ ضرور رکھو، یہ حصول وفیوض باطنیہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اس کے بعد یہ واقعہ سنایا کہ مدینہ منورہ میں ایک مولانا محمد اسحاق صاحب مہاجر تھے، وہ مسجد نبوی ؐ میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے، ان کو درس حدیث سے ایسا عشق تھا کہ عمر کے آخری حصہ میں جب وہ بالکل معذور ہو گئے تھے جب بھی انھوں نے اس سلسلہ کو بند کرنا گوارا نہیں کیا، حالت یہ تھی کہ چلنے کی قوت بالکل نہ تھی، مگر فرماتے تھے کہ دو آدمی مجھ کو اٹھا کر مسجد میں پہنچا دیں، دو آدمی ان کو اٹھا کر مسجد نبوی ؐ میں لے جا کر بٹھا دیتے تھے اور وہ درس حدیث دیا کرتے تھے۔ غالبًا حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جس دن ان کی وفات ہوئی ہے اس دن بھی انھوں نے ناغہ نہیں کیا۔

یہ واقعہ سننے کے بعد معاً میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ درس حدیث کے سلسلہ میں حضرت اقدس کا حال بھی اسی کے مشابہ ہے اور درس کی حالت میں فیضان انوار وحصول کیفیات ہی کی بناء پر نہ جی اکتاتا ہے، نہ تکان محسوس ہوتی ہے، نیز اسی کے ساتھ مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کی اس لطیف ونفیس بات کی طرف بھی ذہن منتقل ہوا، جو آپ نے حضرت حاجی محمد افضل قدس سرہٗ سے اپنے استفادہ کے باب میں ارشاد فرمائی ہے، جس کو مدت ہوئی میں نے مقامات مظہری میں پڑھا تھا، حضرت مرزا کے ارشاد سے حضرت کے بیان کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے سنیے! حضرت مرزا صاحب فرماتے ہیں:

''اگر چہ ازاں حضرت (حاجی محمد افضل) در ظاہر استفادہ نہ کردہ شد لیکن در ضمن سبق حدیث فیوض از باطن شریف ایشاں فائض می شد و در غرض نسبت قوت بہم

می رسید۔

ایشاں را در ذکر حدیث درنسبت رسول خدا ﷺ استغراقے دست میداد وانوار وبرکات بسیار ظاہر می شد گویا درمعنی صحبت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حاصل می شد ودریں اثنا توجہ والتفاف نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مشہود می گشت ونسبت کمالات نبوت درغایت وسعت وکثرت انوار جلوہ گرمی گردید"(۱)۔

میری ظاہر بیں نگاہ حضرت مرحوم کے اسی طرح کے کمالات کا مشاہدہ کرسکتی تھی، جن میں سے بعض کا ذکر کرکے میں نے ان کی بارگاہ میں نذر عقیدت پیش کی ہے، لیکن اس نذرعقیدت کے پیش کرنے میں میں نے صرف اظہار حقیقت سے کام لیا ہے۔

حضرت کے باطنی مراتب کا سمجھنا اہل باطن کا کام ہے، میں اس کوچہ سے نابلد ہوں، مجھے اس کا ادراک کیوں کر نصیب ہوسکتا ہے؟ اتنا ضرور ہے:

أُحِبُّ الصَّالحينَ ولستُ منهم
لعلَّ اللهَ يرزُقُني صلاحا

خدا توفیق دے کہ ہم میں اس کے سمجھنے کی بھی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

حرف آخر اور تاریخ وفات

اب صرف ایک بات عرض کرکے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں، آج فجر کی نماز کے بعد تلاوت کررہا تھا، جب ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ پر پہنچا، تو یک بیک دل میں آیا کہ شاید ﴿فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ سے سال وفات کے اعداد برآمد ہوں، اس خیال کے آتے ہی رکا اور رک کر حروف کے اعداد پر غور کیا تو ٹھیک ۱۳۷۷ھ برآمد ہوئے۔

فالحمد لله على ذلك.

☆......☆......☆

---

(۱) مقامات مظہری: ۲۵

امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ

امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے پہلی بار ڈھائی کنگرہ کی مسجد - بنارس - میں دیکھا تھا، جہاں مسلمانان بنارس کی دعوت پر ایک جلسہ عام میں تقریر کرنے کے لیے مولانا تشریف لائے تھے۔ میں اس زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا عبدالغفار مئوی کے پاس مدرسہ مظہر العلوم کچی باغ میں حماسہ وملاحسن وغیرہ پڑھ رہا تھا، میں اس جلسۂ عام میں اپنے استاد کے خادم کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، اور اسی حیثیت سے امام اہل سنت کے ساتھ سلام ومصافحہ اور ان دونوں بزرگوں کی گفتگو سننے کا شرف مجھے حاصل ہوا تھا۔

عادت مستمرہ کے مطابق روافض کے رد اور صحابہ کے دفاع میں امام اہل سنت کی بہت زوردار تقریر ہوئی تھی، دوسرے دن امام اہل سنت بازدید کے لیے ہمارے استاد کی درس گاہ میں تشریف لائے تھے، اور دونوں حضرات کے مابین بہت دیر تک علمی گفتگو ہوئی تھی۔

مظہر العلوم پر اس وقت تک بریلویت کی چھاپ تھی، اس لیے ارباب اہتمام نے نہ امام اہل سنت کو مدرسہ میں آنے کی دعوت دی تھی، نہ کوئی ملنے آیا تھا، شاید کسی کو خبر بھی نہ ہوئی ہوگی۔

اس کے بعد پانچ چھ سال تک امام اہل سنت کو دیکھنے یا ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ۱۳۴۱ھ میں جب اس سال کے فضلاء دارالعلوم مئو کی دستار بندی کے لیے ایک شاندار جلسۂ عام کرنے کی رائے ہوئی، تو میں نے اصرار کرکے امام اہل سنت کا نام علماء کی اس فہرست میں شامل کرایا جن کو جلسہ میں مدعو کرنا تھا، اور جب یہ کہا گیا کہ مولانا صرف خط

وکتابت سے تو آنے کے لیے آمادہ نہ ہوں گے، تو میں نے عرض کیا کہ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر دعوت نامہ پیش کروں گا، اور ان شاء اللہ وہ بطیبِ خاطر اس دعوت کو قبول فرمائیں گے۔

اس بنا پر میں نے امروہہ کا سفر کیا، اس وقت مولانا جامع مسجد امروہہ میں مدرس تھے، میں جس وقت وہاں پہنچا ہوں مولانا اپنے صاحبزادہ مولوی عبدالسلام مرحوم کو قطبی تصدیقات پڑھا رہے تھے، سبق سے فارغ ہونے کے بعد مولانا میری طرف متوجہ ہوئے، میں نے اپنا تعارف کرایا اور حاضری کا مقصد ظاہر کیا، مولانا نے تھوڑے تامل کے بعد میری دعوت منظور فرمالی۔

ابھی جلسہ میں کئی دن باقی تھے، اس لیے میں تنہا مئو واپس چلا آیا، امام اہل سنت جلسہ کی مقررہ تاریخوں میں حسب وعدہ مئو تشریف لائے، غالباً دو دن آپ نے مدرسہ میں قیام فرمایا، نماز کی اہمیت پر آپ کا عالمانہ وعظ بہت پسند کیا گیا اور وہ بہت مؤثر ثابت ہوا، اس جلسہ میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری اور مولانا نثار احمد کانپوری بھی تشریف لائے تھے، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے مولانا احمد حسن کانپوری سے کچھ پڑھا تھا، اس لیے مولانا نثار احمد ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

مولانا نثار احمد جب جلسہ سے فارغ ہو کر واپس جانے لگے، تو مولانا سے رخصت ہونے کے لیے اپنے علم کے مطابق ان کے کمرہ میں گئے، کمرہ میں ایک صاحب لیٹے ہوئے تھے، پورا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا، مولانا نثار احمد نے یہ سمجھ کر کہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب سو رہے ہیں پیر دبانا شروع کیا، لیٹنے والے صاحب جاگ گئے، اور منھ سے چادر ہٹائی تو معلوم ہوا کہ وہ امام اہل سنت ہیں، مولانا نثار احمد بہت خفیف ہوئے اور فرمایا کہ میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا، امام اہل سنت نے فرمایا وہ بازو والے کمرہ میں ہیں۔

اس کے بعد مولانا کے ساتھ وابستگی وشیفتگی اور نہایت گہرے تعلقات کی ایک طویل

تاریخ ہے، جس کو بہت سمیٹ کر بھی لکھا جائے تو کئی سو صفحات درکار ہوں گے۔

یاد نہیں کتنے جلسوں میں میری دعوت پر امام اہل سنت نے شرکت فرمائی اور کتنے جلسوں میں ان کی خواہش پر میں نے ان کی معیت میں شرکت کی، اور اس طرح ان کی علمی مجلسوں اور روحانی صحبتوں میں شریک اور ان سے بہرہ یاب ہونے کے بے شمار مواقع حاصل ہوتے رہے، بالخصوص نگی گھاٹ بنارس کی مسجد کے کیس میں شہادت دینے کے لیے جب مولانا نے بنارس میں ہفتوں قیام کیا تھا، اور مجھے حکم دیا تھا کہ مدرسہ سے غیر معینہ مدت کے لیے رخصت لے کر شب و روز مولانا کی قیام گاہ پر حاضر رہوں، اور شہادت کے لیے تیاری میں ان کی مساعدت کروں، نیز موافق ومخالف کتابوں سے حوالہ جات کا نوٹ تیار کروں، اور کتابوں میں نشانات لگاؤں۔ اس موقع پر امام اہل سنت نے اس ناچیز کے علم وفہم وبصیرت واستحضار اور حسن تدبیر پر جس قدر خوشی اور اعتماد واطمینان کا اظہار فرمایا اور استحسان وشکر وثنا کے بلند کلمات سے مجھ کو نوازا، میں اس کے لیے ان کا ممنون احسان ہوں۔

اس کیس میں شہادت دینے کے لیے ملک العلماء فاضل بہار مولانا ظفر الدین بہاری تلمیذ رشید مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی بھی بلائے گئے تھے، امام اہل سنت نے اس زیرکی وحسن سیاست پر بڑی دعائیں دی اور مختلف مجلسوں میں سراہتے ہوئے بہت حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے، جب کیس کی تاریخ سے ایک دن پہلے میں نے مولانا ظفر الدین صاحب سے کہا کہ مولانا! مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ شہادت میں آپ پیش ہوں، اس لیے کہ امام اہل سنت شہادت کے لیے کھڑے ہوں گے تو شیعہ وکیل فوراً یہ جرح کرے گا کہ یہ سنیوں کے نمائندہ اور سنی نہیں ہیں، ان کے خلاف تو سنی حنفی جماعت کے پیشوا مولانا احمد رضا خاں صاحب نے کفر کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔ مولانا ظفر الدین یہ سن کر گھبرا گئے، فرمایا: نہیں مولانا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میری کیا ہستی ہے؟ رد روافض میں مولانا امام ہیں، شہادت انھیں کی ہوگی، اور اگر اعلیٰ حضرت کا فتویٰ فریق مخالف پیش کرے گا، تو اس کا جواب دوں گا، کہ میں اعلیٰ حضرت کا ارشد ترین شاگرد ہوں، مجھ سے زیادہ اعلیٰ حضرت کے

فتاویٰ کے بارے میں کون جا سکتا ہے، اعلیٰ حضرت نے یہ فتویٰ نہیں دیا ہے۔

امام اہل سنت میری اور مولانا ظفر الدین صاحب کی یہ گفتگو سن کر بے انتہا مسرور ہوئے۔ ہمارے مولانا خوشی خوشی شہادت کے لیے کھڑے ہوئے اور مولانا ظفر الدین صاحب نے بھی جب جب موقع آیا اپنا وعدہ پورا کیا۔

شہادت کا سلسلہ کئی دن جاری رہا، تا آنکہ جمعہ کا دن آ گیا اور اس دن بھی مقدمہ زیر سماعت رہا اور ہم لوگوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ کچہری کے پاس والی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کریں، لیکن جمعہ کی امامت بھی ہم میں ہی سے کسی کو کرنا تھی، چونکہ بریلوی حضرات کی نماز ہمارے پیچھے نہیں ہوتی، اس لیے میں نے امام اہل سنت سے اجازت لے کر مولانا ظفر الدین صاحب سے کہا کہ مولانا! نماز آپ پڑھائیں گے، ہم آپ کے پیچھے بے تکلف پڑھ لیں گے، اس پر مولانا ظفر الدین صاحب نے فرمایا کہ جی نہیں، مولانا کی موجودگی میں میں ہرگز نہیں پڑھا سکتا، مولانا احق ہیں، وہ امامت فرمائیں، میں ان کے پیچھے پڑھوں گا۔ مولانا بہاری نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی کیا، کھلے دل سے اعتراف احقیت کر کے ہمارے ساتھ امام اہل سنت کے پیچھے نماز جمعہ ادا کی، اور برابر قیام وطعام اور عدالت میں ایک ساتھ آنے جانے اور مشورہ میں بلا کسی انقباض کے شریک رہے، حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

امام اہل سنت نے اس موقع پر بھی بے انتہا خوشی کا اظہار فرمایا اور خوب خوب حوصلہ افزائی فرمائی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مسلسل ہفتوں تک امام اہل سنت کے شب و روز کو دیکھنے، ان کے علم وعمل کو پرکھنے، اور فی الجملہ اس طویل رفاقت وصحبت میں ان کے ہدی، ودلّ، وسمت کا مشاہدہ کرنے، رفیق سفر، شریک مجلس اور صحبت میں رہنے کے ساتھ ان کے بلند اخلاق اور عالمانہ برتاؤ کا جائزہ لینے اور ان کی دلنشیں مجلسی باتیں، اور علمی گفتگو سننے کی نوبت آئی، جس کا تاثر نقش آج تک دل پر قائم ہے۔

مولانا کو پہلی ہی دفعہ عمامہ وعبا میں ملبوس جس عالمانہ سج دھج کے ساتھ اور جس پُرکشش اور باوقار ہیئت میں دیکھا تھا، اسی شان سے آخر دم تک دیکھا۔

اس صحبت کے بعد ایک اور سفر کی رفاقت نصیب ہوئی، جب مولانا نے ضلع گونڈہ کے ایک موضع کونڑ و بونڑ پہار کے ایک جلسہ میں جہاں غیر مقلدین نے احناف کو تنگ کر رکھا تھا، خط کے بعد (غالبًا) تار دے کر اس ناچیز کو مدعو کیا، اس موقع پر بھی کئی دن رفاقت وصحبت میں بسر ہوئے، اس جلسہ میں مولانا حفظ الرحمٰن بھی مدعو تھے، جو ابھی ابھی پڑھ کر فارغ ہوئے تھے اور ان کی شہرت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

پھر جب امام اہل سنت نے دار المبلغین کی بنیاد ڈالی تو کام کی ابتداء اور بنیاد کو مستحکم کرنے کے لیے سب سے پہلے اس ناچیز کو منتخب کیا، ناچیز نے اس مقصد کے لیے کم وبیش دو ماہ دار المبلغین میں قیام کیا، اور اس بہانے سے پھر مولانا کی صحبت اور قرب سے نفع اٹھانے کا اچھا خاصہ موقع ملا۔

اور اس سے بھی زیادہ طویل مدت امام اہل سنت کو مسجد ومدرسہ اور خانقاہ میں نزدیک سے دیکھنے کی وہ تھی جب میں اسمبلی کی ممبری کے زمانہ میں دار الشفاء کے بجائے دار المبلغین میں قیام کیا کرتا تھا، اور جس بڑے کمرہ میں مولانا عبد السلام مرحوم اور قاری محمد صدیق مرحوم طلبائے دار المبلغین کو درس دیا کرتے تھے، اسی کے ایک گوشہ میں یا کمرہ کوٹھری میں تصنیف وتالیف یا مطالعہ میں مصروف رہا کرتا تھا، جمعہ وجماعت میں حاضری بالالتزام مولانا کے ساتھ ہوتی تھی، چک منڈی جمعہ پڑھنے کے لیے تشریف لے جاتے تھے تو احقر کو ساتھ لے جاتے تھے۔ الٰہ آباد، جون پور وغیرہ کے سالانہ جلسوں میں شرف ہم رکابی نہیں تو قیام گاہ اور جلسہ گاہ میں شرف ہم نشینی معلوم نہیں کتنی بار حاصل ہوا۔

یہ داستان بہت طویل ہے اور اس کو سنانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں نے امام اہل سنت کو سالہائے دراز تک ہزاروں مجلسوں میں، سیکڑوں جلسوں میں، سفر میں بھی حضر میں بھی اور اپنے گھر پر بھی اور ان کے گھر میں بھی، درس دیتے ہوئے، وعظ فرماتے ہوئے

بھی، اور نماز پڑھتے ہوئے بھی، سوتے ہوئے بھی، جاگتے ہوئے بھی، ریل میں بھی اور پانی کے جہاز میں بھی، ہندوستان میں بھی اور مکہ ومدینہ اور عرفات ومنی میں بھی، مولانا اَسباط صاحب کو سبق پڑھاتے ہوئے، عبدالغنی کو کھلاتے ہوئے، مولانا عبدالرحیم کو ڈانٹتے ہوئے، ہر رنگ اور ہر حال میں بہت ہی نزدیک سے دیکھا، اور ہزاروں صحابہ، تابعین وائمہ دین اور علماء ومشائخ صوفیہ، اور فقہاء ومحدثین کے تذکرے اور حالات خوب پڑھ کر اور وسیع مطالعہ کر کے امام اہل سنت کی کتاب زندگی کا مطالعہ اپنی آنکھوں سے پوری بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ امام اہل سنت مرد باصفا وحق آگاہ، ہم رنگ کاملین اہل اللہ، عالم باعمل کے صحیح مصداق، علوم آلیہ وعالیہ میں فرد وطاق، صاحب بصیرۃ فقیہ اور نکتہ رس مفسر، تحفظ ناموس صحابہ کے واحد پرجوش حامی، ردشیعیت واِحقاق حق میں اس عہد کے ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز، معارف صوفیہ حقہ سے کامل بہرہ ور، مکتوبات امام ربانی کے حافظ، نماز کے عاشق، سنت کے شیدائی، دنیا سے بے رغبت اور حطام دنیا سے متنفر اور مختصر یہ کہ وہ اس دور کے ربانی عالم تھے۔

☆......☆......☆

مولانا عبداللطیف نعمانی کے سوانح حیات کا ایک باب

مولانا عبداللطیف نعمانی مجھ سے عمر میں تقریباً ایک سال چھوٹے تھے، وہ روزانہ امام گنج سے دو میل پیدل چل کر پڑھنے کے لیے مئو آتے تھے، اسی زمانہ میں میری جان پہچان اور دوستانہ تعلقات شروع ہوئے، زیادہ ربط ضبط دیوبند جانے کے بعد پیدا ہوا۔

۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحی مرحوم[۱]، مولوی فاروق[۲]، مولوی عبداللطیف اور میں نے ملّا کا امتحان دینے کے لیے اس کا کورس پڑھنا شروع کیا، مگر چند ہی دنوں میں ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی[۳] کے ساتھ

(۱) مولوی عبدالحیؒ مئو کے باشندہ اور حضرت محدث الاعظمیؒ کے ہم سبق تھے، مختلف مقامات پر تحصیل علم کے بعد دارالعلوم مئو میں مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی کے پاس صحاح ستہ پڑھ کر ۱۳۴۱=۱۹۲۳ء میں فارغ التحصیل ہوئے، ۱۳۴۳=۱۹۲۵ء میں مدرسہ معروفیہ-پورۂ معروف- میں صدر مدرس مقرر ہوگئے، ۱۳۵۶ھ میں پورۂ معروف ہی میں مدرسہ اشاعت العلوم قائم ہوا، تو اس سے وابستہ ہوگئے، اس کے ۷/سال کے بعد ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ=۱۹۴۴ء میں آپ کی وفات ہوگئی۔

(۲) مولوی محمد فاروق بن عصمت اللہ ۱۳۱۸ھ میں پیدا ہوئے، آپ نے بھی مئو اور مئو کے علاوہ مختلف مقامات پر علم کی تحصیل کی، اور ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم مئو سے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی سے پڑھ کر فارغ ہوئے، فراغت کے بعد چند مہینے درس وتدریس کا مشغلہ رکھا، پھر اس کو ترک کر کے لکھنؤ سے تکمیل طب کا کورس کیا، اور مدۃ العمر پیشۂ طبابت سے وابستہ رہے، اگست ۱۹۸۳ء میں وفات پائی، حضرت محدث الاعظمیؒ کے ہم سبق اور محبین ومخلصین میں تھے۔

(۳) مولانا عبدالغفار بن شیخ عبداللہ عراقی مئوی ۲/صفر ۱۲۸۳ھ = ۱۸۶۶ء میں مئو شہر کے محلّہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ مئو، بلیا اور مرزا پور میں اس وقت کے اہل علم وکمال اور فاضل اساتذہ کی خدمت میں زانوئے تلمذتہ کر کے ۱۳۰۴ھ=۱۸۸۶ء میں فارغ التحصیل ہوئے، بعدازاں ایک سال گنگوہ میں رہ کر امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد=

گورکھپور چلا گیا، اور اپنے مناسب حال درس نظامی کی کتابوں میں شریک ہوگیا۔

۲۷/جنوری ۱۹۱۷ء کو مولوی فاروق نے مجھے گورکھپور کے پتہ پر لکھا کہ:

''ہم لوگ اس وقت بی، اے کورس پڑھ رہے ہیں، کافیہ، شافیہ ختم ہوگئی ہے، ہم لوگوں کا امتحان یکم مارچ ۱۹۱۷ء بروز جمعہ شروع ہوگا، خدا سے دعاء کیجئے کہ ہم لوگ ملاّ کے امتحان میں کامیاب ہوجائیں''۔

مولانا نعمانی دارالعلوم دیوبند میں:

مولوی عبداللطیف مرحوم نے بھی مولوی فاروق کے ساتھ ۱۹۱۷ء میں ملاّ کا امتحان دیا، میں نے اس سال ملاّ کا کورس نہیں پڑھا، لیکن جب گورکھپور سے (غالبًا) ۱۹۱۷ء کے اواخر میں مولانا عبدالغفار صاحب بنارس منتقل ہوگئے تو میں بھی ان کی خدمت میں پہنچا، اور مدرسہ مظہرالعلوم سے ۱۹۱۸ء میں ملاّ کا، اور مارچ ۱۹۱۹ء میں ملا فاضل کا امتحان دیا۔

شوال ۱۳۳۷ھ غالبًا جولائی ۱۹۱۹ء میں، میں نے دارالعلوم دیوبند میں پہلی دفعہ داخلہ لیا، اسی سال مولوی عبداللطیف بھی دیوبند گئے تھے، مگر وہ میرے بعد پہنچے تھے، ان کا داخلہ ہوگیا تھا، اسباق ہورہے تھے کہ مدرسہ میں فصلی بیماری پھوٹ پڑی، اور مولوی عبداللطیف اور ان کے رفقاء مولوی عبدالحی و مولوی فاروق تینوں زد میں آگئے، مجبوراً تینوں کو گھر واپس ہونا پڑا، مولوی عبدالحی مرحوم نے ۱۰/محرم ۱۳۳۸ھ کو مجھے مئو سے خط لکھا:

''۱۰/محرم دوشنبہ کی شب کو ہم لوگ بخیریت تمام مئو پہنچ گئے......مرادآباد میں مولوی فاروق کو بخار اور لرزہ آگیا تھا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد جاتا رہا، مولوی عبداللطیف کو بھی اکثر اوقات بخار اور دردسر رہا، لیکن بفضلہ لرزہ وغیرہ سے محفوظ رہے اور خیریت کے ساتھ مکان پہنچ گئے۔ شاہ گنج سے گاڑی چھوٹنے کے بعد ہم

=گنگوہی سے صحاح ستہ پڑھ کر حدیث شریف کی سند واجازت سے سرفراز ہوئے۔ فراغت کے بعد مشغلۂ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے، اور متعدد مقامات پر درس وافادہ کی مسند بچھائی۔ حضرت محدث علامہ اعظمیؒ نے علم وفن کی بیشتر کتابیں آپ ہی کی خدمت میں پڑھی تھیں۔ ۱۳۴۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی اور اورنگ آباد-مئو-عیدگاہ کے قریب قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

لوگ کسی قدر غفلت کی نیند سو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی عبداللطیف کی چھتری جاتی رہی''۔

اسی طرح کا خط مولوی فاروق نے بھی لکھا، ان کا خط ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پہنچا تھا، اور خود مولوی عبداللطیف نے ایک خط ۱۱/محرم ۳۸ھ کو، دوسرا ۱۵/محرم ۳۸ھ کو لکھا، پہلے خط میں لکھتے ہیں:

''محبی مولوی......صاحب!

السلام علیکم۔

بخیریت تمام مکان پہنچا، امید ہے عنقریب صحت ہوجائے گی، وہاں صراح رہ گئی، مہربانی فرماکر حفاظت سے رکھئے گا اور اگر ہوسکے تو روانہ کردیجئے، میں محصول آپ کے والد صاحب کو دے دوں گا''۔

اور دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''مشفقم جناب......صاحب!

السلام علیکم۔

ایک خط اس کے پہلے بھی روانہ کرچکا ہوں، وہاں تاریخ المنوال بھی چھوٹ گئی ہے، حفاظت سے رکھئے گا، اب تک میری طبیعت صاف نہیں ہوئی ہے، اور دوسرے لوگ (مولوی عبدالحی و مولوی فاروق) کا بُعد کی وجہ سے کچھ پتہ نہیں''۔

اس سال بیماری کا بہت زور تھا، ان لوگوں کے جانے کے ایک ماہ بعد میں بھی سخت بخار میں مبتلا ہوا، میری حالت تشویش ناک دیکھ کر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی[1] نائب مہتمم (دارالعلوم دیوبند) نے مولوی یعقوب سکروری کے ساتھ مجھے بھی گھر بھیج دیا،

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی متبحر عالم اور عربی زبان وادب کے شناور تھے، تعلیم تمام تر دیوبند میں حاصل کی، اور وہیں سے ۱۳۰۰ھ میں فراغت پائی، علم وفضل کے ساتھ ساتھ انتظام وانصرام کا بھی خاص ملکہ ودیعت کیا گیا تھا، ۱۳۲۵ھ=۱۹۰۷ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم کا منصب تفویض کیا گیا، ۱۳۴۸ھ=۱۹۲۹ء میں وفات ہوئی۔

کرایہ کے پیسے پاس میں نہیں تھے، تو مہتمم صاحب نے دفتر سے قرض دلوادیا، جس کو آنے کے بعد والد صاحب نے ادا کیا، مولوی مبین کوئریا پاری مرحوم نے ۷؍دسمبر ۱۹۱۹ء کو مجھے خط لکھا کہ:

”آپ کی علالت کی خبر سن کر گونہ تعلق ہے، خداوند تعالیٰ صحت کلی عطا فرمائے، کئی ہفتہ ہو رہا ہے کہ آپ کا منی آرڈر مبلغ دس روپئے کا مولوی ایوب کے نام آیا تھا، وصول کر کے دفتر میں داخل کر دیا، آپ اطمینان رکھئے“۔

اور ۱۲؍ربیع الاول ۱۳۳۸ھ کو مولانا بخشش احمد کوئریا پاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

”مکرمی جناب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب!

السلام علیکم۔

تعجب ہے آپ کی علالت کا سلسلہ اب تک چلا جاتا ہے، اگر تکلیف گوارا فرما کر حالات مزاج سے گاہے گاہے مطلع فرماتے رہیں تو نوازش ہوگی، آپ کے روپیہ کے متعلق تو عزیزم مولوی مبین نے تحریر ہی کر دیا ہے“۔

دوسرے سال دیوبند میں حاضری:

بیماری کی وجہ سے اور اس لیے کہ میں نے فروری ۱۹۲۰ء میں مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں پڑھانے کے لیے ماہوار اور کھانے پر ملازمت کر لی تھی (اس وقت مدرس سوم عربی کی تنخواہ پندرہ روپئے خشک ہوا کرتی تھی) شوال ۱۳۳۸ھ میں دیوبند نہیں جا سکا، جب شوال ۱۳۳۹ھ میں دوبارہ میں نے دیوبند جا کر دورۂ حدیث میں شرکت کی، تو اس سال بھی مولانا عبداللطیفؒ دیوبند پہنچے، لیکن بعض کینہ پرور اشخاص کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ان کو ایک مہینہ کے اندر ہی دیوبند چھوڑنا پڑا، اور بادل ناخواستہ مینڈو چلے گئے، مینڈو پہنچ کر انھوں نے ۷؍ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ کو مجھے مندرجہ ذیل خط لکھا:

”اصدق الخلان جناب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب!

السلام علیکم۔

گذارش ہے کہ جیسے دیوبند سے چلا تھا، ویسے ہی مینڈو پہنچا، اب تک مولوی

کابلی صاحب بیمار ہیں، امید ہے کہ سنیچر تک اسباق شروع ہو جائیں گے۔ ترمذی شریف ہو رہی ہے، ابھی طبیعت اچھی طرح نہیں لگی، دعاء کرو۔ مولوی عبدالحی آگئے ہیں اور اس وقت یہاں ۱۳؍اعظم گڈھی موجود ہیں۔............

محمد عبداللطیف اعظمی“

مینڈو سے دار العلوم مئو:

یہ خط ۱۵؍جولائی ۱۹۲۱ء کو دیوبند پہنچا تھا، اس سے پہلے پانچ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ کو مولوی فاروق نے لکھا تھا:

”مولوی عبداللطیف مع الخیر مینڈو حاضر ہوئے۔ مناسب ہے کہ دیگر اعظم گڈھی طلبہ سے اتحاد و اتفاق پیدا کریں، اور فراق یاراں کا خیال دل میں نہ لائیں، اور میری ناقص رائے یہ ہے کہ دورہ میں خوب محنت کریں، مسلم، بخاری شریف، ترمذی شریف دیوبند میں بہت عمدہ ہو رہی ہیں، زہے خوش نصیبی آپ کی“۔

یہ خط ۱۲؍جولائی ۲۱ھ کو دیوبند پہنچا تھا، اس کے بعد ۲؍اگست ۱۹۲۱ء کو مولوی فاروق نے اچانک یہ اطلاع دی کہ:

”چونکہ مدرسہ ہذا کی تعلیمی حالت بہ نسبت سنوات گذشتہ خراب اور ردّی ہے، اسی وجہ سے مولوی عبداللطیف صاحب کل دوشنبہ کی رات کو مئو مدرسہ دار العلوم میں پڑھنے کے خیال سے چلے گئے، اور ابھی ہم لوگ یہاں سے کوچ کرنے کو باقی ہیں، ہم لوگوں کو خاں صاحب (امیر شاہ خاں صاحب) نے یہ رائے دی ہے کہ تم لوگ دیوبند چلے جاؤ، میں سفارشی رقعہ لکھ دوں گا تو ان شاء اللہ داخلہ ہو جائے گا، آپ سے مشورۃً یہ دریافت کرتا ہوں کہ مئو جانا مناسب ہوگا یا دیوبند میں؟ امید کہ آپ اپنی رائے عالی سے بہت جلد آگاہ فرماویں گے“۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولوی عبداللطیف صاحب مینڈو میں شاید ایک مہینہ بھی نہیں

ٹکے، مئو پہنچ کر وہ دارالعلوم میں داخل ہوگئے، اس کے بعد بہت دنوں تک انھوں نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا، میں نے ان کو خط لکھا ہوگا، اور بے وفائی کا شکوہ کیا ہوگا، تو تقریباً پونے دو مہینے کے بعد انھوں نے ۲۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء (۱۷ر محرم ۱۳۴۰ھ) کو مجھے ایک درد انگیز خط لکھا جو حسرت و رنج ناکامی کا مرقع تھا، لکھتے ہیں:

"از مدرسہ دارالعلوم مئو

حبی الصدوق!

السلام علیکم۔

دور دراز سفر کی تکالیف برداشت کر کے اپنے مرکز پرنا کام واپس آنے کے بعد جن خلاف توقع صدمات اور خلاف امید بے چینیوں سے سامنا کرنا پڑا (اور جنھیں ذکر کرنے کو ایک دفتر چاہئے) انھوں نے موقع ہی نہ دیا کہ ان کی طرف سے خیال ہٹا کر دامن وفا کے داغوں کو چھڑانے کی کوشش کی جائے"۔

مولانا عبداللطیف نے مینڈوہی میں مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ سے جلالین کا کچھ حصہ پڑھا تھا، اور اس سے پہلے دارالعلوم مئو میں جلالین کے چند اسباق انھوں نے مولانا ابراہیم صاحب بلیاوی[1] سے پڑھے تھے۔

تحریک آزادی کا ہنگامہ:

۱۳۳۹ھ اور ۱۳۴۰ھ کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز زمانہ تھا، تحریک ترک موالات بہت

(۱) منطق وفلسفہ کے امام اور علوم عقلیہ کے ماہر اور متبحر عالم مولانا محمد ابراہیم بلیاوی ۱۳۰۴ھ میں صوبۂ اتر پردیش کے ضلع بلیا میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غلام کبریا تھا۔ مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی، مولانا فاروق احمد چریاکوٹی، اور مولانا ہدایت اللہ خان کے علاوہ مولانا عبد الغفار صاحب عراقی مئوی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا، ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ہندوستان کے مختلف مدارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک دارالعلوم دیوبند کے استاذ رہے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے انتقال کے بعد دارالعلوم کے صدرالمدرسین مقرر ہوئے، اور تادم آخر اس منصب پر متمکن رہے۔ ذہانت وفطانت اور نکتہ آفرینی میں اپنی مثال آپ تھے، ۲۴ر رمضان ۱۳۸۷ھ = ...۱۹۶۷ء کو دیوبند میں وفات پائی، اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے۔

شدت اختیار کر چکی تھی، دوسرے شہروں کی طرح دیوبند میں بھی جلسوں میں طلباء کے سروں سے بدیسی کپڑے کی ٹوپیاں اتاری اور جلائی جاتی تھیں، انھیں ایام میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند[1] میں گرفتار ہوئے۔ عصر کے بعد "دوِش" آئی، مگر ایسا ہنگامہ بپا ہوا، اور آدمیوں کا اتنا ہجوم وازدحام ہوا کہ اس وقت گرفتاری عمل میں نہ آسکی، مولانا مرحوم کا قیام حضرت شیخ الہندؒ[2] کے پرانے مکان میں تھا، مولانا کے ساتھ ساتھ ہم سب رات بھر پولیس اور فوج کے گھیرے میں رہے، اس دن ہم بہت دیر میں سوئے تھے، صبح کو اٹھے تو معلوم ہوا کہ بہت رات گئے نئے مکان سے مولانا کو گرفتار کر کے لے گئے۔

ان حالات سے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مشوّش اور پریشان تھے، چاہتے تھے کہ وطن واپس ہوجاؤں، اسی اثناء میں مجھے اس سال بھی بخار آگیا، والد صاحب نے اطلاع ملتے ہی لکھ بھیجا کہ تم مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ، چنانچہ صفر یا ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں، میں مئو چلا آیا۔

مولانا نعمانی کی فراغت:

صحت یابی کے بعد اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ دارالعلوم مئو میں دورے کی

(۱) حضرت مدنیؒ پر حضرت محدث الاعظمیؒ کا مفصل مضمون اسی جلد میں شامل ہے، اس کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

(۲) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی ۱۲۶۸ھ = ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر تھے، دیوبند میں نشوونما ہوئی، ۱۲۸۳ھ = ۱۸۶۶ء میں جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، تو وہ اس کے اکیلے طالب علم تھے، اور ان کے استاذ ملا محمود دیوبندی تھے، ان کے علاوہ اپنے والد ماجد سے بھی علم وفن کی کتابیں پڑھیں، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی سے کتب حدیث پڑھی، وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، صدرالمدرسین اور بڑے بڑے ارباب علم ومعرفت کے استاذ ومربی تھے، درحقیقت وہ ایک عہد ساز وتاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے، آزادئ وطن کے لیے عمر بھر انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہے، انھوں نے اس کے لیے کئی ایک تحریکیں بھی چلائیں، جن میں سب سے مشہور تحریک ریشمی رومال تھی، انھوں نے اس کے واسطے قید وبند کی صعوبت بھی برداشت کی، ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء = ...۱۳۳۹ھ کو آپ کی رحلت واقع ہوئی۔

کتابیں تمام کرلوں، خوش قسمتی سے مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ[1] دارالعلوم مئو میں تشریف لا چکے تھے، اور ان کے پاس ہمارے صرف ایک رفیق مولوی عبدالمجید صاحب دورہ پڑھ رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا، شعبان ۱۳۴۰ھ میں دورۂ حدیث ختم ہوا، اور شوال ۱۳۴۰ھ میں بصیغہ مدرسی وہیں میرا تقرر ہوگیا۔

اب اس سال مولانا عبداللطیف صاحبؒ کا دورہ تھا، جب وہ شعبان ۱۳۴۱ھ میں فارغ ہوئے تو میں نے مولانا عبدالمجید صاحب[2] ناظم دارالعلوم (مئو) سے کہہ سن کر ان کا تقرر بھی کرالیا، اس وقت سے ۱۳۶۹ھ تک میرا ان کا برابر ساتھ رہا، ہم دونوں ساتھ ساتھ درس وتدریس، وعظ وتذکیر، اور بحث ومناظرہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔ درمیان میں صرف چند سال جب کہ میں مظہر العلوم بنارس میں صدر مدرس ہوگیا تھا، وہ مجھ سے اور میں ان سے جدا رہا۔

مولانا نعمانی مفتاح العلوم میں:

دارالعلوم مئو سے مستعفی ہوکر میں بنارس چلا گیا اور میری علیٰحدگی کے (غالبًا) دو سال بعد مولانا عبداللطیفؒ بھی دارالعلوم مئو سے سبک دوش ہوکر سنبھل چلے گئے۔ جب میں

(۱) مولانا کریم بخش سنبھلی نے ۱۳۱۷ھ میں حضرت شیخ الہند کے پاس صحاح ستہ پڑھ کر دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تھی، ہاپوڑ اور جامع العلوم کان پور میں تدریسی خدمات انجام دیں، غالبًا ۱۳۴۰ھ میں مئو وارد ہوئے، اور مدرسہ دارالعلوم میں شیخ الحدیث وصدر مدرس کے منصب پر متمکن ہوئے، اور کئی سال تک تدریسی خدمات انجام دیں، آپ کے شاگردوں میں متعدد اہل علم وکمال کے نام آتے ہیں، حضرت محدث الاعظمیؒ نے صحاح ستہ کا درس آپ ہی کی خدمت میں حاصل کیا۔ ۱۷ر شوال ۱۳۶۱ھ=۱۹۴۲ء میں سنبھل-مرادآباد- میں آپ کی وفات ہوئی۔

(۲) مولانا شاہ عبدالمجید بن شاہ مولوی کریم بخش بن مولوی محمد قائم بن مولوی شاہ کمال تقریباً ۱۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے، مولانا امام الدین پنجابی، مولانا عبدالعلیم رسول پوری اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے علم وفن کی تحصیل کی، اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، عرصۂ دراز تک مظہر العلوم بنارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، وہاں سے علاحدگی کے بعد دارالعلوم مئو کے ناظم ہوئے، مئو کی شاہی جامع مسجد کے امام بھی رہے۔ ۷۷ر برس کی عمر میں ۱۳۵۱ھ میں وفات پائی۔

بنارس چھوڑ کر مئو آیا تو مولانا ابوالحسن صاحبؒ[1] نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے باصرار تمام مفتاح العلوم میں لاکر بیٹھا دیا[2]، دو ماہ کے بعد مولانا عبداللطیف صاحب عیدالاضحیٰ کی تعطیل میں مئو آئے، تو میں نے ان کو بھی روک لیا، مفتاح العلوم جو چراغ سحری ہو رہا تھا، اس کو اس طرح حیات نو ملی اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا ایوب صاحب[3] کو دیوریا سے بلاکر نظامت کا عہدہ ان کو تفویض کردیا گیا۔

زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور مفتاح العلوم سال بسال ترقی کرتا رہا، مختلف اوقات اور حالات میں ہم تینوں نے مدرسہ کی صدارت اور نظامت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔

مولانا نعمانی منصب صدارت پر:

بالآخر غالبًا ۱۳۶۹ھ میں مختلف اسباب کی بناء پر میں نے علیٰحدگی اختیار کرلی،

(۱) مولانا ابوالحسن عراقی مئوی، مولانا عبدالغفار صاحب مئوی کے چھوٹے بھائی تھے، ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے، بیشتر کتب درسیہ اپنے برادر محترم حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے پڑھی، پھر آستانۂ حضرت گنگوہی پر حاضر ہوکر امام ربانی حضرت مولانا رشید احمدؒ گنگوہی سے کتب حدیث پڑھ کر دورۂ حدیث کی تکمیل کی، اس کے کچھ سال بعد جب علامہ انور شاہ کشمیری کے درس کا چرچا سنا، تو دیوبند گئے اور ان کے سرچشمۂ علمی سے فیض یاب ہوئے۔

فراغت کے بعد درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے، حضرت محدث الاعظمیؒ کے بھی استاذ تھے۔ مدرسہ مفتاح العلوم آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے، جس کا قیام ۱۳۲۷ھ میں آپ کے ہاتھ سے ہوا تھا، بیعت واسترشاد کا تعلق حضرت مولانا تھانویؒ سے تھا، ۱۳۶۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی، اور اورنگ آباد عیدگاہ کے قریب قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(۲) اس وقت مدرسہ مفتاح العلوم اس جگہ نہیں تھا جہاں آج واقع ہے، اس وقت الہ داد پورہ میں واقع تھا، جامع مسجد شاہی کٹرہ میں اس کو ۱۳۴۷ھ میں حضرت محدث الاعظمیؒ لائے ہیں، اس طرح اس کی نشأۃ ثانیہ آپ کے ہاتھوں سے ہوئی ہے، اور جامع مسجد شاہی میں اس کو لاکر ترقی کی راہ پر آپ ہی نے گامزن کیا ہے۔ اس کی تفصیل حیات ابوالمآثر جلد اول از صفحہ ۱۵۴ تا صفحہ ۱۶۹ دیکھی جاسکتی ہے۔

(۳) مولانا محمد ایوب صاحب، حضرت محدث الاعظمیؒ کے ہم عصروں میں تھے، حضرت اعظمیؒ نے جب ۱۳۴۷ھ میں مفتاح العلوم کی ذمہ داری سنبھالی، اس وقت مولانا محمد ایوب دیوریا میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، ان کو بلاکر نظامت کا عہدہ ان کے سپرد کردیا، وہ کئی سال تک اس منصب پر فائز رہے، ۱۳۸۱ھ میں وہ اس سے علاحدہ ہوکر پہلے ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے، تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد علامہ اعظمیؒ کے ایماء اور مشورہ سے ڈابھیل چلے گئے، اور وہاں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۶ر شوال ۱۴۰۴ھ = ۶ر جولائی ۱۹۸۴ء کو مئو میں وفات ہوئی، اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

جس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ میرے پیشِ نظر بعض بہت ہی اہم تصنیفی خدمتیں تھیں، جن کے لیے کامل یکسوئی درکار تھی۔

اس کے بعد لازمی طور پر صدارت تدریس کی ذمہ داری مولانا عبداللطیفؒ کے سر آئی، جس کو انھوں نے حسن وخوبی سے انجام دیا، مگر جب وہ یوپی اسمبلی کے ممبر چن لیے گئے، تو مولانا محمد ایوب صاحب نے تعلیمی اور انتظامی دونوں ذمہ داریوں کو سنبھالا، اور دونوں کو خوبصورتی کے ساتھ نباہا۔

ممبری کی مدت ختم ہونے کے بعد جب مولانا عبداللطیف صاحب نے دوبارہ مدرسہ میں آنا چاہا، تو اس وقت ان میں اور مولانا ایوب صاحب میں تھوڑی نااتفاقی اور بدمزگی پیدا ہوگئی، جس کے نتیجہ میں مولانا ایوب صاحب نے مدرسہ چھوڑ دیا، اور کچھ دنوں کے بعد مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں شیخ الحدیث کا عہدہ قبول کرلیا۔

مولانا نعمانی کے شب وروز مفتاح العلوم میں:

مختصر یہ کہ مولانا ایوب کی علاحدگی کے بعد سے اپنی حیات کے آخر لمحہ تک مولانا عبداللطیف دونوں ذمہ داریاں سنبھالے رہے، اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوچکا تھا، اور بچے سب بڑے بڑے ہوچکے تھے، اکثر کام سے بھی لگ چکے تھے، اس لیے گھر کی فکر نہ تھی، صرف مدرسہ کی فکر تھی، اور دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ رات کو طلباء کی نگرانی کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی، اس لیے شب وروز مدرسہ ہی میں رہتے تھے، مدرسہ ہی میں سوتے تھے، صرف جمعہ جمعہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر امام گنج جاتے تھے۔

علمی اور تعلیمی کاموں کے ساتھ ساتھ مقامی اور ملکی سیاست میں بھی ان کا بڑا حصہ تھا، مگر میرا ان کا ساتھ سیاسی میدان میں نہیں تھا، باوجودیکہ چند باتوں کے استثناء کے بعد میرا اور ان کا سیاسی مسلک ایک تھا۔

میدان مناظرہ میں:

میرا ان کا ساتھ صرف مسجد ومدرسہ اور نجی مجلسوں تک محدود نہ تھا، تبلیغی اور مناظرانہ جلسوں کی شرکت اکثر ایک ہی ساتھ ہوتی تھی، کبھی کبھی دیوبند، دارالمبلغین لکھنؤ اور جمعیۃ علمائے ہند کے جلسوں یا مجلسوں میں شرکت کے لیے جاتا تھا تو وہ بھی ساتھ ہولیتے تھے۔ اس طرح چھپن، ستاون سال تک ہم آہنگی، یکجہتی اور باہمی مروت ومحبت کے ساتھ میری ان کی رفاقت وصحبت[1] رہی۔

اختلاف رائے کے مواقع بھی آئے، مگر تعلقات خوشگوار ہی رہے، بعض موقعوں پر خودغرضوں نے ان کو میرے خلاف بھڑکایا، اور وہ وقتی طور پر فی الجملہ متاثر بھی ہوئے، مگر سامنا ہونے پر انھوں نے اس تاثر کو ظاہر ہونے نہیں دیا۔

مولانا نعمانی کا سفر حیدرآباد:

انتقال سے چند روز پہلے مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ مسلم پرسنل لاکنونشن میں شرکت کے لیے بمبئی چلنا ہے۔ جب وقت بالکل قریب آگیا تو انھوں نے مجھ کو ایک رقعہ لکھا کہ:

"ایک خاص عزیز کی تقریب نکاح میں شرکت کے لیے میرے اعزہ سخت اصرار کررہے ہیں، اس لیے میں پہلے حیدرآباد جاؤں گا، اور اب میں آپ سے بمبئی میں ملوں گا، حیدرآباد کا قریب ترین راستہ کون سا ہے"؟

مولانا عبداللطیف حیدرآباد روانہ ہوئے، اور ان کی روانگی کے کئی دن بعد میں بمبئی کے لیے روانہ ہوا، راستہ میں مجھے سخت بخار آیا، اور مجھے مجبوراً منماڑ اتر کر مالے گاؤں میں رکنا پڑا، بمبئی میں مسلم پرسنل لاکنونشن شروع ہوکر ختم بھی ہوگیا، مگر میرا بخار ختم نہیں ہوا، اس

(۱) "تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی" میں یہاں پر غلطی سے "محبت" چھپ گیا ہے، مگر صحیح "صحبت" ہے، جیسا کہ آپ کے تحریر کردہ مسوّدہ میں ہے (مرتب)۔

لیے میری شرکت کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

لوگوں کے خطوط سے معلوم ہوا کہ مولانا بھی شریک نہیں ہو سکے، مجھے کلکتہ بھی جانا تھا، اس لیے بخارا ترنے کے بعد براہِ ناگ پور کلکتہ چلا گیا۔

مولانا نعمانی کا انتقال:

وہاں سے جس دن شام کو میری روانگی تھی، اس دن صبح کو ٹرانک کال کے ذریعہ اچانک یہ جانکاہ خبر ملی کہ مئو میں مولانا عبداللطیف صاحب انتقال فرما گئے[1]۔

اس خبر کا جو اثر دل ودماغ پر پڑا بیان سے باہر ہے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اب بنارس جانے والا کوئی پلین نہیں ہے، اس لیے ہم سب دل تھام کر بیٹھ گئے کہ جنازہ میں شرکت تو ناممکن ہے، اب کل قبر ہی کی زیارت کا امکان ہے۔

مئو آنے پر مفصل معلوم ہوا کہ مولانا نے عشاء کی نماز کے بعد مطالعہ کیا، دس بجے کے قریب بیت الخلاء گئے اور واپسی میں بے قابو ہو کر بیچ میں ہی بیٹھ گئے، اور جب اٹھا کر لائے گئے تو چند ہی منٹ میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

مولانا نعمانی کی خوبیاں:

ان کی کتاب زندگی کا ورق کیا الٹا، پچاس سال کی تاریخ کا آخری باب ختم ہوگیا۔ مرحوم ایک جید عالم، ایک جری انسان، ایک قومی وملی خدمت گذار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ زندگی میں ان کی قدر نہیں ہوئی، مگر مرنے کے بعد بہت سے اچھے اچھے لوگوں کو جو عمر بھر ان کو برائیوں سے یاد کرتے رہے ان کی خوبیاں ہی نظر آئیں اور مجبوراً ان کی بھلائیوں کا ان کو اعتراف کرنا پڑا۔ **فرحمه الله رحمةً واسعةً.**

☆......☆......☆

(۱) مولانا مرحوم کا سانحۂ ارتحال ۳؍جنوری ۱۹۷۳ء = ۳۰ ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ کو پیش آیا، شب میں انتقال ہوا، اور دوسرے روز بعد نماز ظہر نماز جنازہ اور تدفین ہوئی۔

علم وفضل میں خواتین کا حصہ

جب یہ ایک مسلَّم حقیقت ہے کہ جن چند باتوں میں عورتوں کو اسلامی قانون کی رو سے چھوٹ ملی ہے، ان کو چھوڑ کر باقی تمام احکام اسلام کی پابندی عورتوں کو بھی لازم ہے اور شریعت کا پورا قانون ان پر بھی لاگو ہے، اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر پیغام کی مخاطب عورت بھی ہے، تو جس طرح مردوں کو یہ جاننا ضروری ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ کا پیغام کیا ہے، اسلام کے احکام کیا ہیں، اور اسلامی زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی جاننا ضروری ہے۔ یہ ایسی کھلی بات ہے کہ اس پر دلیل وبرہان قائم کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عہد مبارک نبوی میں عورتیں خدمت اقدس میں حاضر ہو کر مسائل دریافت کیا کرتی تھیں، بلکہ عورتوں کی درخواست پر آنحضرت ﷺ نے ان کے لیے الگ سے دین کا علم حاصل کرنے کا وقت اور موقع دیا، اور جس طرح مردوں نے آنحضرت ﷺ کی حدیثیں یاد کیں، حضرت عائشہؓ اور دوسری بہت سی عورتوں نے بھی حدیثیں یاد کیں، بلکہ حضرت عائشہؓ نے تو اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ بڑے بڑے جلیل القدر مرد صحابی علم میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

عہد نبوی کے بعد اس کی اہمیت کا احساس قائم رہا، چنانچہ عہد تابعین میں ایسی متعدد عورتیں پیدا ہوئیں جن سے ائمۂ اسلام نے علم حاصل کیا، مثلاً حفصہ بنت سیرین سے ان کے بھائی سید التابعین امام حسن بصری نے حدیث کی روایت کی؛ اور عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے امام عروہ، امام زہری اور سلیمان بن یسار نے علم حاصل کیا، اور خلیفہ راشد حضرت عمر بن

عبدالعزیز نے اپنے لیے عمرہ کی حدیثیں قلم بند کرائیں؛ اور عائشہ بنت [سعد][1] کی امام مالک نے شاگردی اختیار کی۔ یہ چند نام نمونے کو طور پر لیے گئے ہیں، استیعاب کے لیے ایک مستقل رسالہ لکھنے کی ضرورت ہوگی۔

عہد تابعین کے بعد بھی ہر دور میں عورتوں نے بطور خود بھی اس کی اہمیت محسوس کی، اور پوری طرح تحصیل علم میں حصہ لیا، اور مردوں نے بھی ان کو فضل وکمال سے آراستہ کرنے کا کماحقہ اہتمام کیا۔ اس کے نتیجہ میں بعض خواتین نے فقہ میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ فتووں پر ان کے دستخط ضروری سمجھے جاتے تھے۔ بعض عورتوں کو علم حدیث میں کمال حاصل ہونے کی بنا پر **فخر النساء** کا لقب دیا گیا، اور کسی کو **ست العرب**، کسی کو **تاج النساء** کہہ کر پکارا گیا، اور بعض خواتین **سیدة الکَتَبَة یا ست الکل** کے لقب سے مشہور ہوئیں۔

میں اس وقت عہد تابعین کے بعد کی کئی صدیوں کو چھوڑ کر چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کی چند ممتاز، اور علم حدیث میں بہت اونچا مقام رکھنے والی خواتین کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے ان کا حال پڑھ کر ہماری بہن بیٹیوں کو اپنی کوتاہی کا کچھ احساس اور علم کا کچھ شوق پیدا ہو۔

بلقیس بنت سلیمان

تاریخوں میں ان کا ذکر **الشیخة الأصیلة** کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ یہ مشہور وزیر اور شافعی عالم نظام الملک طوسی کی پوتی تھیں، اصفہان میں پیدا ہوئیں اور وہیں نشو ونما پائی، اس عہد کی مشہور محدثہ فاطمہ جوزدانیہ وغیرہا سے حدیثیں سنیں، اس کے بعد محدثین نے ان سے بغداد میں حدیثیں سنیں اور روایت کیں، ان کی وفات ۵۹۲ھ میں ہوئی۔ حافظ عبدالعظیم منذری اور امام ذہبی نے اپنی تصنیفات میں ان کا ذکر کیا ہے۔

(۱) ''سعد'' کا لفظ اصل مسودے میں نہیں ہے، مسودہ میں صرف ''عائشہ بنت'' ہے، مرتّب نے کتابوں سے مراجعت کے بعد اس کو بڑھانا ضروری سمجھا ہے۔

تمنی بنت عمر

شیخ ابوجعفر طیبی کی صاحبزادی اور شیخ تمیم وشیخ احمد کی والدہ تھیں، یہ دونوں محدث حافظ عبدالعظیم منذری کے استاد تھے، تمنی نے ابوالمظفر کرخی سے حدیث حاصل کی، اور پھر خود دوسروں کو حدیثیں سنائیں۔

ان کی وفات ۵۹۳ھ میں ہوئی۔

فخر النساء فرحة

تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر **الشیخة الصالحة فخر النساء أم الحیاة** کے القاب وآداب کے ساتھ کیا ہے، ان کو حافظ ابوالقاسم سمرقندی سے سماع حدیث کا شرف حاصل تھا، اپنے وقت میں وہ لوگوں کو درس حدیث دیتی تھیں، حافظ عبدالعظیم منذری نے بھی ان سے روایت حدیث کی اجازت حاصل کی تھی۔

۵۹۸ھ میں دنیا سے رخصت ہوئیں۔

أم الحسن شمائل

ان کا شمار بھی شیوخ حدیث میں تھا، امام ابومنصور جوالیقی کی صاحبزادی اور ان کے علوم کی وارث تھیں، اور ان کے علم کی اشاعت میں ان کا بھی نمایاں حصہ تھا، ان کو شیخ الشیوخ عبداللطیف بن اسماعیل کا شرف زوجیت حاصل تھا۔

ان کی وفات بھی ۵۹۸ھ میں ہوئی۔

زینب بنت امام صدر الاسلام

انھوں نے اپنے والد امام صدر الاسلام ابوطاہر اسکندرانی سے احادیث کی سماعت کی، اور انھوں نے اس فن میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ محدثین خراسان میں سے ابوالمعالی

وابومحمد خواری اور ابوشجاع بسطامی وغیرہم نے اور محدثین اصفہان میں سے حافظ ابوالقاسم اصفہانی، وابوالفرج صیرفی اور ابوعبداللہ الخلال وغیرہ نے، اور محدثین بغداد کے ائمہ حدیث میں سے قاضی محمد بن عبدالباقی انصاری، وابومنصور بن خیرون وعبدالوہاب انماطی نے ان کو اپنی حدیثوں کو روایت کرنے کی اجازت دی۔ انھوں نے اسکندریہ میں ہنگامۂ تحدیث گرم کیا۔

۵۹۷ھ میں وفات پائی، ان کا ذکر الشیخة الصالحة الأصیلة کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔

تاج النساء امة الکریم

حضرت غوث اعظم جیلانی کی بہو اور ان کے پوتے قاضی القضاۃ ابوصالح کی والدہ تھیں، ان کا لقب تاج النساء تھا، اپنے شوہر حافظ عبدالرزاق کی معیت میں غوث اعظم وغیرہ سے حدیثوں کی سماعت کی تھی، اور محدثین نے ان سے حدیثیں سنی تھیں۔

۶۱۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

ست العرب حلل

انھوں نے اپنے بھانجے ابوالرضا محدث کی رہنمائی میں ابوالقاسم بن البناء سے حدیثیں سنیں اور پھر اس امانت کو دوسروں تک پہنچایا، ان کو الشیخة ست العرب (ملکۂ عرب) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ان کی وفات بھی ۶۱۳ھ میں ہوئی۔

الشیخة الصالحة أم المؤید

وہ حضرت ابوالقاسم صوفی کی لخت جگر تھیں، انھوں نے بڑے بڑے حفاظ حدیث مثلاً ابومحمد فارسی اور زاہر ووجیہ شحامی اور ابوالمظفر قشیری وغیرہ سے سماع حدیث کا شرف

حاصل کیا، اور حفاظ حدیث وائمہ علم کی کثیر تعداد نے ان کو اجازت مرحمت فرمائی، جن میں عبدالغافر فارسی اور علامہ زمخشری کا نام سرفہرست ہے۔ اور حافظ منذری جیسے حافظ حدیث کو انھوں نے متعدد بار اجازت دی۔ ذہبی نے تاریخ الاسلام میں لکھا ہے کہ ام المؤید کے مرنے سے اسناد حدیث کا ایک عالی سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ان کی وفات ۶۱۵ھ میں ہوئی۔

فاطمہ جوزدانیہ

روایت احادیث میں ان کا یہ پایہ تھا کہ ان کے شاگردوں کا شمار مشکل ہے، امام طبرانی کی معجم کبیر و معجم صغیر کو طبرانی کے شاگرد ابن ریذہ سے انھوں نے روایت کیا ہے اور ان کے واسطہ سے ان کتابوں کو تمام بڑے بڑے محدثین وحفاظ روایت کرتے ہیں، مثال کے طور پر حافظ نورالدین ہیثمی کا نام لینا، انھوں نے ان دونوں کو جس سند سے روایت کیا اس کو ان کی کتاب مجمع الزوائد کے آغاز میں ملاحظہ کیجئے۔ اسی ایک چیز [سے] اندازہ ہوسکتا ہے حدیثوں کی روایت اور ان کی اسناد کے تسلسل کے قیام میں خواتین کا کتنا حصہ ہے۔

فاطمہ جوزدانیہ کی وفات ۵۲۴ھ میں ہوئی۔

فاطمہ بنت علی مقرئہ

انھوں نے ابوالحسین فارسی سے صحیح مسلم اور غریب الخطابی کی روایت کی ہے اور وہ عورتوں کو قرآن پاک کی تلقین کیا کرتی تھیں، قرأت میں ماہر تھیں۔

۵۳۲ھ میں وفات ہوئی۔

فاطمہ بنت سعد الخیر راویہ

یہ فاطمہ جوزدانیہ وغیرہا کی شاگرد تھیں، انھوں نے مصر میں نہایت کثرت سے حدیثیں روایت کی ہیں، طبرانی کے دونوں معجم کی روایت فاطمہ جوزدانیہ سے کرتی ہیں۔ ہیثمی

وغیرہ کی سند میں ان کا نام بھی آتا ہے۔

سال وفات ۶۰۰ھ ہے۔

أم البها فاطمة بنت محمد

یہ عورتوں میں وعظ کہتی تھیں، اور مسندة أصبهان کہلاتی تھیں، یعنی محدثین ان سے احادیث کی اسناد کا سلسلہ قائم کرتے تھے۔ یہ ابوالفضل فراوی وغیرہ کی شاگرد تھیں اور انھوں نے سعید عیار سے صحیح بخاری کی سماعت کی تھی۔

۵۳۹ھ میں وفات ہوئی۔

خاصّہ بنت مبارک

یہ بھی واعظہ تھیں (عورتوں میں وعظ فرمایا کرتی تھیں) حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردی کی ممتاز صحبت یافتہ تھیں، اس لیے صاحبة الشيخ کے لفظ سے ان کا تعارف کرایا جاتا تھا، ان کی ایک خانقاہ بھی تھی، جس میں صوفی مشرب خواتین کو وعظ ونصیحت کے ساتھ خطاب فرمایا کرتی تھیں۔

ان کی وفات ۵۸۵ھ میں ہوئی۔

صفیہ بنت عبدالکریم

ان کو بھی الشيخة الأصيلة کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا گھرانا حدیث وتصوف کا گھرانا کہلاتا تھا، ان کے والد اور دادا محدث تھے، اور پردادا مشہور صوفی بزرگ تھے، ان کو وزیر علی بن طراد زینبی، وابومنصور بن خیرون اور ابوعبداللہ فراوی وغیرہ نے حدیث روایت کرنے کی اجازت عطا کی تھی، چنانچہ وہ روایت حدیث کی خدمت انجام دیتی تھیں۔

ان کی وفات ۶۰۵ھ میں ہوئی۔

ست الكتبة نعمة

ان کو الشيخة الصالحة ست الكتبة کے اوصاف سے ذکر کیا جاتا ہے۔

انھوں نے اپنے دادا یحییٰ اور ابوشجاع بسطامی وغیرہ سے حدیثیں سنیں، اور بغداد و دمشق وحجاز وغیرہ میں محدثین نے ان سے حدیثیں سنیں، ان کا خاندان محدثین کا خاندان تھا، ان کے باپ دادا اور پردادا کے علاوہ ان کے بھائی اور دو دو بہنیں بھی محدث تھیں۔ حافظ فرماتے ہیں میں دمشق میں ست الکتبۃ سے ملا تھا، اور ان سے سماع حدیث کا فیض حاصل کیا تھا۔

سال وفات ۶۰۴ھ ہے۔

ام ہانی عفیفہ

ان کا لقب بھی مسندہ تھا، یعنی محدثین ان سے احادیث کا سلسلۂ اسناد استوار کیا کرتے تھے۔ اور شیخه صالحة کے وصف سے یاد کی جاتی تھیں۔

فاطمہ جوزدانیہ کے علاوہ محدثین کی ایک بڑی جماعت سے سماع حدیث کا شرف حاصل تھا، اور کہا جاتا ہے کہ پانچ سو سے زیادہ مشائخ حدیث سے ان کو روایت حدیث کی عالی اجازتیں حاصل تھیں، اشاعتِ حدیث میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ حافظ منذری فرماتے ہیں کہ مجھ کو ان سے بذریعۂ کتابت اجازت حاصل ہے۔

وفات ۶۰۶ھ میں ہوئی۔

شُہدہ کاتبہ

چھٹی صدی ہجری کے نصف اخیر میں شاید سب سے زیادہ نامور اور بافیض محدثہ شُہدہ تھیں، حافظ ذہبی نے الكاتبة المسندة فخر النساء کے اوصاف کے ساتھ ان کا تعارف کرایا ہے، یعنی وہ نہایت خوش خط اور کتابت میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ محدثین کا سلسلۂ اسناد حدیث استوار کرنے میں بھی یکتائے زمانہ تھیں۔ آگے لکھا ہے کہ وہ بہت دیندار،

عبادت گذار اور نیکو کار بھی تھیں، داد و دہش و احسان بھی ان کا شیوہ تھا، ان کے والد نے اہتمام کے ساتھ ان کو بکثرت حدیثیں سنوائیں، یعنی محدثین کے حلقۂ تحدیث میں لے جا کر ان کے لیے سماع حدیث کا موقع فراہم کیا، یہاں تک کہ وہ مسندۃ العراق ہوگئیں (عبر)۔

شہدہ کی وفات ۵۷۴ھ میں ہوئی۔

کریمۃ مروزیۃ

شہدہ کاتبہ کا نام لینے کے بعد حق تلفی ہوگی اگر کریمہ مروزیہ کا ذکر خیر نہ کیا جائے، اگرچہ وہ چھٹی صدی سے پہلے کی یعنی پانچویں صدی کی نامور خاتون ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صحیح بخاری کے معتمد راویوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں، انھوں نے صحیح بخاری کشمیہنی سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب (بخاری) کو خوب ضبط کر رکھا تھا، ایک ایک زیر و زبر کا پورا خیال رکھتی تھیں، اور بخاری کے نسخوں کا مقابلہ کیا کرتی تھیں، نہایت صاحب فہم تھیں، باوجودیکہ انھوں نے شادی نہیں کی تھی، مگر ان کی کنیت اُم الکرام تھی، مرو سے ہجرت کر کے مکہ میں مقیم ہوگئی تھیں۔ جتنے محدثین بخاری کی سند رکھتے ہیں کریمہ ان سب کے سلسلۂ مشائخ میں ہیں۔

ان کی وفات ۴۶۳ھ میں ہوئی۔

کریمہ بنت عبدالوہاب

اسی نام کی ایک اور محدثہ ملک شام میں گذری ہیں، اور ان کا لقب **مسندۃ الشام** تھا، انھوں نے حدیثوں کو کثرت سے روایت کیا اور محدثین کو سماع کا موقع تھا، ملک شام میں ان کے پاس لوگ حدیث کی سند درست کرتے تھے، اس لیے وہ مسندۃ الشام کے لقب سے ملقب تھیں۔

ان کی وفات ۶۴۱ھ میں ہوئی۔

☆......☆......☆......☆......☆

منشورات

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ

مدرسہ مرقاۃ العلوم، پوسٹ بکس نمبر ۱

مئو، پن کوڈ نمبر ۲۷۵۱۰۱، یوپی انڈیا

نمبر شمار	کتب	صفحات	قیمت
۱	نصرۃ الحدیث	۲۲۶	۸۰/=
۲	تحقیق اہل حدیث	۵۲	۲۰/=
۳	انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت	۱۲۴	۳۵/=
۴	دست کار اہل شرف	۱۶۰	۷۰/=
۵	شارعِ حقیقی	۸۰	۲۰/=
۶	الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ	۱۱۵	۲۵/=
۷	رکعات تراویح	۱۲۷	۴۰/=
۸	رہبر حجاج	۸۰	۱۶/=
۹	اعیان الحجاج جلد اول	۲۳۲	۸۰/=
۱۰	اعیان الحجاج جلد دوم	۳۱۳	۱۴۰/=
۱۱	حسن ادب اور اس کی اہمیت	۳۹	۲۰/=
۱۲	اہل دل کی دل آویز باتیں	۵۵	۲۰/=
۱۳	دارالاسلام اور دارالحرب	۱۱۷	۳۵/=
۱۴	بیمہ اور اس کا شرعی حکم	۸۰	۲۵/=
۱۵	تعدیلِ رجال بخاری	۲۵۸	۸۰/=

نمبر شمار	کتب	صفحات	قیمت
١٦	عظمت صحابہؓ	٨٩	٣٠/=
١٧	التنقید السدید	٧٠	٢٥/=
١٨	ابطال عزاداری	٩٤	٣٠/=
١٩	ترغیب الصلوٰۃ	٤٠	١٢/=
٢٠	طیب الاقاحی فی مسائل الاضاحی	١٦٢	٥٥/=
٢١	ایثارِ آخرت	٣٤٠	٥٠/=
٢٢	دلیل المشورات	١٠٨	٣٥/=
٢٣	الحبیب دائمی تقویم	٣٦	٥/=
٢٤	نمازِ تراویح کا صحیح طریقۂ نبوی	٥٦	٢٥/=
٢٥	محدث الہند الکبیر العلامۃ حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ	١٢٠	٥٠/=
٢٦	مقالاتِ ابوالمآثر جلد اول	٤٠٦	١٤٠/=
٢٧	حیاتِ ابوالمآثر جلد اول	٧٣٢	٣٥٠/=
٢٨	حیاتِ ابوالمآثر جلد ثانی	٧٥٨	٣٥٠/=
٢٩	امام بخاریؒ ایک اصطلاح	٧٦	٢٥/=
٣٠	مسئلہ رویت ہلال	٥٦	٢٠/=
٣١	پیکرِ مہر ووَفا	١٢٨	٤٠/=
٣٢	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ اور ان کی علمی خدمات	٥٢٤	١٥٠/=

